مقالاتِ ماجد

چند ادبی نوشتوں کا مجموعہ، نظر ثانی، ترمیم و اضافہ کے بعد

عبد الماجد

ایڈیٹر صدق (لکھنؤ) مصنف تفسیر القرآن وغیرہ

ناشر

شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس

محمد علی روڈ بمبئی ۳

بسم اللہ

عرضِ حال

خُدا کی شان، ایک کم سواد، بے استعداد، قصباتی، دیہاتی کو بھی اس کا حوصلہ کہ اپنا نام ادیبوں، انشاپردازوں کی فہرست میں لکھائے اور دل میں یہ ولولہ کہ زبان وادب کی خدمت کرنے والوں کی صف (صفِ آخر سہی) میں جگہ پائے!

اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

اسرائیلیوں کی زبان میں، "لو اور سنو، میاں طالوتؑ کا شمار بھی پیمبروں میں ہونے لگا!" ——
مصر کی غریب ضعیفہ کو یوسفؑ کی خریداری کا شوق پیدا ہوا۔

اہلِ فضل کی ذرہ نوازی، دوستوں کی بے جا مدح و حوصلہ افزائی، اور پھر اپنا ذوقِ نمائش، مل ملا کر جو کچھ بھی کرا گذرے، تھوڑا ہے۔

پُرانے اور نئے ایسے مضمون جنہیں کچھ نہ کچھ مناسبت ادب وزبان سے ہو، رائے یہ ٹھہری کہ یکجا کر لئے جائیں۔ بعض ان میں کے حال کے ہیں اور بعض ۲۲،۲۳ سال قبل کے اتنے عرصہ میں قلم کا مذاق بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس لئے نظرثانی، اور وہ بھی جزئیات کی حد تک ان قدیم تحریروں پر بھی کر لی گئی، کہ طرزِ عبارت میں یکسانی کسی درجہ میں تو پیدا ہی ہو جائے۔ مجموعہ کاٹ چھانٹ کے بعد دو جلدوں میں آ پایا۔

پہلی جلد حاضر ہے، دوسری جلد بھی انشاء اللہ جلد ہی پیش ہو جائے گی، اس کے

بڑے عنوانات حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) چند مقالمے (مرزا رسوا[1] کے قصے۔ نیا آئین اکبری[2] - پریم چند[3] وغیرہ

(۲) چند نشریئے (ریڈیو سے نشر کی ہوئی تقریریں)

(۳) چند مرثیے (تعزیتی مضامین)

جو باکمال اس سیٹھی پھیکی غذا پر منہ بنائیں گے، وہ محض اپنی خوش ذوقی اور حقیقت سنجی کا ثبوت دیں گے۔ اور جو پردہ پوشی سے کام لیں گے، وہ کرم فرمائی اور صفت ستاری کا نقش بٹھادیں گے۔ مقام عدل و مقام فضل دونوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دوسرا پہلے سے خوب تر ہے، اور اُس سے اعلیٰ و برتر۔

دریاباد (بارہ بنکی)

عفو خواہ

عبدالماجد

فہرست مضامین

چند مقالے

چند تبصرے

چند مقالے

غالب کا ایک فرنگی شاگرد[1]

آناد فرانسیسی

پچھلے نمبر کے شذرات (معارف) میں اُردو کے چند فرنگی شاعروں کا جو مختصر تذکرہ آگیا تھا۔ ناظرین کرام نے اس سے دلچسپی کا اظہار کیا اور احباب کو یہ داستان خوشگوار اور پُر لطف معلوم ہوئی۔ اِن حضرات کی ضیافت ذوق کے لئے ایک فرنگی شاعر کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہے

الگزینڈر ہیدرلی ایک فرانسیسی خاندان کے رکن تھے[2] ولادت غالباً ہندوستان ہی میں ہوئی تھی سال ولادت تقریباً ۱۸۲۹ء اٹھارہ سال کی عمر سے اُردو شاعری کا شوق پیدا ہوا مشورہ سخن کے لئے کلام نواب زین العابدین خاں عارف[3] (شاگرد عزیز مرزا غالب) اور خود غالب کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا ان حضرات کا فیض توجہ کہیے، یا خود آناد کی طباعی کہ کچھ ہی روز میں اچھی خاصی مشق حاصل کرلی۔ اور کلام میں وہ پختگی آگئی۔ جو ایک غیر قوم کے فرد کے لئے بہت

---

[1] معارف (اعظم گڑھ) جنوری ۱۹۲۲ء۔ نظر ثانی مئی ۱۹۴۲ء

[2] تذکرہ جمخانۂ جاوید، از لالہ سری رام ایم۔ اے

[3] یہ وہی عارف ہیں جن کی جوان مرگی پر غالب نے وہ مرثیہ کہا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف، کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

(یہ مرثیہ مطبوعہ دیوان غالب (اردو) میں درج ہے۔)

بڑی بات ہے۔ عمر نے وفا نہ کی۔ کل ۲۲ سال کی عمر میں ۷۔ جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا، تاہم اس نوعمری میں کلام کا مجموعہ جس قدر ہو گیا تھا۔ وہ اوسط ضخامت کے دیوان کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ وفات کے دو ہی برس بعد اُن کے برادر کلاں طامس بیدر لی نے اس دیوان کو شائع کر دیا۔

تخلص آزاد کرتے تھے۔ اس لئے دیوان بھی دیوان آزاد کے نام سے موسوم ہے۔ ضخامت ۷۰ صفحہ ہے۔ مطبع احمدی آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اب بازار میں نایاب ہے۔ میرے پیش نظر کتب خانہ سرکاری رامپور کا نسخہ ہے۔

ابتدا میں دو دیباچے ہیں۔ پہلا دیباچہ فارسی میں منشی شوکت علی ساکن شاہپور ضلع فتحپور کا ہے۔ اب یہ صاحب خود گمنام اور محتاج تعارف ہیں۔ اپنے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ مشہور منشیوں میں شمار ہوتے تھے۔ طرز بیان تقریظ نگاروں کے عام دستور کے مطابق شاعرانہ ہے اور بعض بیانات مبالغہ آمیز حمد و نعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"فناسے ہنرمند و گوہر کا پیوند خداوند عقل و تمیز صاحب عزاست و ہر دلعزیز، مستعد ازلی الگزینڈر بیدر لی کہ ذہن و ذکاء او خلقش ضمیر بود و سعادت و مروت در ضمیر جا پذیر در سن سیزدہ سالگی بہ شنیدن، اشعار اساتذہ متقدمین و متاخرین طبع دقاوش در تحصیل کمالش توجہ نمود گاہ گاہ بہنگام فرصت، بمطالعہ تصانیف اوستادان پرداختے، و با محتشم الدولہ امیر الملک محمد اسد اللہ خاں بہادر سہراب جنگ غالب متخلص و نواب زین العابدین خاں متخلص بہ عارف کہ ہر دو حضرات از اکابر امراء والا دودمان دہلی بودند بذریعہ مراسلات و مکاتبات استمداد سخن داشتے"

آگے چل کر اسی دیباچے میں یہ ذکر ہے کہ بیدر لی کو طب میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا مریض عموماً ان کے علاج سے شفایاب ہوتے تھے، مزاج میں سخاوت و فیاضی حد سے بڑھی ہوتی تھی۔ دوائیں بلا قیمت تقسیم کرتے اور دوسرے طریقوں سے بھی غربا کی دستگیری کرتے رہتے۔ خود عسرت

سے بسر کرتے، لیکن دوسروں کی حاجت روائی کے لئے قرض لینے سے بھی دریغ نہ کرتے ریاست الور میں توپخانہ کے کپتان مقرر ہو گئے۔ اسی سال وفات پائی۔

دوسرا دیباچہ اردو میں ہے اور یہ آزاد کے بڑے بھائی طامس ہیدرلی کے قلم سے نکلا ہے یہ ریاست بھرت پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ دیباچہ ذیل میں تمام و کمال درج کیا جاتا ہے۔ آج سے ۸۰، ۸۵ سال قبل کی ایک فرانسیسی کی اردو نثر کا نمونہ بجائے خود ایک یادگار شے ہے۔

نیاز مند درگاہ لم یزلی طامس ہیدرلی ابن مسٹر جیمس ہیدرلی مرحوم بیان کرتا ہے اور اپنا راز دل صاحبدلوں پر یوں عیاں کرتا ہے کہ میرا حقیقی چھوٹا بھائی کپتان الگزینڈر ہیدرلی جوان سعادتمند شیریں زبان و دانش پیوند ابتدائے عمر میں شعر و سخن کا مائل تھا۔ اور چند روز میں جیسا چاہیے مایہ سخنوری و معنی گستری اس کو حاصل ہوا کیونکہ طبیعت دراک تھی۔ فکر چالاک تھی۔ جو کچھ دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک آیا۔ اس نے گلہائے معنی کا ایک تختہ خوشنما دکھایا رفتہ رفتہ اس کے کلام کی وہ صورت ہوئی کہ ہم فنون کو رشک ہوا اور دانشمندوں کو حیرت ہوئی نواب زین العابدین خاں دہلی کے امیرزادہ عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے اور جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب کے شاگرد تھے۔ وہ اس کے استاد تھے اور اس نوجوان کو اپنے استاد اور اپنے استاد کے استاد کے انداز پیش نظر تھے۔ اور اکثر ان کے اشعار یاد تھے۔ ہنوز برادر موصوف بہت کچھ بکنے نہ پایا تھا۔ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ اس کے دل میں تھا۔ ابھی اس کی زبان پر نہ آیا تھا کہ ناگاہ وقت ناگزیر آپہنچا اور اس سعادتمند ازلی کو پیغام اجل آپہنچا۔ چونکہ سرکار الور میں عہدہ کپتانی پر مامور تھا۔ دنیا سے سفر کرتے وقت میری نظر سے دور تھا۔ ایسا لئیق ہونہار بھائی جس نے کل دو اوپر تیس برس کی عمر پائی۔ ساتویں جولائی ۱۸۶۱ء کو کام تمام

ہوا۔ اس غم کا جس قدر بیان کیجئے۔ اس سے سوا ہے جو اپنا حال بنلہے اور جس قدر غم کیا جائے بجا ہے۔ ع۔ ایں ماتم سخت است کہ گوینِد جواں مرد۔ افسوس نہ فریاد میں فائدہ دیکھا نہ رونے میں تاثیر پائی، بہت روئے پیٹے آخر صبر کرتے بن آئی۔ اشعار اس مرحوم کے جو پریشان جا بجا پڑے پائے گویا سونے میں زمرد اور یاقوت کے نگینے جڑے پائے۔ خیال آیا کہ جواہر کو بکھرا پڑا نہ رہنے دیجئے اور ان سب اشعار کو ردیف وار جمع کر کے دیوان مرتب کیجئے تاکہ جو کوئی دیکھے وہ کہے کہ اگرچہ اس شخص کی تھوڑی زندگی تھی مگر واہ اس قلیل مدت میں کیا گہر افشانی تھی نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھکو یہ یقین ہے کہ یہ جو کاغذ پر سیاہی سے لکھے گئے ہیں سو اس کے ماتم میں سیہ پوش ہوئے ہیں۔ الٰہی یہ مجموعہ اشعار مقبول طبع ہر سخنور ہو اور الگزینڈر رہید رلی کی رُوح کو حضرت یسوع کے قدم مبارک میں مغفرت بیسّر ہو۔

دیوان کی ابتدا "قصیدہ وحمد و وحدت" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مسدس نعت مسیحؑ ہے انہی صفحوں میں مختلف اعزہ، احباب اور والیانِ ریاست کی شان میں قصائد ہیں۔ بعض اچھے خاصے طویل ہیں۔ صفحہ ۴۱ سے صفحہ ۵۶ تک دیوان غزلیات ہے۔ باقی صفحہ ۶۵ تک متفرق قطعات، مخمس، مرثیہ وغیرہ ہیں، حمد میں بالکل وہی رنگ ہے جو ایک مسلمان شاعر کا ہوتا ہے، توحید باری کی توصیف ہر شعر میں ہے اور اس پر طرح طرح کے شاعرانہ استدلالات کئے ہیں۔ مسدس مسیحی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کا رنگ بالکل وہی ہے جو مسلمان شعراء کا نعت محمدی میں ہوتا ہے وہی ذوق وشوق وہی تفرع والحاج اور وہی وابستگی واعتماد شفاعت۔

تیری رحمت حامیٔ رزقِ گدایاں یامسیح	تیری بخشش تاج بخش تاجداراں یامسیح
تیری شفقت ہر کس وناکس کی خواہاں یامسیح	ہے تجھی سے نیک وبد کی مشکل آساں یامسیح
ساقیٔ زمین وشاہ دوجہاں تو ہی تو ہے	یامسیحا چارہ ساز عاصیاں تو ہی تو ہے

(زبان میں اگر کوئی ناہمواری نظر آئے تو زباندان حضرات گرفت کرنے سے پیشتر یہ یاد کر لیں کہ شاعر ایک غیر ملک اور غیر قوم کا شخص ہے جس کی مادری زبان کو اردو سے کوئی مناسبت نہیں)

ایک اور بند اسی مسدس کا :-

خسروا ازبسکہ ہیں میری خطائیں بےحساب　　عاصیانِ دہر میں اعلا نہیں میرا جواب
قابلِ دوزخ ہوں میں اور لائقِ قہر و عتاب　　عین نصفت ہے جہاں تک مجھ پہ ہوں رنج و عذاب
اور کچھ چارہ نظر آتا نہیں اپنا مجھے　　تیری اُلفت پر توکل ہے شفاعت کا مجھے

ایک مخمس میں مرزا غالب کی غزل "تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے" کی تضمین کی ہے۔ پہلا بند یہ ہے :-

بلا سے ہیں نہ سہی خاک بھی اعدو کیا ہے　　تمہیں اسی کی قسم اس کی آبرو کیا ہے
زبان شوخ بیاں کا یہ حسن خو کیا ہے　　ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

آخری بند یہ ہے :-

کہا جو میں نے کہ غالب نظر نہیں آتا　　نیاز آپ کی خدمت میں اب نہیں لاتا
تو بولے بھید کو آزاد تو نہیں پاتا　　ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ایک اور مخمس میں ناسخ کی مشہور غزل "میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا" کی بھی تضمین ہے
اپنے استاد نواب زین العابدین خاں عارف کا طویل مرثیہ کہا ہے - اور بعض بعض شعر خوب نکالے ہیں، نمونہ حاضر ہے :-

اے اہل دید دیکھ لو آنکھوں سے کیا ہے آج　　میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو رہا ہے آج

یاں بعد مرگ حشر کا رکھتے ہیں انتظار
لو سر پہ جیتے جی ہی قیامت بپا ہے آج

مردے عجب نہیں کہ نہ اٹھیں جی کے قبر سے
ہم بانگ صور نالۂ اہل عزا ہے آج

ماتم سے کیوں نہ دہر میں پڑ جائے زلزلہ
تشہیر بے ثباتی ارض و سما ہے آج

پھر ہوگا شور خلق میں طوفان نوح کا
اے اہل گریہ گریہ جوش بکا ہے آج

اے جذب اتحاد یہی ہے مدد کا وقت
وہ غم میں ہم کو چھوڑ کے تنہا چلا ہے آج

اے جان زار جانے میں یہ دیر حیف حیف
کچھ بھی نہ وفا تجھے اے بے وفا ہے آج

غزلیں اکثر غالب کی زمینوں میں کہی ہیں، اور ان میں صفائے بیان اور سلاست روانی وشستگی زبان کا سررشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ کہیں کہیں مضمون بھی بہت لطیف پیدا کیا ہے بعض اشعار حسن تعلیل کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔ ایک غزل غالب کی مشہور غزل جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا پر ہے ؎

ہیں نہ وحشت میں کبھی سوئے بیاباں نکلا
واں سے دلچسپ مرا خانۂ ویراں نکلا

واعظوں سے سنا کرتے تھے جنت کا بیاں
جبکہ تحقیق کیا کوچۂ جاناں نکلا

اس کی جا آج در یار پہ بیٹھا ہے رقیب
خاک خوش ہووے جو کل یار کا درباں نکلا

وہ رخ ہوش ربا دیکھ کے کب ہوش رہا
وصل میں بھی تو نہ دل کا کوئی ارماں نکلا

اشعار ذیل ایک بہتر شاعر اور اہل زبان کے لئے بھی باعث فخر ہو سکتے ہیں۔

شکل قاصد نظر نہیں آتی
نہیں آتی خبر نہیں آتی

وہ بلا کونسی ہے صحرا میں
جو کبھو میرے گھر نہیں آتی

ایک طویل غزل کا اقتباس یہ ہے:۔

خوش ہوں مشکل سے کوئی کام جو آساں ہوتا
دور افلاک کا شرمندۂ احساں ہوتا

اب تو تا حشر نہیں ہے کوئی مرنے کا سبب — تھا مرے حق میں جو ہوتا شبِ ہجراں ہوتا

اہلِ جنت سے مری روز لڑائی ہوتی — خلد بالفرض اگر کوچۂ جاناں ہوتا

ہم بھی مجنوں کی طرح خاک اڑاتے پھرتے — ہوتے ویران اگر گھر نہ بیاباں ہوتا

دیکھتے وہ کبھی آئینہ کے دھوکے میں اگر — ہیں جو بیتاب ہوا کاش کے حیراں ہوتا

کس سے بہلائیں سگِ یار کو عریانی میں — آج کام آتا وہ آزاد جو درباں ہوتا

تیسرا شعر غالباً غالب کے اس شعر کو پیشِ نظر رکھ کر کہا گیا ہے۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

تقدیر پہ شاکر ہے راضی برضا ہم — اب کس کی شکایت کریں اور کس کا گلا ہم

مت حسن پہ بھولو کہ دکھا دیں گے بزم کو — کرتا ہے وفا حسن کہ کرتے ہیں وفا ہم

مشہور ہو سر حلقۂ اربابِ جفا تم — معروف ہیں منجملۂ اصحابِ وفا ہم

ہیں شمع صفت انجمنِ دہر میں آزاد — سرگرم رہِ وادیِ تسلیم و فنا ہم

غالب ہی کی زمین میں ذیل کے دو شعر سننے کے قابل ہیں۔

نہ دے جو بوسۂ گیسو نہ دے جواب تو دے — بلا سے جو تجھے دینا ہو دے شتاب تو دے

حقیقتِ دلِ خوں گشتہ سر بسر ہو عیاں — ذرا وہ طرۂ پرخم کو پیچ و تاب تو دے

متانت و سنجیدگی جو اکثر دہلی والوں کا حصہ ہے آزاد کے ہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے ۔ وصل کے بے پردہ مضامین ، سوقیانہ محاورہ ، ہوس پرستی اور مبتذل الفاظ و تراکیب سے ایک بڑی حد تک ان کا کلام بالکل پاک ہے ۔ وہ عاشق ہیں مگر شریف عاشق ، وہ معشوق رکھتے ہیں مگر ان کا معشوق زنِ بازاری نہیں ، وہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے مغربی ہیں مگر ان کی شاعری میں مشرق کی بلند پایہ عاشقانہ شاعری کی جھلک

پوری طرح موجود ہے، اس کا کچھ اندازہ ان کے منقولہ بالا کلام سے ہوگا اور مزید ثبوت آئندہ اشعار سے ملے گا۔

ہے مگر یہ نہیں ظاہر کہ کہاں — زخم پنہاں ہے کہ ہے مسکنِ جاں
دِل وہ دِل ہے کہ سدا غم سے گداز — چشم وہ چشم کہ خونبابہ فشاں
میکشو دین ہے کتنا سستا — ایک ساغر ہے بہائے ایماں
ہم نے اس شوخ کو دِل میں رکھا — جب نہ پایا کوئی خلوت کا مکاں
طبع کو صرف دعا کر آزاد — ہو چکا حال و حقیقت کا بیاں

مومن خاں کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے ؎ دلبستگی سی ہے کسی زلفِ دوتا کے ساتھ
پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ

جس غزل پر دہلی کے متعدد شاعروں نے غزلیں کہی ہیں جن میں سالک۔ انور کی غزلیں اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں، مرزا غالب کی بھی غزل دیوان ناظم (نواب یوسف علیخاں ناظم والی رامپور) میں ملیگی آزاد نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ بعض اشعار کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

اُڑتا ہے جسم زار ہمارا ہوا کے ساتھ — چلتے ہیں تیرے کوچہ میں بادِ صبا کے ساتھ
بے اعتنائیوں میں بھی کیا کیا لگاؤ ہیں — ہیں رنج ادائیاں تری کس کس ادا کے ساتھ
جو ہیں سو بس یہی ہیں مرے مشتِ استخواں — ہو جا شریک اے سگ جاناں ہما کے ساتھ
گویا مرا نوشتۂ تقدیر ہو گیا — وہ ربط ہے جبیں کو ترے نقشِ پا کے ساتھ
میں جانتا ہوں جان سے تم کو عزیز تر — اُلفت ہوتی ہے جب تو ہوتی بے وفا کے ساتھ
عشق بتاں میں وہم سے ہوں اپنے بدگماں — کیا ورنہ دشمنی مجھے خلق خدا کے ساتھ

غالب کی اس غزل پر "مرہم کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے" آزاد نے ایک دو غزلہ کہا ہے۔ چند

شعر یہ ہیں :-

قانع ہوں اس پہ عشق میں جو خشک و تر ملے | کھانے کو داغ پینے کو خونِ جگر ملے

بے درد ہو نصیب مرے مدعی کو دل | بے داغ دشمنوں کو ہمارے جگر ملے

حاصل ز بس خلاف تمنا ہے کام دل | جب ہووے زہر کی ہمیں خواہش شکر ملے

آزاد کس کا شیخ و برہمن نہ اُن سے پوچھ | ہے مفت، دین جا کے بھی وہ بت اگر ملے

افسوس خاک تک نہ ہمیں بھر بسر ملے | وہ لوگ بھی ہیں جن کو اُڑانے کو زر ملے

بس ہو گیا یقین کہ یہی راہ یار ہے | دل جا بجا پڑے جو سر رہگذر ملے

پھرتا ہے تو تو خلق کی آنکھوں میں راندن | روئے زمیں پہ کس کو ترا رہگذر ملے

آزاد ہم تو آج گذر جاتیں جان سے | کوئے صنم میں جا پئے مدفن اگر ملے

اس میں شبہ نہیں کہ دیوان آزاد میں جا بجا لفظوں اور ترکیبوں کی غلطیاں ملتی ہیں اور بندش تو بہت سے مقامات پر سست نظر آتی ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ کلام ایک ہندی کا نہیں فرنگی کا ہے جس کو جواں مرگی نے مشاقی کا بھی پورا موقع نہ دیا، دیوان آزاد کو بحیثیت مجموعی بہت غنیمت بلکہ قابل قدر سمجھنا چاہیے۔ اردو کے مغربی شاعروں میں ایک اور "صاحب" کا دیوان نظر سے گذرا ہے۔ دیوان شور اصل نام مسٹر جارج پیس تھا، غالباً میرٹھ میں قیام رہتا تھا۔ دیوان دو حصوں میں ہے پہلے حصہ کی ضخامت کا خیال نہیں، دوسرا حصہ ۲۲۸ صفحے میں آیا ہے اور ممتاز المطابع پریس میرٹھ میں خود مصنف کی حسب فرمائش ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا ہے لیکن کلام بہت معمولی ہے۔

پیام اکبر

یعنی

حضرت اکبر الہ آبادی کی کلیات سوم پر ایک نظر

لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانۂ حال کے ان چند بزرگوں میں تھے جن کا مثل و نظیر کہیں مدتوں میں جاکر پیدا ہوتا ہے۔ اُنکی ذات ایک طرف شوخی و زندہ دلی اور دُوسری طرف حکمت و روحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی یا یُوں کہیئے کہ ایک طرفہ معجون۔ آخر آخر ان کی شاعری نہ شاعری رہی تھی، نہ ان کا فلسفہ، فلسفہ۔ ان کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود مجسم حکمت و معرفت کے سانچہ میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی گفتگو جامع تھی حکمت و ظرافت کی، ان کی صحبت ایک زندہ درسگاہ تھی۔ تصوف و معرفت کی۔ روزمرہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کرجاتے کہ دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے، اور باتوں باتوں میں اُن مسائل کی گرہ کشائی کرجاتے، جو سالہا سال کے مطالعہ سے بھی نہ حل ہوپاتے۔ خوش نصیب تھے، وہ جنہیں ان کی خدمت میں نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ جن کی رسائی اس چشمۂ حیات تک نہ ہوسکی۔ انہیں آج اپنی نارسائی و محرومی پر حسرت ہے، اور جن کی ہوچکی تھی انہیں یہ حسرت ہے کہ اور زیادہ سیراب کیوں نہ ہولئے۔

اکبر کے مجموعۂ کلام پر تفصیلی تبصرہ کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ چھپا ہوا کلام اس

ؔ رسالہ اردو اورنگ آباد (دکن) اکتوبر ۱۹۲۲ء، اپریل ۱۹۲۳ء، نظر ثانی ۱۹۴۳ء

وقت تک تین جلدوں میں ہے اور جو حصّہ ابھی غیر مطبوعہ ہے، وہ بھی اتنا ہے کہ اگر دو جلدیں نہیں تو ایک بھر کے لئے تو بالکل کافی ہے۔ رسالہ کی محدود گنجائش، اس سارے ذخیرہ پر اجمالی نظر بھی ممکن نہیں۔ یہاں صرف اس حصّہ کلام پر نظر کی جائے گی جو انہوں نے تقریباً ۱۹۱۴ء سے لے کر آخر ۱۹۱۹ء تک فرمایا۔ اس دور کے کلام کا شائع شدہ مجموعہ[۱] انکے کلیاتِ سوم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک معتدبہ ذخیرۂ کلام اس کے بعد کا بھی ہے۔ یعنی سن ۱۹۲۰ء سے لے کر عین وقت وفات ستمبر ۱۹۲۱ء تک کا۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ بھی کلیاتِ چہارم کے نام سے شائع ہو جائے لیکن ابھی تک کہ مرحوم کی وفات کو ۲۳ سال گذر چکے ہیں مسودہ کی حالت میں ہے، اور مسودہ بھی شاید پوری طرح مرتب نہیں۔

بہتر ہوگا کہ ان کی شاعری کو مختلف صنفوں میں تقسیم کر کے ہر عنوان پر جداگانہ نظر کی جائے۔ ہاں متعدد اشعار ایسے بھی ہونا لازمی ہیں، جو ایک عنوان کے ماتحت میں آئیں گے اور دوسرے کے بھی مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں سے انہیں بار بار لانا پڑے گا، اور تکرار بیان ایک حد تک ناگزیر ہوگی۔

اکبرؔ کی کتاب شاعری کے پانچ باب باآسانی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ظرافت و زندہ دلی۔

(۲) سیاسیات

---

[۱] حضرت اکبرؔ بڑے ہی پُر گو، بڑے ہی زود گو تھے۔ بات چیت کرتے جاتے اور شعر کہتے جاتے۔ لیکن کلام کا ایک خاصہ حصّہ ایسا بھی ہوتا جسے صرف نجی کی محفلوں تک محدود رکھتے اور اپنے مخصوص دوستوں ہی کو سناتے۔ عام اشاعت۔۔ کے روادار اس حصّۂ کلام کے لئے کسی حال میں بھی نہ ہوتے۔

(۳) عشق و تغزل

(۴) اخلاق و معاشرت

(۵) تصوف، معرفت و فلسفہ

ان میں سے ہر عنوان پر الگ گفتگو مناسب ہو گی۔

ظرافت و زندہ دلی

اکبر کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب اُن کی ظرافت تھی، ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا، ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر اُن کا نام پھیلا ہوا ہے، اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے قوم نے اُن کو جانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ملک نے اُن کو پہچانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دِلوں کو کھلا دیتے ہیں۔

اس میں ذرا کلام نہیں کہ اکبر ظریف اور بہت بڑے ظریف تھے۔ لیکن جس زمانہ کے کلام پر یہاں خصوصیت کے ساتھ تبصرہ مقصود ہے، یہ زمانہ ان کی ظرافت کے شباب کا نہ تھا۔ جب تک خود جوان رہے شوخ طبعی بھی جوان رہی۔ عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدرِ کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی۔ صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے، تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں، اور زندہ دِلی کی شمع جھلملانے لگی۔ حکمت کی تلاش اور حقیقت کی تڑپ دِل میں پیدا ہوئی۔ جمالِ حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشمِ بصیرت کو محوِ نظارہ بنایا، سوزِ عشق نے سینہ کو گرمایا، ذوقِ عرفان نے دِل کو تڑپایا، اور نورِ معرفت کی شعاعیں خود ان کے مطلعِ قلب سے اس چمک دمک کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی

آنکھیں قریب تھا کہ چکا چوند میں پڑ جائیں۔ یہی تو بات ہے کہ کلیات سوم میں خالص ظریفانہ اشعار شاید ۱۰ فی صدی بھی نہ نکلیں[1] حالانکہ کلیات اوّل و دوم میں ظریفانہ اشعار کا تناسب، تیس فیصدی سے کسی حال میں کم نہ تھا۔

لیکن ہے یہ کہ قسام ازل نے ذہانت و فطانت، شوخی و زندہ دلی کی تقسیم میں ان کے لئے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اس لئے پیرانہ سالی میں بھی ایک طرف ذاتی صدمات و خانگی مصائب[2] کا ہجوم، اور دوسری طرف مشاغل دین و تصوف کے غلبہ کے باوجود یہ جذبات فنا ہرگز نہیں ہونے پاتے۔ شمع جھلملا ضرور رہی تھی۔ مگر بجھی نہ تھی یا آفتاب ڈھل ضرور چکا تھا۔ مگر غروب تو نہیں ہوا تھا۔ بدر، ہلال بننے لگا تھا لیکن بے نور نہیں ہوا تھا۔ چمن سے بہار رخصت ہونے کو تھی تاہم خزاں کا سایہ بھی ابھی نہیں پڑنے پایا تھا۔ زندہ دلی نہ صرف قائم تھی بلکہ اس قوت کے ساتھ اس شدت کے ساتھ کہ دیوان پڑھنے والے متحیر اور کلام سننے والے ششدر رہ گئے۔ کلیات سوم میں اس کے نمونے، بیشتر کے مقابلہ میں یقیناً کمتر، پھر بھی اچھی خاصی معقول تعداد میں نظر آتے ہیں۔

اکبر ظریف تھے "ہزال" و "فحاش" نہ تھے دلوں کو خوش کرتے تھے۔ چہروں پر تبسم لاتے تھے

---

[1] کلیات سوم میں سنہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء کا کلام درج ہے، حضرت اکبر کا سال ولادت سنہ ۱۸۴۶ء تھا۔ گویا اس وقت سن بحساب شمسی ۶۸ تا ۷۳ سال کا تھا۔

[2] حضرت اکبر کے دو محل تھے، زوجۂ اولیٰ سے تعلقات شروع ہی سے بہت تلخ رہے، زوجۂ ثانیہ محبوبۂ خاص تھیں انہوں نے سنہ ۱۹۱۰ء میں رحلت کی۔ چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم بہت محبوب تھے، ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں غالباً سنہ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے داغِ مفارقت دیا۔ بعض اور خانگی صدمات اس کے علاوہ تھے۔

جذبات سفلی کے بھڑکانے کی کوشش نہ کرتے ۔ ان کی ظرافت ہزل گوئی کے مترادف نہ تھی ۔ اکثر صورتوں میں معنویت سے لبریز ہوتی تھی، کہیں کہیں زبانی محاورہ، لفظی مناسبت ترکیب کی ندرت قافیہ کی جدت کے زور سے شعر کو لطیفہ بنا دیتے تھے ۔ سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے لیکن جتنا کہہ جانے میں جری ہے، اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں، پھیلانے میں محتاط تھے ۔ قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے کہ مخلصوں اور نیاز مندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی ۔ اور جو اتنے معتقد و با ادب تھے، وہ تو جھنجھلاہٹ میں خدا جانے کیا کچھ کہہ سن ڈالتے ۔ خیر ظرافت اس خاص غرض کے لئے یعنی ستر حال کے لئے، اخفائے خیال کے لئے، ان کے ہاتھ میں ایک اچھے لفافہ کا بڑے کار آمد آلہ کا کام دیتی تھی، جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے، اسی پردہ میں سُنا جاتے کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندوستانی ہندو و مسلم، سُنّی شیعہ، سب کی صحبت میں، اور مسجد اور مندر، کالج اور اسکول، خانقاہ و میکدہ کاؤنسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے ۔ ایک ایک شے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے ۔ اسے جھانکتے، تانکتے، اس کو جانچتے، اس کو بھانپتے، ایک کو تولتے، دوسرے کو ٹٹولتے ۔ لیکن ظرافت کے نقاب کے تار چہرے پر کچھ ایسے گہرے پڑے رہتے، کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب، بے تکلف صحبتوں میں بارہا یہ کہہ بھی گذرتے ۔ کہیں کہیں مطبوعہ کلام میں بھی اقرار کر گئے ہیں ۔ ایک جگہ واضح لفظوں میں فرماتے ہیں ؎

لغزشیں مدِ ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر	دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف
سرد موسم تھا، ہوائیں چل رہی تھیں برف بار	شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

"موسم" کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور "ہواؤں" سے مراد قانونی

شکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں۔ آج کی نہیں آج سے ۴۰ سال قبل کی۔ اُن کی ظرافت کا بہت بڑا منظہر یہی سیاسیات کا میدان تھا، اور اس باب میں ان کا عمل عارفِ رومیؒ کی تعلیم پر تھا ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اکبرؔ ان دلبرانِ سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے۔ ان اسرار کی منادی وہ سرِ بازار کرتے، لیکن زبان وہی اپنی اور مخصوص۔ جو لوگ ان کی اس بولی سے واقف ہو گئے تھے، وہ معنی و مفہوم کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے، اور جو تہ تک نہ پہنچتے۔ وہ بھی بہرحال ایک دل لگی کی بات سمجھ کر ہنس تو پڑتے ہی تھے۔ "بُت" "صنم" "مس" "شیخ" "سید" "سید صاحب" "اونٹ" "گائے" "کلیسا" "حرم" "دیر" "بتکدہ" "کالج" "برہمن" "لالہ" "صاحب" وغیرہ بیسیوں الفاظ نے اُن کی زبان میں کہنا چاہیئے کہ ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

ایک جگہ فرمانا یہ منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں، انہیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش ہو رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حریف نے ہماری حرص و ہوس، اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ کر کے ہمارنے لئے ایک جال بچھا دیا ہے۔ جس میں ہم اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں[1]، اور محکومی و تنزل کے غار میں برابر دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

لیکن اِدھر تصورِ حبا نہیں کسی کا	ماوٰن تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا
ہر سو اچھل رہے ہیں اور چہچہو رہے ہیں	ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں
اس باغ میں خزاں کی اکبرؔ بہار دیکھو	اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو

---

[1] کلیاتِ اول میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎ تڑپو گے جتنا جال کے اندر، جال گھسے گا کھال کے اند

لکھے گا کلک حسرتِ دنیا کی ہسٹری[1]   اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

"قبلہ رو جماعت" سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مرادِ مسلمان ہیں۔ کلام اکبر کا روئے سخن بیشتر اپنی ہی ملت کی جانب رہتا ہے۔ تعلیم اکبری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اصل الزام خود ہم پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے نہ ہوتے تو حیثیاد جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟ اون گر نہو تو دستہ چلے کس چیز پر؟

سرکاری مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی بھول بھلیاں کچھ رکھی ہی ایسی گئی ہے، کہ "ہم" ہمیشہ انہیں الجھاووں میں پڑے رہیں، اور "وہ" خود عیش و عشرت کرتے رہیں، ہم ان کی کلرکی کی خدمتگذاری کی، محنتوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہیں اور وہ آقایانہ بے نیازیوں کے ساتھ دادِ عیش دیتے رہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

سمجھا ہے تھے مجھ کو کمٹ[2] کی وہ گرد نہیں　　خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے ساز نہیں

نقشے میں دیکھتا تھا، وہ پیتے تھے جام مے　　میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے

ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ　　الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ

بولے کہ اس زمیں میں کوئی اور شعر بھی؟　　میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی!

اللہ رے ارتقاء سگانِ درِ حضور!　　کل "تو" سے "تم" ہوئے تھے، ہوئے آج "تم" سے "آپ"

ہنس کر دیا انہوں نے اکٹ بحث کا ورق　　گانے لگے وہ گیت، میں پڑھنے لگا سبق

سرکارِ نامدار کے بعض "نیکنام" محکموں اور سرشتوں کی ذہانت طباعی، بلکہ قوتِ خلاقی کے مشاہدہ سے یہ ظریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے، اور محکمہ پولیس کی کارگذاریوں کا کلمہ "پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر

---

[1] یعنی تاریخ　[2] دمدار ستارہ (COMET)

غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار؟ اس کے اسلاف صد ہا برس یار کی کمر کو تلاش کرتے آئے ہیں۔ آج تک پتہ نہ لگا۔ خواجہ خضر کی رہنمائیاں، ہاتف کی دستگیریاں، سروش غیب کی مہربانیاں سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ اس ہستی معدوم کا پتہ اب سرکار کے خفیہ پولیس ہی کی مدد سے کیوں نہ چلایا جائے؟ فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو اکبرؔ شوریدہ سر کا حال　　خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

ایسا اچھوتا اور نادر سرٹیفکٹ خفیہ پولیس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہوگا؟ اگر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات کے لئے مخصوص تھوڑے ہی تھا۔ جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اخلاق، معاشرت تعلیم ہر بزم کے بڑے بڑے بنے ٹھنے سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگ رنگ دیتے۔

اس وقت ملت پر جو فرنگی تہذیب و معاشرت کا جن مسلط ہے، اس نے نوبت یہاں تک پہنچادی ہے کہ علم، ہنر، اخلاق کے ساتھ ساتھ حسن و عشق، عیش و عشرت سب کا معیار بدل گیا ہے۔ اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں تک میں پابند، روز بروز مغربی معیار کے ہوتے جاتے ہیں۔ یہ کہانی اکبرؔ کی زبانی دو لفظوں میں ادا ہوگئی ہے ؎

فکر ساری کو ہے نہ کنگن کی　　اب تو دھن ہے انہیں فرنگن کی

اور خیر ادھر عاشقوں کا حال تو بدلا ہی تھا، غضب یہ ہوا کہ ادھر محبوبوں کی جماعت بھی "انقلاب زندہ باد" کی نذر ہوگئی۔ ادھر کی وضعداری میں فرق آیا، تو ادھر کی بھی طرحداریاں، کب اپنے رنگ پر قائم رہیں۔ بازار حسن میں چلن نئے سکوں کا ہوگیا، پرانے سکے ٹکسال سے باہر ہوگئے۔ اب تک مشرق نے اور مشرق کی شاعری نے حسن کا سب سے بڑا زیور، شرم و حیا، تمکین و حجاب کو سمجھا تھا، لیکن اب جو جاکر دیکھا تو محفل ناز کا رنگ ہی بدلا ہوا، کہاں کی کم سخنی اور کیسی بے زبانی؟ مشق اب خطابت کی ہو رہی ہے نہ اب نگاہ شرمگیں نہ چشم سحرگیں۔ اٹھی ہوئی نگاہیں، اور چیڑھی

ہوئی آنکھیں اب خود محوِ نظارہ، چہرہ پر نقاب کے ریشمی تاروں کی جگہ شفاف پتھروں کی عینک اور
سنہری کمانیاں! حجلۂ عروسی کی خلوتوں کا تخیل مٹ مٹا کر ڈرائنگ روم میں ٹھاٹھ محفل طرازی و
بزم نوازی کے جم رہے ہیں۔ عاشق بیچارہ اس قلبِ ماہیت پر دنگ رہ جاتا ہے، اور کہتا ہے ؎

خامشی سے ہے تعلق، نہ ہے تمکین کا ذوق — اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں — بت بھی اب دَیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھے مصرعہ نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے، مفہوم کو جا ہے کتنی وسعت دیتے چلے
جائیے۔ جو علماء دین سمجھے جاتے ہیں وہ حجروں کی چٹائیاں، انکسار و تواضع، چھوڑ، مسجدوں کی صفیں
لپیٹ، پنڈال اور پلیٹ فارم کی زینت بن گئے ہیں۔ جو صوفی و مشائخ کہے جاتے تھے۔ خانقاہوں
سے نکل، انہوں نے خود اپنے نقارہ پر چوب لگانی شروع کر دی۔ دینی مدرسوں کے طلبہ، استادوں
کی جوتیاں سیدھی کرنے کے بجائے لگے سٹرائک اور مطالبہ حقوق کا بگل پھونکنے۔ بیویوں نے شوہروں
کی خدمت چھوڑ، سینما اور تھیٹر کا راستہ اختیار کیا۔ مائیں بچوں کو آیاؤں کے حوالہ کر خود کلب
جا پہنچیں۔ یہ سارے کا سارا مفہوم اس ایک بلیغ مصرعہ میں سما گیا ع

بت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب و ہندوستانی حکومت، خواہ کسی ملت و فرقہ کی ہو، اغیار کی حکومت، اور
بیرونی تہذیب سے تو بہر حال گوارا تر ہے! اس مفہوم کو جن لذیذ و خوش ذائقہ کنایات میں ادا
کیا ہے، عجب نہیں کہ ان سے اہلِ ذوق کی زبان چٹخاریاں لینے لگے ؎

دھن دیس کی بھی بس ہی گاتا تھا اک دہائی — بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

پوری اور چپاتی اور بسکٹ تینوں کی تلمیحیں بالکل صاف ہیں۔ "پھر دیس کی دھن" تو ایک معنی تو اس
کے ظاہر ہی ہیں کہ وطن کا جوشِ محبت۔ باقی دھن، ایک اصطلاحِ موسیقی بھی ہے، اور دیسی نام ہے

ایک راگ کا۔ اور یہ گانا ایک یہاتی کی زبان سے ہے تو رحلی کرر۔

اس زمین کا دوسرا شعر بھی سننے کے قابل ہے ۔سن،

شانِ نماز اکبر، شا ظاہر ہو چلی ہے مسجد الگ بنائیں اپنی میاں فانی

نماز باجماعت کی تاکید تو تھی ہی اس لئے کہ شاہ و گدا، آقا و غلام، خادم و مخدوم، ایک صف میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں، اور کم از کم اللہ کے گھر میں آکر تو دن میں پانچ پانچ مرتبہ یہ بندوں والے امتیازات مٹتے رہیں۔ یہاں شیخ صاحب مسجد میں حاضر ہو کر بھی اپنی آقائی اور خواجگی کو نہیں بھولتے، اور لفافی اور حجمن بیچاروں کے لئے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ اپنی مسجد ہی الگ بنائیں!

ایک فی ہنیت اسوقت پھیلی ہوئی یہ ہے کہ زبان سے تو فرنگیت، فرنگی سیاست، فرنگی تہذیب، فرنگی حکومت کو خوب برا بھلا کہا جائے، لیکن انہیں حلقوں سے اگر کہیں داد ملنے لگے۔ حوصلہ افزائی ہونے لگے، صلہ و ستائش کی طرح پڑ جائے تو اس پر بھی دل خوشی سے اچھلنے لگتا ہے، اور اندر ہی اندر لہر، فخر و مسرت کی دوڑ جاتی ہے۔ اکبر کی نظر اس پہلو پر بھی گئی۔ اس کی گرفت اپنے پنجۂ آہنی سے کی صنعت گری کا کمال ملاحظہ ہو کہ فولاد کی صلابت و کرختگی، کس خوبی کے ساتھ نرم و گداز مخملی دستانے کے اندر غائب کر دی ہے

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

فلاں قومی شاعر کا خان بہادر ہو جانا، فلاں خادم ملت کا شمس العلماء بن جانا، یہاں تک کہ اقبال رح ایسا "سر" کے خطاب سے سرفراز ہو جانا، یہ سب مثالیں اسی رقیب کے دیئے ہوئے سرٹیفکیٹ کی ہیں۔

ملت کے نوجوانوں کو مذہب سے جو بیگانگی ہے، بُعد و اجنبیت ہے۔ اس کو اکبر نے

بڑی کثرت سے بیان کیا ہے، اور کہیں کہیں تو انداز ایسا لطیف اختیار کیا ہے کہ وہ ان کے سوا اور کسی سے ممکن ہی نہیں۔ دل کے آنسوؤں سے روتے جائیے، لیکن چہرہ وہی ہنسی اور تبسم کا بنائے رکھیے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے   پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

گویا لعدو بیگانگی کی حد یہ ہے کہ عبادت کی کوئی سنجیدہ اہمیت تو ذہن میں آ ہی نہیں سکتی، اور اب جو کوئی تاکید کرتا ہے تو خیال لامحالہ یہی گذرتا ہے کہ یہ بجز مذاق، ظرافت، دل لگی کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟

اب ملت کی مشغولیت سوا اس کے باقی ہی کیا رہ گئی ہے کہ صلاح و فلاح کی حقیقی تدبیریں اور ان کی جانب توجہ غائب، آج یہ انجمن بنی اور کل وہ مجلس۔ چندہ اس میں بھی دیجئے، اور اس میں بھی، اور ترقی کے بجائے سایۂ ترقی کو کافی سمجھ لیجئے ؎[1]

کمیٹی میں چندے دیا کیجئے   ترقی کے لئے کیا کیجئے

جدید حریت، جدید تعلیم و جدید کمیٹی بازی اور جلسہ سازی، حضرت اکبر ان سب چیزوں کے شدید مخالف تھے۔ چندہ کا رواج نیا نیا انہیں کے زمانہ میں نکلا تھا، اور خوب زور شور سے پھیل گیا تھا اس لئے ان کے ترکشِ طنز کے تیروں کا بڑا ہدف یہی چندہ رہا کرتا تھا۔ ذیل کی مصوری ان کے اپنے نقطۂ خیال سے کتنی دلکش اور کیسی جامع ہے ؎

قوم ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے   کالج کے چھوٹے پلتے ہیں ٹیڑھی کی ٹانگ سے

عالم ہیں چپ جو مستند و باوقار ہیں[2]   گو نجا ہوا[3] پریس ہے، وفائی کے سانگ سے[4]

---

[1] جس زمانہ کا یہ کلام ہے، علماء دین بھی کثرت سے سیاسی اور وطنی تحریکات کے جزو ونکران میں گھل مل گئے تھے۔ ایک حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مع اپنے مخصوص شاگردوں اور نائبوں کے، اس طوفان سے الگ اپنی دینی خدمات میں مشغول تھے۔ اکبر کا یہ اشارہ انہیں کی جانب ہے۔ [3] اخبارات۔ [4] راگ گیت۔

نیت دُنیا طلبی و دُنیا پرستی کی، لیکن آڑ مذہب کی، مقصود و مطلوب دُنیا لیکن زبان پر نام دین و مذہب کا۔ اکبر یہ رنگ دیکھتے ہیں، اور ذرا دیکھیے، یہ رنگ ڈھنگ دیکھ، صدا کیا لگاتے ہیں ؎

فرما گئے ہیں یہ خوب بھائی گھورن ۔۔۔ دُنیا روٹی ہے اور مذہب چورن

کھانا ٹھونس ٹھونس کر کھا لیا جاتا ہے تو آخر چورن کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ چورن کچھ دل سے مرغوب ہو۔ مقصود تو وہی کھانا ہی ہے، لیکن کام نکلتا نہیں بغیر چورن کی مدد کے۔ خود مقصود تو وہی دُنیا ہی ہے، لیکن آڑ بہرحال مذہب کی:

"گئو رکھشا" کی جد و جہد نئی نہیں، پرانی ہے، اور تحریک خلافت کے زمانہ میں یعنی یہی کوئی ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں تو قدرتاً اس کا بڑا زور بندھا۔ مسلمان اتحاد کے جوش میں اس معاملہ میں بھی ہندوں سے کچھ آگے ہی بڑھ چلے، اکبر کا کہنا ہے کہ خیر گائے کی جان بچی تو بچی، یہ بھی ایک سیاسی مصلحت سہی مصلحت نہیں ضرورت تک کہہ لیجیے، لیکن آگے چلئے، اصل ضرورت تو مسلمانوں کو ایسے احکام دین و شعائر ملی پر توجہ کی تھی۔ تخیل کا یہ طیارہ، ظرافت کی پھلجھڑی بن کر یوں پیش ہوتا ہے ؎

چھوٹیں جو گائے مانا حسرت ہو اونٹ بدلے ۔۔۔ افسوس شیخ جی نے ہم کو پتا نہ سمجھا

اور یہ ترک ذبح کا مسئلہ تو پھر بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اکبر کی نظر تو قومی و ملی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزئیات پر رہتی تھی۔ ایک روز مجلس میں راقم سطور حاضر تھا۔ ارشاد یہ ہو رہا تھا کہ "صاحب" کی دیکھا دیکھی اب تو ہماری ہر چیز انجمن سازی اور انجمن بازی کی نذر ہے۔ اتنے میں ذکر انجمن ترقی اُردو کا نکل آیا۔ فرمایا: "جی ہاں دیکھیے نہ زبان ہماری اپنی چیز تھی، اب یہ بھی ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اس کے لیے بھی ایک انجمن کھڑی کی گئی ہے"، جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

ہم سے چھن کر ہو گئی بزم ترقی کے سپرد ۔۔۔ سچ کہا مرزا نے اب اُردو بھی کورٹ ہو گئی

حکومت کے دربار میں عزت کی کرسی حاصل کرنے کا جو ایک ہی طریقہ و تدبیر ہے، سب پر روشن و

عیاں ہے، لیکن اسے کھلے لفظوں میں کہہ دینا سب سے لڑائی مول لے لینا ہے۔ اکبر ہی کی زندہ دلی ہے جو اس تلخی میں بھی ایک شیرینی اور حلاوت پیدا کر دیتی ہے ؎

عقل نے اچھی کہی کل لالہ مجلس رائے سے — جھک کے ملنا چاہیئے ہم سب کو دلسر رائے

"صاحب" کے ہاں عزت پانے پہ اُن کے لئے "لالہ مجلس رائے" کیا خوب، اور اس کا قافیہ دلسر رائے تو بہت ہی خوب! عقل بمعنی مصلحت اندیشی، داد اور لطفِ قافیہ کے لئے ساتھ کا دوسرا شعر بھی معاً سُن ڈالیئے ؎

شعر کیسا ہی ہو، لیکن قافیئے اس کے ہیں خوب — کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

ندرتِ تشبیہات، اکبر کے نسخہ ظرافت کا جزوِ اعظم ہے، ایسی ایسی اچھوتی، نادر و لطیف تشبیہیں اور کہیں کہیں پھبتیاں انہیں خود بخود سوجھ جاتی ہیں، جو دوسروں کے ذہن میں سوچ بچار کے بعد بھی نہ آتیں یہ ہم آپ سب ہی جانتے ہیں، روزمرہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک طرف تو شوق صاحبیت کا سوار رہتا ہے۔ دوسری طرف کچھ رکھ رکھاؤ، کچھ ذات برادری والوں کا ڈر، کچھ وضع کا پاس غرض نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے"۔ ایک تذبذب، گومگو، اور دو عملی کا عالم قائم۔ چار قدم آگے بڑھے تو چھ قدم پھر پیچھے ہٹ گئے۔ کتر بیونت کچھ ادھر سے کی، کچھ اُدھر سے۔ جوڑ پھر بھی ٹھیک نہ بیٹھا۔ نہ خدا کی یافت ہوئی، نہ صنم کا وصال نصیب ہوا۔ ہنسے گئے، بنائے گئے، قہقہے ادھر سے بلند ہوئے، تالیاں اُدھر سے بجیں، واقعیت کے اس سادہ نقش پر حضرت اکبر کی گلکاری ملاحظہ ہو ؎

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی — اُونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

اکبر کے زمانہ میں سینما کہاں تھا۔ تھیٹر ہی سب کچھ تھا۔ ناٹک دیکھنے کے لئے کسی ثقہ بزرگ کا بہ ایں جُبّہ و عمامہ تشریف لے جانا، اور پھر اس کے لئے اُونٹ جیسی مقدس سواری کا انتخاب کرنا جانِ بلاغت

ہے۔ کیا کیا انگلیاں اٹھی ہونگی جب حضرت سلامت کی سواری اس شان سے اونٹ پر نکلی ہو گی!
عام شاعروں پر قیاس کر کے لوگ اکبر سے بھی فرمائشی شاعری کی توقع رکھتے تھے۔ اور فرمائشوں کی بھرمار سے انہیں زچ کر دیتے تھے۔ آپ نے بھی یہ کیا کہ ساری توقعات سارے تقاضوں کے جواب میں ایک پر لطف اور اچھوتی تشبیہہ پیش کر دی ؎

عشاق کو بھی مالِ تجارت سمجھ لیا　　اس قہر کو ملاحظہ للّٰلہ کیجیے
کہتے ہیں فیس لیجیے اور آہ کیجیے　　بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں

اخباروں، رسالوں کی طرف سے فرمائشوں کی حد ہی نہ تھی۔ اکبر کا نام چلا ہوا، شہرت خوب پھیلی ہوئی ہر ایک یہی چاہتا کہ اس شہرت و ناموری سے خود فائدہ اٹھائے۔ اکبر کہاں تک سب کو خوش رکھتے اور پھر پیرانہ سالی میں، مروت میں انکار کرتے بھی نہ بن پڑتی۔ آخر ایک مرتبہ یہ شعر چھاپ دیا ؎
یہ پرچہ جس میں چند اشتہار ہیں ارسالِ خدمت ہے　+　ہمارے لختِ دل ہیں، آپ کا مالِ تجارت ہے
یہ ضرور نہ تھا کہ تشبیہیں ہمیشہ نادر اور اچھوتی ہی ہوں بعض جگہ معروف و مانوس بلکہ پامال تشبیہوں کو بھی استعمال کیا ہے، مگر اس حسن و صنعت کے ساتھ کہ اس تغلیبہ پر جدتیں نثار ہو ہو جائیں مشاطہ فن کا کمال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ ۶۰ سال کی بوڑھی ہاڑھی خاتون میں ۱۶ سال کی حسین و نوخیز لڑکی کا حسن و جمال رعنائی و محبوبی پیدا کر دے! بعض نامور استادوں کو دیکھا ہو گا کہ شعر کہنا تو کچھ واجبی ہی سا آتا ہے، البتہ محاورہ خوب باندھتے ہیں، لفظ کوئی غلط نہیں آنے پاتا، عروض کی لغزش کوئی نہیں ہونے پاتی، متروکات سے بہت محتاط رہتے ہیں، ذم کا پہلو کلام کے پاس نہیں پھٹکتا۔ اکبر کے نگار خانہ میں شبیہ ان حضرات کی ملاحظہ ہو ؎

عشق کے معنی کے عالم تھے، مگر عاشق نہ تھے　　صورتِ عذرا سے واقف تھے، مگر وامق نہ تھے

ایک دوسرا تعارف انھیں حضرات کا یوں کراتے ہیں ؎

صورتِ لیلےٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوانِ قیس، شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

طبیعت میں مضمون آفرینی غضب کی تھی۔ نمونے اوپر ہی سے آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ ایک اور ملاحظہ ہو۔ اُردو رسم الخط کے دشمنوں کا کہنا یہ ہے کہ اس کو گھسیٹ میں لکھا کچھ جاتا ہے اور پڑھا کچھ۔ یہ کہنا کچھ صدق دِل سے نہیں۔ تمام تر پروپیگنڈا کے ماتحت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیوناگری کی گھسیٹ تحریر اُردو سے کہیں زیادہ چوپٹ ہوتی ہے اور اس کی مضحکہ انگیز مثالیں، عدالتی کارروائیوں، دستاویزوں وغیرہ کے حوالہ سے اخباروں میں بار ہا نکل چکی ہیں۔ ...... اب دیکھئے کہ اکبرؔ کی نازک خیالی نے اس خشک حقیقت سے کیا طرفہ مضمون نکال کھڑا کیا ہے

دوستو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ بھی کام کی بات
لبکہ نامۂ اعمال مرا ہندی میں کوئی پڑھ ہی نہ سکا مِل گئی فی الفور نجات

زمانہ کی ناقدری، شاعری کی دُنیا کا بڑا پُرانا مضمون ہے۔ سب ہی سب شاعر سامعین کی بدمذاقی کا رونا روتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہی صدائے درد، جب چمنستانِ ظرافت کے اس عندلیب کی زبان سے نکلتی ہے تو نغمۂ لطیف بن کر جھلاتی ہے۔ رُلاتی نہیں ہنساتی ہے، اور ٹیس گُدگُدی میں تبدیل ہو کر رہتی ہے

قدرداں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ اُلّو نہ ہوئے

اُردو دانوں، اُردو خوانوں، اُردو نویسوں کی بزم میں "مرحبا" اور سبحان اللہ کی کیا کمی۔ تحسین کے وہ غلغلے، آفرین کے وہ آوازے بلند ہوں کہ محفل کی محفل گونج جائے۔ درو دیوار ہِل جائیں لیکن لفاظی کے اس شور و ہنگامہ کے آگے؟ بس خلا ہی خلا۔ بڑی سے بڑی علمی تحقیق و کاوش میں سر کھپایئے۔ اس کے بعد خود ہی اپنے ہاتھ سے مسودہ صاف کیجئے۔ مطبع والوں کے دروازہ پر

دستک دیجئے - ان کے سارے نشتر غمزے برداشت کیجئے - وعدے وعید سے آزما کر پریس کے شکنجہ میں کتاب کے صفحوں کے ساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی شکنجہ میں دبا دیجئے - اور جب کتاب پریس سے باہر آئے - تو خود ہی اشتہار لکھئے - اور چھپے مدتوں خود ہی پڑھتے رہئے - کتابیں یا تو دوستوں کو ہدیتہً تقسیم کر دیجئے، ورنہ ڈھیر اپنے سامنے لگا دیکھ کر بس خوش ہوتے رہئے۔ یہ خشک حقیقت اردو اہلِ قلم کے لئے کیسی ہی یاس انگیز، دل شکن، ہمت توڑ سہی - لیکن دیکھئے ظرافت کی مسیحائی نے اس بے جان لاشہ میں کیسی جان ڈال کر اُسے گویا کر دیا ہے ؂

کھلا دیوان مرا تو شورِ تحسین بزم سے اٹھا   مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

شاعروں کا ضعف و ناتوانی، العظمۃ للہ، ضرب المثل کے درجہ تک پہنچا ہوا، جسے دیکھئے سب ہی اپنی صحت سے نالاں، اپنی لاغری سے متعلق نوحہ خواں ہمارے حضرت اکبر نے اس پامال مضمون میں ندرت یہ پیدا کی، کہ کمزور و ناتواں اپنی صحت ہی کو نہیں، اپنی بیماری کو بھی باندھا، اور اپنے مرنے کو اپنی بیماری ہی کی کمزوری کے بل پر ثابت کر دکھایا - فرماتے ہیں ؂[2]

کمزور ہے میری صحت بھی، کمزور مری بیماری بھی   اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ندرتِ قوافی کے تو بادشاہ تھے، ایسے ایسے نادر قافیے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے کہ اُن کے تصور ہی سے دوسروں کا قافیہ تنگ ہو جائے - یوں کہئے کہ ان کے نمکدان ظرافت کی نمکینی اکثر یہی جنسِ نایاب قائم کئے ہوئے، ایک جگہ بڑھاپے کی آپ بیتی، دکھ درد کی کہانی سناتے ہیں، لیکن طبیعت کی شوخی کا یہ عالم کہ سننے والوں کو رلانے کی جگہ ہنساتے جاتے ہیں ؂

---

[1] اُردو میں یہ لفظ شاید پہلی بار آ رہا ہے، میرے ذوق میں یہ عربی و ہندی کی ترکیب جائز ہے

[2] غیر مطبوعہ یعنی اب تک کسی کلیات میں درج نہیں۔

ہر طرح راحت تھی مجھ کو دانت سے | قافیہ اُن کا ملا تھا آنت سے
صحت اب بگڑی تو اُن میں درد ہے | اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے
خوابِ راحت کس کو، کھانا کون کھائے | رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے
درد کے آگے رہا منجن بھی گرد | مصطگی بھی رہ گئی با رُوئے زرد!

ایک دُوسرا زعفران زار اس سے بھی بڑھ کر ملاحظہ ہو ؎

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے | وہی مازو، وہی کافور[1] چلا جاتا ہے
ڈارون[2] کے اسی لکچر کا سبق ہے اب تک | وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے
برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ | روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

"روشنی" اور "نور" کا یہ نازک فرق اس کے قبل کسی کو کیوں سوجھا ہوگا! اور پھر برقی لیمپ، سبحان اللہ نورٌ علیٰ نور! قطعہ کا آخری شعر ہے ؎

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی اور دل نہ جھکا | آج تک شوقِ سقنقور[3] چلا جاتا ہے

اشعار ذیل میں جان محض قافیہ نے ڈالدی ہے ؎

جو سچی بات ہے کہوں گا بے خوف و خطر اس کو | نہیں رُکنے کا میں ہرگز پری ٹوکے کہ جن ٹوکے
انار آئے جو کابل سے تو پڑے سب کے حصہ میں | امیر آئے تو کیا آئے مزے ہیں لارڈ منٹو[4] کے

"منٹو کے" کا قافیہ "جن ٹوکے" لانا بس اکبر ہی کا حصہ تھا۔

---

[1] مازو اور کافور دانت کے امراض کی مشہور دوا ہیں [2] انگلستان کا مشہور سائنسدان - اس کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوع ترقی کرتے کرتے دوسری نوع بنتی گئی ہے۔ یہاں تک کہ حیوانات کا ارتقاء انسان پر ختم ہوا، اور انسان ترقی یافتہ بندروں ہی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے [3] ماہی سقنقور، مردانہ قوت کے لئے ایک مشہور دوا [4] لارڈ منٹو ہندوستان کے وائسرائے - امیر حبیب اللہ خاں مرحوم والیٔ افغانستان انہیں کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے - شاہِ افغانستان اسوقت امیر ہی کہلاتے تھے -

ایک غزل اسی زمین میں ہے "مجلس تو باقی ہے"، "نرگس تو باقی ہے"۔ اس کے مقطع میں قافیہ "پیرس" کا لائے ہیں، اور وہ بھی کس روانی و بے تکلفی کے ساتھ ؎

یہ مصرعہ قافیہ ہی کے لئے ہے خوب اے اکبرؔ | جو اجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں، پیرس تو باقی ہے

اگرچہ اس میں واقعیت پر ظلم اچھا خاصہ ہو گیا ہے۔ لکھنؤ غریب انتہائی اوج شباب کے زمانہ میں بھی بھلا پیرس کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتا تھا! ظریفانہ کلام میں بارہا لفظ پست و مبتذل لاتے، لیکن موقع محل ایسا چھانٹ کر نکالتے، بندش اس خوبی سے کرتے اور مصرعہ اس ٹھاٹھ کا رکھتے کہ پستی و ابتذال غائب، کلام میں بجائے تنافر کے لطف و شگفتگی قائم۔ مذاق سلیم پکار اٹھتا کہ بے شک اس خاص موقع کے لئے یہی لفظ مناسب تھا اور یہی موزوں، ایک شعر چند ہی صفحہ ادھر نقل ہو چکا ہے ؎

شانِ نماز اکبرؔ شاہانہ ہو چلی ہے | مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاقی

"میاں وفاقی" کے لفظ سے بڑھ کر جامع اور بلیغ اس موقع کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے!۔

اقبال کی مشہور نظم "جواب شکوہ" کا وہ مشہور بند تو سب کے ذہن میں ہوگا ؎

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب | زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب | پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب

امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

اکبرؔ نے مضمون کے اس سارے دریا کو اپنے دو مصرعوں میں، بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی مصرع کے کوزہ میں بند کر دکھایا ہے ؎

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے | کونسل میں بہت سیّد، مسجد میں فقط جمّن

"کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمّن" بہت خوب، بہت خوب۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار دلی جانا ہوا۔ زمانہ کوئی ۱۹۱۴ء کا۔ وائسرائے بہادر کلکتہ سے منتقل ہو کر دلی آچکے تھے اور دلی بڑی تیزی کے ساتھ "نئی دلی" بنتی جا رہی تھی۔ اجلاس امپیریل کونسل[1] کا ہو رہا تھا۔ ہندوستان بھر کے چوٹی کے مشاہیر مسلمان ہر ہر صوبہ کے جمع تھے۔ ایک دن محلہ کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے گیا۔ نماز کے وقت پھٹے حالوں ایک مؤذن صاحب نظر آئے، اور انہیں کے طبقہ کے دو ایک نمازی، بس کل اتنی ہی جماعت۔ نماز کے بعد میں نے مؤذن سے پوچھا کہ کیوں میاں، سر ... بھی کبھی نماز پڑھنے تشریف لاتے ہیں؟ مؤذن بے چارے نے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے اور سوال دو ایک اور مشہور لیڈروں کے متعلق کیے۔ کہ اچھا فلاں خان بہادر، فلاں نواب صاحب، فلاں آنریبل بیرسٹر صاحب تو ضرور ہی کبھی آتے ہوں گے وہ غریب ہر مرتبہ ہکا بکا۔ تب میں نے کہا اچھا تو یہ کہو کہ

"کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمّن"

پیش مصرعہ بعد کو لگایا۔

ذکر غالباً ۱۹۱۵ء کا ہے۔ اس خاکسار کو الہ آباد میں حضرتِ اکبر کے مہمان ہونے کا شرف حاصل تھا، اتفاق سے شیعہ کانفرنس کا جلسہ بھی اس زمانہ میں الہ آباد میں ہو رہا تھا۔ ایک روز شب کے کھانے پر حضرت اکبر نے دو ایک صاحبوں کو اور بلایا تھا۔ کھانے کے بعد حضرت اکبر مسلمانوں کی زبوں حالی پر تاسف کر رہے تھے کہ ایک صاحب بول اٹھے کہ کچھ بھی سہی، بہر حال

---

[1] جو قانون ساز مجلس اب ۱۹۳۶ء میں سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کہلاتی ہے، اس وقت اس کا نام امپیریل کونسل تھا۔

شیعوں سے تو ہماری اخلاقی و معاشری حالت بہتر ہی ہے"۔ لسان العصر بولے کہ "جی، کیا بات آپ نے پیدا کر دی ہے، ہم ساری خدائی سے ذلیل سہی، پھر بھی یہ اطمینان کچھ تھوڑا ہے کہ شیعوں کی حالت ہم سے بھی ابتر ہے"، اور جب ہی تو میں نے بھی عرض کیا ہے ؎

ہر چند بے وقار ہیں مرزا کو غم نہیں ۔۔۔ کیا کم ہے یہ شرف کہ وفاقی سے کم نہیں"

"کیا کم ہے یہ شرف" اس ٹکڑے کو مکرر پڑھیے۔

ایک جگہ "صاحب" کے مقابلے میں صاحبیت کے مارے ہوئے گروہ کا چربہ ان الفاظ میں اتارتے ہیں ؎

مسجد میں شیخ صاحب، اگر جا ہیں لاٹ صاحب ۔۔۔ بدھو فلاسفی کے کمرے میں سڑ رہے ہیں

کسی پچھلے کلیات میں مسلمانوں کے یاس انگیز مستقبل کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچ چکے تھے ؎

محکم برٹش کا، ملک ہندو کا ۔۔۔ اب خدا ہی ہے بھائی صلو کا

پھر جب ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں کے ایک مشہور و ممتاز عالم نے تحریک ترک موالات میں بالکل گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنے کا اعلان کیا، تو ارشاد ہوا ؎

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں ۔۔۔ گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر حرفوں سے مرکب لفظ نہیں بولتے، پوری کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

لفظ "بدھو میاں" سے بڑھ کر اور جامع تر ۔۔۔ اس موقع کے لئے اور ہو کیا سکتا تھا!

کلیات اول میں مسلمان خاتون کی تعلیم کا عکس بھی ایسے ہی آئینہ میں دکھا چکے ہیں ؎

ترقی کی تبیں ہم پر چڑھا کیں ۔۔۔ گھٹا کی دولت ایچیچیں بڑھا کیں

رہیں ہر پھر کے آیا، بی نصیبن ۔۔۔ وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

غرض یہ کہ کلو، صلو، پیرو، حسو، بدھو، گنگو، گھورن، جمن، وفاتی، اشراتی، کریمن، نصیبن

وغیرہ کوئی لفظ بھی اکبرؔ کی ٹکسال سے باہر نہیں اور وہ ہر جگہ کام اُن سے اپنی مرضی کا لیتے رہتے ہیں۔ اور خیر یہ تو پھر بھی عَلَم تھے، یعنی مردوں، عورتوں کے ذاتی وشخصی نام، کمال یہ تھا کہ زبان کے عام لفظ مُبتذل طبقہ سے اُٹھا کر لاتے اور اپنے حسن بندش وکمال مرصع سازی سے کرخت بدزیب وبدہیئت سنگ ریزوں کو نگینہ بنا کر خاتم شعر میں جڑ دیتے۔ داغؔ کی ایک مشہور غزل ہے

لُطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اکبرؔ نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے، مطلع ملاحظہ ہو ؂

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ "فالتو" بھی کیا خوب! اکبرؔ کے سوا یہ کس کے بس کی بات تھی کہ دیو میں پری کا حسن وجمال پیدا کر دے! شاعر کے ذہن میں جو تحقیری تصور، ایسی عقل سے متعلق تھا، اُسے کس خوبصورتی سے اس لفظ نے ادا کر دیا!

کلیات دوم میں ایک قطعہ آزادیِ نسواں پر ہے، کوئی صاحب اپنے گھر میں بے پردگی کے خلاف کوئی وعظ شروع کرتے ہیں، لڑکیاں تردید پر آمادہ ہو جاتی ہیں اور سند میں "دولہا بھائی" کی رائے پیش کرتی ہیں ؂

"دولہا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عُمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اس کے آگے یہی لڑکیاں، خاندان کے مردوں سے مخاطب ہو کر لیتی ہیں ؂

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہو ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

"گٹ پٹ"! جی ہاں انگریزی کی ابجد نہیں، اے۔ بی سی ڈی نہیں، صرف گٹ پٹ! حق یہ ہے کہ زبان کا کوئی لفظ بھی بجائے خود نہ مبتذل ہے، نہ خلاف متانت۔ اصل شئے اس کا موقع ومحل استعمال ہے، اور اکبرؔ اس موقع شناسی کے بادشاہ تھے۔

الفاظ سے گذر کر یہی سلوک محاوروں، مثلوں کے ساتھ کرتے رہتے۔ بازار میں چلتے پھرتے کہیں سے یہ محاورہ ہتیا لائے۔ کہیں سے وہ۔ بلاغت کے سانچہ میں ڈھال رنگ روپ ان کھلونوں کو کچھ اس طرح کا دے دیا کہ اب جس کی نظر پڑی، لٹو ہو گیا۔ لڑکوں کا ذکر نہیں۔ اچھے تقہ، بزرگ بوڑھے انہیں کمال صناعی کا نمونہ سمجھ کر اپنی میز پر، ڈرائنگ روم کی کارنسوں پر جگہ دینے لگے۔ فرش کو ان آرائشوں سے سجانے لگے، گلدانوں میں ان پھولوں کو رکھنے لگے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں سے

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج　　اب دُم کی جگہ ملت، نمدے کی جگہ کالج

"ہات تری دُم میں نمدہ" یہ زبان شرفا کی نہیں، عوام کی ہے لیکن اکبر کی کانِ نمک میں آ کر ہر شے نمک ہی بن جاتی ہے۔ اس لطف و لطافت کے ساتھ انہوں نے ادن کو کھپایا کہ بزرگانِ محفل کے چہروں پر شکن پڑنے کے بجائے اور مسکراہٹ آگئی۔ ظرافت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ الفاظ و حروف کی باہمی مناسبتوں کی جانب ذہن بڑی تیزی کے ساتھ منتقل ہوتا، اور پھر ان مناسبتوں کے بل پر تخیل، دلچسپ و پُر لطف نکتے طرح طرح کے پیدا کرتا رہتا، فرماتے ہیں سے

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا　　سر[۱] ہو گئے تو بال[۲] کا بھی شوق ہو گیا

سرحد کے قریب کیمبل پور کے کوئی صاحب منشی الف دین نامی تھے، ان بے چارہ نے ایک مثنوی حقانیت اسلام پر لکھی، اور حضرت اکبر کے پاس ریویو کے لئے ارسال کی۔ پیر ظریف نے دو مختصر مصرعوں میں جامع و مانع ریویو کر دیا، تصنیف و مصنف دونوں پر سے

---

[۱] (SIR) ایک بڑا انگریزی خطاب [۲] (BALL) انگریزی ناچ۔

الف دین نے خوب لکھی کتاب	ملی جس سے "بے دین" کو راہ صواب

پہلے مصرعہ میں "الف" کے لام کو ساکن نہیں کسرہ کے ساتھ پڑھیے۔ دوسرے مصرعہ میں اس "الف" کے مقابلہ میں "ب" پڑھیے۔ سارا کھیل بس "الف بے" کا ہے۔

ذیل کا قطعہ کیا ہے، ایک مستقل گدگدی ہے، بڑے سے بڑے خشک مزاج کے لئے بھی اور بات کچھ نہیں لفظی بھی نہیں، محض لفظی ہیر پھیر ہے

یہ کہتے سنے اِک لالۂ باوقار	کہ عربی حروف اب تو ہیں ہم پہ بار
مگر ہے انہیں سے ہماری نمود	یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا "حرام" اور کہاں کا "حلال"	ہٹے حائے حطی، رہیں "رام لال"

"حرام" اور "حلال" سے حائے حطی ہٹا کر دیکھ لیجیے نہ، وہی "رام" اور "لال" باقی رہ جائیں گے۔

کبھی یہ بھی کرتے کہ کوئی عام و معمولی سا لفظ لے لیتے، اس کے حروف میں قطع و برید کرکے نئے نئے شگوفے معانی و مطالب کے پیدا کر دکھاتے۔ الفاظ وہی جو روز، ہم آپ بولتے، سنتے رہتے ہیں۔ اکبر کی ذہانت بس ان کے اجزا ترکیبی میں الٹ پھیر کر کر، نئے نئے قالب تیار کر دیتی، اور قوت خلاقی ان کاغذی پتلوں میں نازک خیالی، اور معنی طرازی کی روح پھونکتی جاتی۔ ایک آدھ مثال اس صنعت گری کی ابھی اوپر گذر چکی ہے، دو ایک مثالیں وہ بھی بے ساختہ دھاوا کیجئے، زبان قلم پر چلی آرہی ہیں۔ لکھنؤ سے ۱۹۱۰ء میں جب روزنامہ ہمدم پہلے پہل نکلا ہے، جالب مرحوم دہلوی کی ادارت میں اور اس نام کے موجودہ اخبار سے بالکل ہی مختلف۔ تو اس پر ارشاد ہوا ہے

خوب ہے نام اس کا گر ہمدم رہے	"دم" نکلنے پر بھی باقی "ہم" رہے

کیا بے تکلف سجع ہے!

الف، ب، ت کے نام سے واقف تو جاہل تک ہیں، لیکن کسی بڑے عالم نے بھی محض ان ناموں سے تصوف و معرفت کا یہ درس کیوں حاصل کیا ہوگا ؎

الف، ب ت ہی کو پڑھ کر میں سمجھا   الف اللہ کا، اور ماسوا بُت

"ب" اور "ت" کو ملایئے تو بُت، بن جاتا ہے یا نہیں؟ بس تو اکبر کا کہنا یہ ہے کہ الف تو اللہ کا ہو گیا، اور اللہ کے سوا اب جو کچھ ہے وہ بُت ہی بُت ہے اکیا نیا رنگ وحدت الوجود کو دے دیا ہے!

"تعلیم" کا لفظ ہر شخص کی زبان پر ہے۔ علیؓ کا نام بھی عالم و عامی سب جانتے ہیں، اور پڑھے لکھے تو انہیں باب مدینۃ العلم بھی مانتے ہیں۔ اب اکبر کی شاعری اور ساحری یہ ہے کہ ان دو بظاہر بالکل بے تعلق لفظوں کے درمیان رشتہ، اور وہ بھی کیسا گہرا پیدا کر دیتے ہیں! ؎

سمجھاتی ہے مجھے نکتہ یہ میری طبع سلیم   "علیؓ" کی "تم" میں جگہ ہو تو بس وہی تعلیم

ظاہری پہلو تو یہ ہوا کہ لفظ "علی" کو اگر "ت" اور "م" کے حصار کے اندر لے لیا جائے تو لفظ تعلیم بن جاتا ہے۔ معنوی پہلو یہ ہے کہ حُبِ علیؓ کو قلب میں جگہ دینا حقیقی تعلیم ہے۔

سیاسیات کے دائرہ میں خود بلاغت اُن کے اس تراشش و خراش کی بلائیں لیتی ہے۔ سخن سنجی سر دھنتی ہے، معنی طرازی وجد میں آ کر رہتی ہے۔ قطعہ بلاحظہ ہو ؎

"ہ" ہے بند و "م" ہے مسلم یہ دونوں مل گئے "ہم"   سر پہ انگریزی "الف" اس سے ہوئی حالت "اہم"

ہے "الف" ہم سے جُدا، لیکن محافظ اور مُعین   اس کے سایہ میں رہیں "ہ" "م" شامل ہو تو "ہم"

لفظ "اہم" کی کتابت میں دیکھئے نہ حرف "الف" کیسا الگ تھرا، الگ تھلگ، سرکشیدہ نظر آتا ہے۔ بخلاف اس کے "ہ" اور "م" باہم شیر و شکر، ایک دوسرے سے مدغم! "ہ" اور

..م" کے ادغام کی تصویر آج (۱۹۴۳ء میں)، تو شاعرانہ معلوم ہو گی، لیکن ۱۹۰۳ء ۔ ۱۹۰۲ء میں جب شعر کہا گیا ہے، اسوقت یہ نقل تمام تر مطابق اصل تھی۔ باقی انگریزی "الف" کی اہمیت، اس کا اکل کھرا پن، اور اس کا سر پر ہونا، یہ کیفیتیں تو آج بھی جوں کی توں ہی ہیں۔

اِس گلشن کے ایک دوسرے چمن کی سیر ؎

سر تراشا اُن کا۔ کاٹا اِن کا پاؤں — وہ ہوئے ٹھنڈے، گئے یہ بھی پگھل

شیخ کو یخ کر دیا، مومن کو موم — دونوں کی حالت گئی آخر بدل

شیخ کا سر "ش" تراش دیجئے تو بیچارہ یخ ہو کر نہ رہے تو اور کیا کرے؟ مومن کا پیر "ن" کاٹ دیجئے تو بجز "موم" بن جانے کے اور کر ہی کیا سکتا ہے؟ باقی کس نے شیخ اور مومن کو یوں بے سر و پا کر دیا، تو اب کیا ناظرین اتنی سخن فہمی سے بھی گئے گذرے ہوئے!

اکبر کے سنجیدہ کلام کا ذکر تو آگے آئے گا۔ لیکن ظریفانہ شاعری بھی اس پیر ظریف کی معنویت سے خالی نہ ہوتی۔ اُدھر مثالیں بار بار گذر چکیں، کبھی کبھی اتفاقیہ دو چار شعر محض ہنسنے ہنسانے کے لئے بھی کہدیتے، ورنہ عموماً صرف یہ وہ ظرافت کا تھا۔ باقی اصلاً مدنظر، کسی مذہبی۔ اخلاقی یا سیاسی مسئلہ کی تعلیم ہی رہتی تھی۔ وہ بڑا فرق اپنے اور عام شاعروں کے درمیان پاتے۔ کبھی کہتے ؎

میں اپنے آپ میں، ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں — سخن اُن سے سنورتا ہے، سخن سے میں سنورتا ہوں[1]

---

[1] حالی کے بھی ایک قطعہ کا آخری شعر ملاحظہ ہو ؎ حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو
حالی کا خطاب اپنے اُن ہمعصروں سے ہے، جن کے ترکش کا سب سے تیز تیر یہ تھا کہ نہ دہلوی، نہ لکھنوی یہ پانی پتی بھلا شعر اور زبان کیا جانے!

یوں بھی کہا کرتے کہ شاعری سے مقصود تفریح و تفنن نہیں۔ یہ تو ایک آلہ ہے نفس کی تربیت و اصلاح کا۔ اور کہیں یوں ارشاد فرماتے ہے

ہے میری شاعری دلِ آگاہ کے لئے ۔۔۔ تنخواہ کے لئے ہے نہ ہے راہ کے لئے

جو کچھ کہوں وہ ہو فقط اللہ کے لئے ۔۔۔ ہے یہ دعا کہ ترکِ فضولی نصیب ہو

منہ تھک چکا تھا، ورنہ مرا آہ کے لئے ۔۔۔ اک غل مچا کہ اس کو بھی لیسنس ہے ضرور

سنجیدہ بیانی کے باوجود آخری شعر میں ظرافت کے چٹخارے کے بغیر نہ رہ سکے۔

مشہور و پرعظمت شخصیتوں کی مخالفتیں بھی بڑے زور شور کی ہوتی ہیں۔ اکبر کی مخالفت اس درجہ میں تو نہ ہوتی۔ پھر بھی کبھی کبھی تریار لوگ فن عروض و لغت کی کتابیں بغل میں دبا نکلتے ہی رہتے اور کلام اکبر کی طرف انگلیاں اٹھا دبی زبان سے کہتے ہی رہتے کہ یہاں یہ فن کی غلطی ہے۔ وہاں یہ لغزش ہے۔ اکبر بحث و مباحثہ کے قریب بھی نہ جاتے، نہ زبانی نہ تحریری۔ دوسروں کو نصیحت کیا کرتے، کہ کبھی مدعی کے منہ نہ لگنا، اور کسی صاحب دعوٰی سے سوال و جواب میں نہ پڑنا۔ پھر بھی بشر تھے۔ منہ میں زبان رکھتے ہی تھے کبھی کبھی کچھ کہہ ہی اٹھتے۔ جو بول ان کے منہ سے نکل جاتے۔ ظریفانہ ادب میں پتھر پر لکیر بن جاتے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ہے

ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے ۔۔۔ تم سے استادوں ہی میری شاعری بیکار ہے

کہاں بلبل کی قدرتی، بے ساختہ ہم آہنگی، کہاں سارنگی کی مصنوعی رُوں رُوں! خیر یہ تقابل تو ہی ہے، باقی یہ سارنگی کے ضلع میں "استاد" بھی کیا خوب! ایک دوسرے ہی جگہ شوخی کا رنگ ذرا تیز کر دیا ہے ہے

شعر میں کہتا ہوں ہے تجھے نم کرو ۔۔۔ قاعدوں میں حسنِ معنی گم کرو

اب چند شعر بلا کسی تنقید و تبصرہ کے یوں ہی ملاحظہ کر لیجئے۔ باغ کی سیر آزادی و بےفکری

سے، خود بھی تو ایک چیز ہے۔ یہ کیا کہ پھولوں کے نام، نشان، رنگ و بو کی پوچھ پاچھ قدم قدم پر مالی سے ہوتی رہی ہے ؎

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز ۔۔۔ جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

ہمیں کیا بالشویک آ گیا یا روس آتا ہے ۔۔۔ یہاں تو فکر سر آتی ہے ماہ اور پوس آتا ہے

ایرشپ سے ہم امان ملے چرخ پائیں گے کہاں ۔۔۔ آسماں بولا کہ ہم سے اڑ کے جائیں گے کہاں

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندہان ہیں! ۔۔۔ لیکن معائنہ کو وہی نایدان ہیں

ہجر کی شب یونہی کاٹو بھائیو! ۔۔۔ ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے ۔۔۔ جو مارتے تھے مکھی، اب مارتے ہیں چوہے

شاعر جو ملازم ہو اکبر، ذو قافیتین ہے اس کا لقب ۔۔۔ پوچھو گے یہ کیوں، تو فصیح سنو تنخواہ بھی ہے، اور شاہ کی ہے

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی ۔۔۔ ملا کی دوڑ مسجد، اکبر کی دوڑ بھٹی

تھے معزز شخص، لیکن ان کی لاٹ کیا کہوں ۔۔۔ گفتنی در جز گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

ارتقا نے کی برکت دیکھئے! ۔۔۔ تاجر اب اہل قلم ہیں بانس کے

محاورات کو بدلیں "براہ ریل" جناب ۔۔۔ "ٹکٹ بدست" کہیں اب بجائے پا بہ رکاب

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے ۔۔۔ ایک ہیں خفیہ پولیس میں، ایک پھانسی پا گئے

یہ سب زیادہ تر وہی شعر ہیں جو ان کے مطبوعہ کلیات میں موجود ملیں گے، لیکن ظریفانہ کلام کا ایک اچھا بڑا حصہ ایسا بھی ہے، جس کے چھاپنے کے وہ اپنی زندگی میں کسی طرح روادار نہ

؎ جس زمانہ کا یہ شعر ہے، روس میں نیا نیا "بالشویک" انقلاب ہوا تھا، اور بالشویک حملہ کا دھڑکا ہر وقت ہندوستان کو لگا رہتا تھا۔ ؎ (AIR SHIP) ہوائی جہاز

ہوئے۔ شاعر، آخر شاعر، خدا جانے کیسے کیسے وہم انہیں گھیرے رہتے، اور چھاپنا تو الگ رہا ناجنسوں کو سناتے تک بھی نہیں۔ کسی بے تکلف دوست یا نیاز مند کو اگر کہیں سنا بھی دیا۔ تو ساتھ تاکیدیں کہ خبردار! لے میری زندگی میں شائع نہ کر دینا۔ اس مخفی کلام کا بیشتر حصہ تو ایسا ہے کہ حضرت اکبر کی زندگی میں بھی بے تکلف شائع کیا جا سکتا تھا، اور اب دنیائے فانی سے ان کے تعلقات ختم ہو جانے کے بعد تو تھوڑا بہت مضائقہ بھی، اس کی اشاعت میں باقی نہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ کلام بجز ان کے۔۔ صاحبزادہؒ کے اور کسی کے پاس ہے کہاں؟ اور صاحبزادہ صاحب اس خزانہ کے سانپ کی حیثیت رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ دو چار شعر، متفرق طور پر ادھر ادھر سے سنے سنائے یاد رہ گئے۔ وہ آگے حاضر ہیں۔ ہائے اسوقت کیا خبر تھی، کہ چند ہی روز میں یہ گوہر بے بہا ایسے نایاب ہو جائیں گے! اسوقت اس کا احساس ہوتا تو چپ اکر چھپا کر ضد کر کے، منا کر، غرض "زاری سے، زور سے، زر سے"، جس طرح بھی ممکن ہوتا، نقلیں ان منہ سے نکلے ہوئے الہامات کی ضرور ہی حاصل کر لی جائیں!

اکبر بڑے گہرے مذہبی! لیکن تقشف و تنگ خیالی سے بالاتر، عابد، عالم، صوفی تھے، "زاہد خشک" نہ تھے۔ سید احمد خانی تحریکوں کو ملت کے حق میں زہر قاتل سمجھ رہے تھے۔ خود سر سید کی زندگی میں ان کی تحریکوں کو اپنی میٹھی چھری سے کچوکے ہی دیتے رہتے۔ اور کلیات کے ہر حصہ میں تو خوب کھل کھیلے ہیں۔ تاہم ذات سر سید احمد خاں کے مخالف نہ تھے۔ اور ان پر جو فتاوی کفر کی بارش ہو گئی تھی؟ اس کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے، خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمت و مغفرت ہر کلمہ گو کے لئے بے پایاں ہے ہمارے مولوی صاحبان نے خواہ مخواہ اسے اس قدر ضابطوں، قاعدوں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہاں تو نیت کا سوال سب پر مقدم ہے۔ مسلمان گنہگار کے حق میں بالکل مولانا رومؒ کے ہم مسلک و ہم زبان تھے ؎

ما وروں را ننگریم وحال را — ما بروں را ننگریم وقال را
ناظر قلبیم کو خاشع بود — گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

آخر زمانہ کی ایک غزل "دوا ہو یا نہ ہو" ۔ "شفا ہو یا نہ ہو" کی زمین میں ہے، اس میں یہ کہتے ہیں ؎

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے — گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحبان کی تشبیہہ پولیس والوں سے ہی بڑی پر لطف ہے، ایک طرف ان کا احترام بھی فرض شناسی کی داد بھی، دوسری طرف ان کی ضابطہ پرستی پر طعن بھی! خیر یہ شعر تو عمومی پہلو رکھتا ہے ۔ ایک رباعی اپنے مخصوص رنگ میں سید احمد خان اور سید احمد خانیوں ہی کو پیشِ نظر رکھ کر کہی ہے ۔ چوتھے مصرعہ میں شوخی ذرا اپنے حد سے تجاوز کر گئی ہے ۔ یہ طریقہ اکبر کا نہ تھا ہر بزرگ کے نام کا بڑا ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے ۔ پہلے اور تیسرے مصرعہ کے الفاظ پوری طرح حافظہ میں نہیں ممکن ہے کہ فرق ہو گیا ہو ؎

کتا جیسے بے فکر جیفہ دوڑے — یوں دہر پہ نیچری خلیفہ دوڑے
جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت حضرت — لٹھ لے کے امام ابو حنیفہ رح دوڑے

آخر ۱۹۱۰ء تھا، جب لکھنؤ میں رباعی اس زندہ دل زندہ جاوید شاعر نے اپنی زبان مبارک سے سنائی تھی ۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ "دیکھیے میری زندگی میں کہیں چھاپ نہ دیجئے گا ۔ ورنہ مولوی صاحبان جان غضب میں کر دیں گے ۔ میں نے تو جنت کا سماں دکھلایا ہے ۔ یہ لوگ اسی دنیا میں میرے اوپر لٹھ لیے لئے دوڑ پڑیں گے ۔"

۱۹۱۹ء میں جب ٹرکی سے برطانیہ کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور برطانوی مدبرین قسطنطنیہ سے ترکوں کے اخراج کا منصوبہ باندھ چکے تھے ۔ اس وقت اسی قافیہ کے ساتھ پھر ایک رباعی ارشاد ہوئی ۔ فرمایا یہ تھا کہ اسلام کا مذہبی اثر تو مدت ہوئی قلوب سے مٹ چکا ہے، اب نہ کوششوں اور

بنگلوں میں کہیں عبادت کے چرچے ہیں۔ اور مدرسگاہوں میں کہیں دینی تعلیم کا رواج ہے۔
لے دے کے دنیوی اقتدار کی یادگار ایک ترکی سلطنت باقی تھی۔ یہ جھلملاتی شمع بھی زمانہ کی
تیز آندھی کے جھکڑوں سے گل ہو کر رہی! مسلمانوں کے لئے یہ حادثہ قیامت کا حکم رکھتا ہے
مجازاً بھی حقیقتہً بھی۔ مجازاً تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر مصیبت مسلمانانِ عالم کے لئے اور کیا
ہو سکتی ہے کہ ان کا شیرازہ ہی منتشر ہو گیا۔ اور حقیقتہً اس لحاظ سے کہ حدیثِ نبوی کی پیش گوئی
کے مطابق قسطنطنیہ کے اسلامی حکومت کا اٹھ جانا قربِ قیامت کی علامت ہے۔ اب دیکھیے
اس سارے مضمون کو کیا کوزہ میں بند کرتے ہیں ؎

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت کالج سے امام ابو حنیفہ رخصت!

"صاحب" سے سُنی ہے اب قیامت کی خبر قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

مرثیہ کے مضمون کو لطیفہ کی صورت میں پیش کرنا، اکبر ہی کا حصہ تھا، اللہ اکبر!

ایک بار صوبہ کی حکومت علی گڈھ سے ناخوش ہوئی ادھر کا اشارہ پا، اودھ کے
شیعہ رئیسوں نے لکھنؤ میں ایک شیعہ کالج کی طرح ڈالدی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں تعلیم
کے متوالے "روشن خیالوں" کو بھلا کالج سے کیوں اختلاف ہونے لگا۔ انہیں منہ مانگی مراد ملی۔
لیکن شیعوں میں بھی جو ذرا دور اندیش تھے، وہ تاڑ گئے کہ یہ عین ضرب ہے علیگڈھ کی مرکزیت
پر۔ عین اس زمانہ میں حضرت اکبر کا آنا لکھنؤ ہوا۔ ایک نامور شیعہ رئیس کے ہاں کے متوسل
ایک صاحب ملنے آئے۔ چرچے تو ہر جگہ ہی ہو رہے تھے۔ یہاں بھی بات اسی کالج کی چھڑی۔
وہ صاحب بولے "ہمارے سرکار اس لئے تو کالج سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ خواہ مخواہ شیعہ
سُنی کے درمیان ایک اختلاف کی بنیاد پڑ رہی ہے" اکبر تھے بڑے پکے سُنی۔ لیکن انگریزی
تعلیم اور انگریزی کالجوں کے حقیقت شناس کچھ اس سے بھی زائد۔ بولے "جی نہیں،

علی گڈھ والوں کو رشک کیوں ہوگا، وہ تو اور خوش ہوں گے کہ چلئے ہماری تحریک کو اور کامیابی ہوئی اور ہماری ہی ایک شاخ اور پھل کر رہی۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

سید صاحب کو ضد کیوں ہونے لگا کالج ہے یہ کچھ امام باڑا تو نہیں

یہ بھی کیا کوئی مذہبی چیز ہے، کوئی مسجد ہے، امام باڑہ ہے، علیگڈھ والے اس سے کیوں چڑھنے لگے۔ اس سے تو اور خوش ہوں گے کہ عین ان کے مشن کی اعانت ہوئی"۔

کیا نگاہ تھی۔ قومی، ملی، مجلسی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے، ایک ایک جزیہ پر نظر رکھے نظر بھی کیسی، عقابی ہمہ گیر نظر۔ لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاہا[1] کی مصداق۔ مجال کیا کہ ادھر کوئی واقعہ، غیر معمولی نہیں، معمولی سا بھی ہو، اور ادھر وہ پیر ظریف کے رجسٹر میں درج نہ ہو جائے! اور پھر جو تصویر تیار کرتے، اس میں کیسے کیسے بظاہر بے جوڑ واقعات میں جوڑ، اور بے ربط حالات میں ربط پیدا کر دیتے تھے! دلکشی اور دلآویزی تو حصہ تھی اُن کے تخیل کا۔ ذکر شروع ۱۹۰۷ء کا ہے۔ علیگڈھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کی بڑی چہیتی اور سب سے بڑی مرکزی انجمن ہے۔ اس کے کارفرما صاحبزادہ صاحب بڑے زور شور سے ہو رہی تھی کہ وہ انڈیا کونسل کے ممبر ہو کر ولایت تشریف لے گئے ان کے جاتے ہی طوفان دھیما پڑ گیا۔ ایک واقعہ یہ اپنی جگہ پر تھا۔ دوسرا واقعہ عین اسی زمانہ میں پیش آیا کہ لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے۔ مولوی نظام الدین حسن نیوتنوی، ایک اعلےٰ پنشنر عہدہ دار اور فن حساب و ہیئت کے بڑے ماہر۔ انھیں رویت ہلال کے مسئلہ پر طبع آزمائی کی سوجھی، لکھنؤ کے اخبار ہمدم

---

[1] قرآن کی آیت (سورہ کہف) نامۂ اعمال کا ذکر ہے کہ قیامت میں سے دیکھ کر کافر چلا اٹھیں گے کہ ہائے میری کم بختی، یہ کیسا رجسٹر ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی چیز اس نے چھوڑی ہی نہیں۔

میں (وہ ہمدم مرحوم، موجودہ ہمدم سے بالکل مختلف تھا) لکھ دیا کہ علمِ ہیئت کا حساب کافی ہے، ہر مہینہ چاند دیکھ کر تاریخ شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔ علمائے شریعت اس بدعت پر کیسے سکوت اختیار کر سکتے تھے۔ فرنگی محل سے جواب پہ جواب نکلنے شروع ہوئے۔ کچھ لوگ اِدھر سے اُٹھ کھڑے ہوئے، کچھ اُدھر سے۔ اچھا مع اکھاڑہ قائم ہو گیا۔ قلمی اور اخباری اکبر کی ذہانت کب چوک جانے والی تھی۔ دونوں بے تعلق، بے ربط واقعات کو ایک رشتہ میں پرو کر موتیوں کی لڑی تیار کر دی۔ پوری نظم تو اب دہنیں پڑ رہی ہے قطعہ کی جان آخری مصرع تھا ؎

آفتاب احمد گئے تو چاند خاں پیدا ہوئے

کیا کہنا ہے زندہ دِل قوم کا؟ کوئی نہ کوئی پھلجھڑی ہر روز اس کو چاہیئے۔ کل تک قوم کے آفتاب پر گرم گرم نگاہیں پڑتی رہیں۔ اُن بیچارہ کی جان بچی، تو لیجیے رات ہلال پر چاند ماری شروع ہو گئی!

۱۹۲۰ء کا آغاز تھا کہ تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں ایک وفد کا ولایت جانا طے پایا۔ صدرِ وفد ہیرو ملت مولانا محمد علی تھے۔ ایک رُکن مولانا سید سلیمان ندوی (صاحب معارف) بھی قرار پائے۔ اکبر کو یہ بات ذرا کھٹکی، کہ ایک عالمِ دین سیاسیات کا ضمیمہ بنے ہوئے ولایت جا رہے ہیں۔ شاعری کی ساحری اور الفاظ کی نظر بندی ملاحظہ ہو، کہ چیں بہ جبیں ہوئی تیوریوں کو بشرہ کی خندہ جبینی اور لبوں کی مسکراہٹ میں تبدیل کر کے یوں گویا ہوئے ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی!	کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنچے	مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت یہی ہیں!	خدا غیر سے اُن کو کر دے غنی

دل کو شبہ کیا معنی، یقین ہے کہ یہ نظم بس اتنی ہی سی نہ ہوگی، کچھ اور بھی ضرور فرمایا ہوگا، لیکن اپنی زبان مبارک سے سنایا صرف اسی قدر تھا۔ نادرا سہی، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شوخ نگاری کی باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دیتے، اور ظرافت کے حمام میں محلی ا بالطبع ہو کر داخل ہوتے۔ اس وقت متانت اپنا منہ پھیر لیتی اور شائستگی کی آنکھیں نیچی ہو جاتیں۔ ایک ہلکا سا نمونہ اس صنعت کا بھی ملاحظہ ہو۔ یورپ میں جنگ عظیم برپا ہے۔ ترکی غریب پر ہر طرف سے یلغار ہے بتیس ۳۲ دانتوں میں ایک زبان۔ روز یہی دردناک خبریں آرہی ہیں، آج یہ مقام گیا، کل وہ، یہاں تک کہ حریف کا قدم سالونکا تک پہنچ گیا (اس مقام کا نام یاد رہے) سارا عالم اسلامی ہیجان اضطراب میں مبتلا، مرکز خلافت کی مغلوبیت و بے کسی پر دنیائے اسلام کا ایک ایک گھر ماتم کدہ بنا ہوا عین اس وقت حضرت اکبر اپنے بند کمرہ میں یہ چار مصرعے بے تکلف دوستوں کو سناتے ہیں۔ منٹ دو منٹ کے لیے اداس چہروں پر بشاشت دوڑ جاتی ہے اور غمناک آہیں بھرنے والے بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں ملحوظ رکھے دنیا اس رشتہ باہم کو
بھر کر کے اس پہ قبضہ کہدیں یہ ترک ان سے "سالونکا" سے اب تو سالونکا لو ہم کو

نظم شدہ دلی کے ایک ہفتہ وار کو ہاتھ لگ گئی، اور اس نے اپنے یہاں چھاپ بھی دیا۔ حضرت اکبر کو خبر ہوئی، بہت بگڑے، جز بز ہوئے۔ اس خاکسار نے عرض کیا کہ اتنی ناخوشی کیوں؟ جس لفظ کو آپ اتنا کریہہ خیال فرما رہے ہیں، اس میں آپ نے کراہت اور اس کی درشتی حیثیت باقی ہی کب رہنے دی ہے؟ پہلے اور دوسرے مصرعہ میں تو آپ نے خود ہی رشتہ کا اعلان کر کے دنیا کو خوب جتا دیا ہے۔ اب وہ رشتہ کا مستقل نام ہو گیا ہے، اب گالی کہاں باقی رہا؟

سیاسیات

سیاسیات سے براہِ راست حضرت اکبر کو کبھی دلچسپی نہیں رہی، نہ اُن کا یہ فن، نہ اس موضوع سے انہیں کوئی خاص مناسبت، لیکن تھے پورے مشرقی، اور مشرقی سے بھی بڑھ کر پختہ مذہبی - اور دل و دماغ نہایت درجہ حساس، اس لئے مذہب کی توہین اور مشرقیت کی چوٹ پر تڑپ جاتے، اور جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گستاخیاں کرتے دیکھتے تو قدرتاً یہ بات اُن کے دل میں چبھ جاتی، اور مجبوراً خارزارِ سیاست میں قدم رکھ کر کانٹوں کو ایک ایک کر کے چننے۔

عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا، اور آخری حصہ تو خاصے اعلےٰ عہدوں پر۔ اس کے بعد بھی پنشن کے طوق سے گرانبار، اور خطابِ خاں بہادری کی زنجیرِ طلائی سے پابجولاں اس لئے زباں پر آخر وقت تک مصلحت اندیشیوں کی مُہر لگی رہی، اور ناطقہ قلب و دماغ کی پوری ترجمانی نہ کر سکا۔ تاہم ظرافت کا نسخہ ایسا ہاتھ میں موجود تھا کہ جسے جتنی تلخ دوا چاہتے کھلا دیتے اور اوپر شکر کا غلاف اس قدر دبیز رکھتے کہ کھانے والا ادھر حلق سے کڑوی کسیلی گولیاں اُتارتا اور اُدھر زبان ہے کہ فرطِ حلاوت و شیرینی سے ہونٹ چاٹتی رہتی ۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت و تحریک ترک موالات دونوں کا ہیجان اپنے پورے شباب پر تھا، وفات سے چند ماہ، بلکہ شاید چند ہفتہ ہی قبل ایک پورا رسالہ گاندھی نامہ کے نام سے کہہ ڈالا اس میں خلافت و ترک موالات کی تحریکوں کے تمام پہلوؤں کے متعلق ہر فریق کے خیالات کی ترجمانی کی ہے افسوس ہے کہ ایسی پُر لطف نظم نہ مرحوم کے زمانہ میں شائع ہوئی، نہ اب اس کے بعد ہی، جب شاعر اور خود ان تحریکات کو بھی ختم ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا ہے اور اب اس نظم میں ظاہر ہے کہ کوئی زندہ لطف بھی باقی نہیں رہ سکتا زندہ لطف تو جبھی تک رہتا ہے جب تک وہ شخصیتیں جیتی جاگتی رہتی ہیں وہاں تاریخی لطف البتہ

بالکل دوسری چیز ہے ۔ وفات سے چند ہفتہ قبل، جب آخری بار الہ آباد میں حاضرِ خدمت ہوا، دل چند شعر زبانِ مبارک سے سُننے میں آئے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان میں سے کوئی بھی یاد نہیں نقل لینے کی اجازت تو اس وقت کیا ملتی ؟ خود میری ہمت اجازت مانگنے کی نہ پڑی، کلیات سوم میں سیاسی اشارے کنائے، رمز، تلمیحیں ایک دو جگہ نہیں پچاسوں سیکڑوں جگہ ملیں گی، کہیں کہیں ایسا ہے کہ کوئی مخصوص مسئلہ نہیں بیان کیا ہے بلکہ ملک کی عام سیاسی فضا کی مصوری کی ہے ایسے موقعوں پر اکثر قالب غزل کا اختیار کیا ہے چنانچہ جب نظر بندیوں کی گرم بازاری تھی اور محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام سب نظر بند ہو چکے تھے۔ ذیل کی بلیغ و پُر معنی غزل ارشاد ہوئی ہے

زباں ہے ناتوانی سے اگر بند	مرے دل پر نہیں معنی کے در بند
ہماری بے کسی کب تک چھپے گی !	خدا پر تو نہیں راہِ خبر بند !
بیا در کنج یارانِ نظر بند	کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
دلوں میں درد ہی کی کچھ کمی ہے	نہیں ہے آہ پر راہِ اثر بند
مَت مشرق نہیں محتاج ساماں	کمر ہی جب نہیں، کیسا کمر بند !
کہوں گا مرثیہ اس غم میں ایسا	کھلے معنی دکھائے جس کا ہر بند
خیالِ چشمِ فتّاں میں ہوا محو	مرا دل اب ہے سینہ میں نظر بند

لیکن اظہارِ خیال کی یہ صورت بس خالی ہی خالی ہے، عام دستور یہ ہے کہ یا تو سیاسی فلاح وترقی کی کوئی خاص اصل بیان تحریر کرتے ہیں یا اسبابِ تنزل میں کسی متعین سبب کی جانب رہنمائی کرتے ہیں ۔ یا موجودہ صورتِ حال سے مستقبل کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اور یا پھر حریف کے کسی زبردست دار کو رد کرتے ہیں۔ تحریری سیاسیات کا عالم جیسا کچھ دشوار گذار ہے۔ سب کو معلوم ہے ۔ بڑے بڑے محتاط مسافروں اور بڑے بڑے ہوشیار سیاحوں نے جب اس وادی میں قدم رکھا ہے، تو اپنے تئیں زخموں سے چُور اور جراحتوں سے فگار ہی پایا ہے۔ لیکن اس پیمبرِ سخن کا

اعجاز یہ تھا کہ اس کے قدم رکھتے ہی یہ خارزار بھی چمنستان بن گیا۔ سفر کی خستگی تفریح میں تبدیل ہو گئی اور کانٹوں کی چبھن کی جگہ پھولوں کی مہک نے لے لی۔

اعتراض بہت پرانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی اشاعت بزور شمشیر کی۔ ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری شمشیر کی تو یہ دھوم دھام ہے۔ لیکن اب توپ پر بھی کبھی نظر کی ہے؟ ہم نے بالفرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی تو مذہب ہی کی تو کی، توحید و رسالت ہی کے لئے تو کی۔ گردنیں اس لئے ماریں کہ دوزخ کے دائمی عذاب سے بچائیں، جنت کی دائمی راہ دکھائیں۔ مے فروشی، سود خواری، بے حجابی، حرامکاری، زرپرستی، زن پرستی کی اشاعت کے لئے تو نہیں کی۔ توپ دم قوموں کی قوموں کو، قبیلوں کے قبیلوں کو اس لئے تو نہیں کر دیا کہ قبضہ ان کے گھروں پر، ان کی جائیدادوں پر، ان کی دولت پر کر لیا اور ان کی جانوں کو، اولادوں کو اپنی غلامی میں لیں! سارے مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام یہ نہ ارشاد ہوا، توپ سے کیا پھیلا ہے

کمزور و ناتواں قوموں کی قوت مقاومت توڑنے، اور ان کے جسموں کو ہلاک کرنے کے لئے تو، توپ گولہ، بندوق، مشین گن، استعمال ہوتی ہیں، پھر جہاں تسلط ہوا اور قدم جما، انہیں بدبختوں کے دلوں اور دماغوں اور روحوں کو غلامی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اسکول اور کالج اور خدا جانے اور کیسی کیسی تعلیمگاہیں کھول دی جاتی ہیں۔ غرض کمزور اقوام کے مقابلہ میں، صاحب کی جنگ و صلح دونوں کا مقصد ایک سا ہوتا ہے یعنی ان کی روحوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے۔ اس خشک حقیقت کو کس تر زبانی سے بیان کرتے ہیں ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

ہماری تہذیب و ترقی، ہماری اصلاح و فلاح، ہماری تعلیم و تربیت کا نام لے کر جس قدر بھی کارگزاریاں ہمارے یہ "خداوند" کرتے رہتے ہیں، ہمارے لئے درسگاہیں کھولتے ہیں عدالتیں قائم کرتے ہیں معیشت میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں، ان سب کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم کو اپنے میں جذب کریں ؂

وہ اس کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑیں گے　　اس اونٹ کو خرِ عیسےٰ بنا کے چھوڑیں گے

کریں گے شوق سے مسلم، غذا میں تو داخل　　شراب کو بھی ہرلیا بنا کے چھوڑیں گے

کہا یہ شیخ نے اکبرؔ سے روک اپنی زباں　　کہ تجھ کو بھی وہ جھی سا بنا کے چھوڑیں گے

"اونٹ" اور "خرِ عیسےٰ" اکبر کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ہیں "مسلمان" اور "صاحب" کے لئے۔ "اونٹ اور گائے" کا ذکر بھی بڑی کثرت سے آتا ہے، مسلمان اور ہندو کے لئے خرِ عیسےٰ کے بجائے کہیں کہیں "جان بل" بھی استعمال کیا ہے اور کہیں "بندر" بھی۔

اکبرؔ کے عقیدے میں سیاسی ترقی کا اصل اصول حصولِ قوت تھا، اگر آج ہم اپنے حاکموں سے مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے میں قوت بھی ان کے مساوی پیدا کریں، سیاسیات نام ہے توازنِ قوت کا، جو قوم جس قدر قوی ہوگی، اسی قدر دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہوگی طاقتور قوم کسی کی محتاج نہیں رہ سکتی، اور کمزور کو ہمیشہ غلامی سہتے رہنا پڑے گا۔ تحصیلِ قوت کی باربار تعلیم دیتے ہیں، مثلاً ؂

مذہب سوسائٹی ہے اور دینِ آخرت ہے　　پولٹیکل جو پوچھو طاقت ہے اور سکت ہے

صحیح طریقہ عمل صرف یہ ہے کہ قوت حاصل کی جائے۔ نہ یہ کہ شکوہ و شکایات یا خوشامد و تملق میں وقت ضائع کیا جائے ؂

نہایت قابلیت سے مجھے ثابت کیا مردہ　　مناسب داد دینا ہے مجھے یارب کہ رونا ہے

مدا آئی مناسب نہ ہے کہ جیسنا اپنا ثابت کر   خوشامد یا شکایت دونوں ہی ہیں وقت کھونا ہے

سیاسیات کی دنیا میں محض زبان بننا لاحاصل ہے۔ یہاں ہاتھ بن کر رہنا چاہیئے ؎

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ   ہاتھ بھی دے خدا زباں کے ساتھ

ترک[۱] ہوں خواہ عرب، اسلام کے اقتدارِ دنیوی کے محافظ وہی ہو سکتے ہیں، جن کی تلوار میں دم موجود ہے ؎

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ   کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زورِ بازو ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی نہیں حاصل، اور وہ بھی کونسلوں وغیرہ ہی کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں، تاہم کم از کم اس محدود دائرہ کے اندر تو وہ اپنی قوت بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں ؎

گو رہتے ہیں میری فانی پر، شاد   لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر، شاد

کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی   غافل ہیں مکرمی بھوانی پرشاد

جب تک قوت ہاتھ میں نہیں، زبانی چیخ و پکار، شور و غل، تقریر و محض طرازی سب بیکار ہے۔ پلیٹوں کی جھنکار عمر بھر سنتے رہیئے۔ مگر کیا اتنے سے بھوک کی تسکین ہو جائے گی؟

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب   پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

اس وقت صرف مسلمان ہی ایسے ہیں جو تذبذب، کشمکش و دو عملی میں مبتلا ہیں۔ باقی قومیں یا تو حکمران قوت میں جذب ہو گئی ہیں، اور یا اپنے میں قوت پیدا کر رہی ہیں۔ اس حقیقت کو کس

۱؎ ترک اس وقت تک محافظ اسلام سمجھے جاتے تھے "خادم الحرمین الشریفین" ترکی سلطان (خلیفۃ المسلمین) کا خاص لقب ہوا کرتا تھا۔

اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں ؎

شیخ صاحب تو اِدھر ذکرِ مساوات میں ہیں　　بھائی صاحب کو سُنا ہے کہ حوالات میں ہیں[۱]

قوم کے حق میں تو اُلجھن کے سوا کچھ بھی نہیں　　صرف آنر کے مزے اُن کی ملاقات میں ہیں

سر بسجدہ ہے کوئی، اور کوئی تیغ بکف　　اک ہمیں اس رزولیوشن کے خرافات میں ہیں

کونسلوں میں جانا بجائے خود ضعیفی و کمزوری کی دلیل ہے، اس اعزاز پر قناعت وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کا مادۂ خودداری پہلے سے رخصت ہو چکا ہے ؎

کونسل میں سوال کرنے لگے　　قومی طاقت نے جب جواب دیا

اس سوال و جواب کا پورا لطف جب ہے، جب یہ یاد رہے کہ "سوال کرنا" اُردو محاورہ میں خیرات مانگنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

اس وقت تو حالت یہ ہے کہ جس شے کو ہم اپنی ترقی سمجھ رہے ہیں، وہ سب اُنہیں کی ترقی ہے۔ ہم خوش ہوئے کہ ہم نے اپنی آپ نئی یونیورسٹی نکالی وہ مسکرائے کہ غلامی و محکومی کا ایک نیا سانچہ تیار ہو گیا۔ ہم تالیاں بجا رہے ہیں کہ اب تو گورنری تک ہمیں ملنے لگی، صیّاد اندر ہی اندر ہنس رہا ہے کہ نادان چڑیا کیسی جلد اپنی اسیری پر راضی اور مطمئن ہو گئی بس اتنا ہی ہوا نہ کہ پنجرہ کی تیلیاں لوہے کی جگہ سونے کی دینی پڑیں! اس صورتِ حال کی تصویریں، کتنی مؤثر اور سچی، اکبر کے مرقع میں ملے گی ؎

اُنہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زباں میری ہے بات اُن کی

اُنہیں کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی

فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے اُنہیں کا مطلب نکل رہا ہے

اُنہیں کا مضمون اُنہیں کا کاغذ، قلم اُنہیں کا، دوات اُن کی!

---

[۱] حضرت اکبر نے یہ اشعار ۱۹۱۳ء میں حادثۂ مسجد کانپور کے بعد ہی موزوں کیے تھے۔ اور خود ایک گرامی نامہ میں بھی تحریر فرماتے تھے، کلیات سوم میں پہلا شعر کسی قدر مختلف ہو کر چھپا ہے۔ یعنی پہلے مصرع میں "بھائی صاحب" ہے اور دوسرے میں "شیخ صاحب"۔ بہت فرق ہے جو نسخہ میں درج کی گئی اور جو مکتوب اکبر کے موافق ہے۔

بُت کدہ میں ہماری عزت کیا خاک ہو سکتی ہے، جب سب کو یہ معلوم ہے کہ جو قشقہ ہماری پیشانی پر ہے، وہ بھی ہمارا اپنا نہیں، غیروں کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ ہماری بے دست و پائی کا نشان اور کلنک کا ٹیکا ۔۔۔ سید احمد خانی سیاست، وفاداری کی مسلمہ پالیسی جو ملت پر کہنا چاہیئے کہ کوئی ۴۰ سال تک مسلط رہی۔ یہ تمام تر اسی کی تفسیر و تفصیل بیان ہو رہی ہے ؂

عزتِ اکبرؔ نہ مثلِ برہمن در دیر بود!

قشقہ بر دوش بر جبیں، لیکن ز دستِ غیر بود

اپنی اس بے بسی، بے کسی، بے دست و پائی پر ایک اور تشبیہ سنیئے۔ نئی اور لطیف، پھڑکتی ہوئی چُھبتی ہوئی۔ اُسے کمند ڈال کر گرفتہ میں لانا حصّہ تھا اکبرؔ ہی کی ظرافت کا، ذہانت کا ؂

بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں

ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

گویا گوری قوموں کو تو کُھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں جس خطہ میں جس وطن سے بھی چاہیں، قابض ہو جائیں، حکومت قائم کرلیں، ہر طرح اُن کی حوصلہ افزائی ہی کی جائے گی کہ حکمرانی و جہانبانی تو فطری حق صاحب بہادروں کا ہے۔ لیکن کوئی شرقی قوم، خصوصاً مسلمان، اگر کہیں ذرا بھی سنبھلنا چاہیں، اپنے پیروں اُٹھ کر کھڑے ہونے لگیں، تو انہیں روکیے، تھامیئے، ماریئے پیٹیئے، نوچئے پھاڑیئے۔ بلگریا، سرویا، روماتیہ، یونان، اگر بڑھیں، ترقی کریں، تو یران کا حق ہی ہے، اُنہیں خوب بڑھاوے پر بڑھاوے ملتے رہیں، لیکن اگر ترک و عرب، ایرانی و افغانی، محض اپنی کمر بھی کسنا چاہیں، تو فرنگستان کا گوشہ گوشہ بہ چیخ اُٹھے، کہ لو، وہ پین اسلامزم کا ہوا نکل آیا۔ اب مسیحی سلطنتوں کی خیر نہیں"۔ حالات و واقعات کی اس رفتار سے واقف تو

اب تو بچہ بچہ بھی ہو چکا ہے۔ لسان العصر بھی، اس حقیقت کو اپنی زبان میں دہراتے چلے ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ ہاتھ میں ظرافت کے کھلونے لئے ہوئے ہیں، انہیں زور زور سے اچھالتے جاتے ہیں، اور زیرِ لب مرثیہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ نظریں کھلونوں پر سب کی جمی ہوئی ہیں اور زیرِ لب آواز ہے کہ کسی کے کان میں آتی ہے اور کسی کے نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

سرافرازی ہو تو اونٹوں کی تو گردن کاٹیے ان کی
اگر "بندر" کی بن آئے تو فیضِ ارتقا۔ کہیئے

کہا جاتا ہے، کہلایا جاتا ہے، کہ عہدِ حاضر کی برکتیں دیکھو خدا کی رحمتوں کی طرح شمار و حساب سے باہر، اسکول ہیں، کالج ہیں، ریل ہے، تار ہے، اسپتال ہیں، امن و امان ہے وغیرہا ۔۔۔ عندلیبِ گلشنِ حقیقت جواب دیتا ہے کہ یہ ساری "برکتیں" برکتیں مان بھی لی جائیں جب بھی بُلبُل تو مادرزاد اپنی قوتِ پرواز کا ہے، اُسے صیّاد کا سجا سجایا، رنگین پُر تکلف قفس درکار نہیں ؎

کہا صیّاد نے بُلبُل سے، کیا تو نے نہیں دیکھا
کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے
کہا اُس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر بندی
نشاطِ طبع کی مہلک، مگر بیکاریِ پر ہے

مسلمانوں کے لئے یہی قہرِ الٰہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی صداقت، اپنا اخلاص، اپنے ایمان کی پختگی کھو چکا تھا، ستم یہ ہوا کہ رہنما کا جامہ پہنے ہوئے "آپ" مل گئے۔ اونٹ راستہ تو بھول ہی چکا تھا، لیکن شاید کہ بھٹکتے بھٹکتے منزلِ مقصود تک کبھی پہنچ ہی جاتا۔ لیکن اب اس کا کیا علاج کہ زمین پر لٹکتی ہوئی نکیل بندر کے ہاتھ آ گئی اور وہ اُچک کر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اب خدا ہی کا ہے جو کبھی بھی اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکے! زبانی خاطرداریوں میں لفظی واہ واہ میں اب بھی

کی نہیں، لیکن یہ مجال کس کی جو مساوات کا کلمہ کفر زبان پر لاسکے ؎

گم کی تھی میں نے راہ، مصیبت یہی تھی سخت ۔۔۔ اس پر ہوا یہ قہر، تم ایسے خضر ملے

باتیں بھی مجھ سے کیں، مری خاطر بھی کی بہت ۔۔۔ لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے

کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگذشت ۔۔۔ دو چار برگ خشک تو دو چار پر ملے

سرکار کا ادنیٰ سا گوشۂ چشم بھی ہمارے لئے طرۂ افتخار "صاحب" کا ادنیٰ سا التفات بھی ہمارے لئے موجب ناز۔ فرنگیت سے شرمانا کیسا، وہ تو اُلٹی ہمارے خون میں رچ گئی ہے، رُوح میں بس گئی ہے ؎

ان کو لبکٹ کے لئے سوجی کی کفیلی مل گئی

کیمپ میں غل مچ گیا، مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

بیمار ہم پڑیں، تو علاج سرکاری شفاخانوں میں کرائیں بچے پیدا ہوں تو تعلیم سرکار کے جاری کئے ہوئے مدرسوں میں پائیں۔ کورس سرکار کا تیار کرایا ہوا پڑھیں۔ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو دروازہ سرکاری عدالتوں کا کھٹکھٹائیں، مدد سرکاری پولیس کی لائیں جاہ و نام کی طلب دل میں پیدا ہو تو خطاب و اعزاز سرکار کے دربار سے حاصل کریں۔ پیٹ خالی ہو، بھوک لگے، تو روٹی کا سوال وہی سرکاری محکموں سے حل کریں۔ غرض سرکار دولت مدار کا دامن عاطفت جو آغوش مادر سے بھی بڑھ کر وسیع ہو گیا ہے، اور ہمیں ہماری زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہماری مرکزیت سے، ہماری خودی سے دُور کر جا رہا ہے۔ آخر اس صورتِ حال کا اثر ملّت کی سیرت پر کیا پڑے گا اور کیا پڑ رہا ہے؟ یہ سوال کم شد زبانوں پر ہے، جواب آئیے اکبر کے جام جہاں نما میں دیکھیں ؎

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج ۔۔۔ بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا اُمید

ہر گام پر، جو طاعتِ حق سے الگ پڑا ۔۔۔ ہوتے رہوگے مرکزِ قومی سے تم بعید

ال انتشار و جہل کی تکمیل ہو گی جب ہو جاؤ گے بتانِ کلیسا کے تم مرید
شاید کہ مدعا بھی تمہارا ہے بس یہی ہر چند ابھی ہے درس کے پردہ میں ناپدید
حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا حافظ کا ایک شعر، جو معنی کو تھا مفید
"سرِ ازل کہ عارفِ سالک بکس نہ گفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید"

"صاحب" کو اس دیس میں اپنے پرستارانِ وفا کے ساتھ جس درجہ اور جس نوعیت کا تعلق ہے، اور ظاہری خاطرداری کے عقب میں خلوص اور قدر کتنی رہتی ہے۔ اس کی توضیح و تشریح سے خشک نثر میں اخبارات کے کالم روز ہی لبریز رہتے ہیں۔ اکبر کی قادر الکلامی نے اس سارے دفتر کو بس ایک مصرعہ میں سمیٹ لیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں دریا کو کوزہ میں بند کرنا۔ مثل بولی بہت دفعہ جاتی ہے، صحیح تر مثال اس کی مشکل ہی سے ملے گی ؎

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظِ طریقت دنیا کے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو انگریز کو ہے ہندو سے جس قدر تعلق

سینکڑوں پُر جوش اخباری مضامین، سینکڑوں شعلہ بار سیاسی تقریریں، ان چار مصرعوں کی بلاغت جامعیت، نکتہ وری پہ قربان ہیں!

بیرونیوں اور پردیسیوں کی کفش برداری سے اپنوں کی غلامی، چاہے وہ اپنے کوئی بھی ہوں، بہر حال و بصورت بہتر ہے، اس خیال کو ذرا دیکھئے کس مزے سے ادا کیا ہے ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم، پوری ہو یا چپاتی

"دیس" کے معنی وطن کے تو ظاہر ہی ہیں، باقی دیس ایک راگنی کا بھی نام ہے۔ گانا، دھن، دیس، اب سب اکٹھے ہو گئے۔ بسکٹ کا اشارہ صاحب کے میز کی طرف، پوری کا ہندو کی رسوئی کی

رف، اور چپاتی کا مسلمان کے بادرچیخانہ کی طرف بالکل کھلا ہوا ہے۔

ہندیوں کی باہمی ناچاقی، ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ "صاحب" بھی اس رمز سے خوب آگاہ ہیں، جب کبھی اس آگ کو سرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو کبھی ہندوؤں ذبح گاؤ کا شغلہ چھوڑ دیا کبھی ہندی زبان اور دیوناگری حروف کا قضیہ لے بیٹھے۔ مسجد کے آگے باجہ کا سوال چھیڑ دیا، اور اب تو نہیں، لیکن کچھ روز قبل تک ایک بڑا ہوا "حملۂ افغانستان" کا ہوا کر پیش کر دیا۔ اکبر کی نگاہِ دور رس نے تاڑ لیا کہ اہم ترین مسئلہ زبان کا ہے۔ زبان کے معاملہ میں جب تک سارا ملک رواداری برتنے کے لئے تیار نہ ہو گا، اتحاد وطنی کی گتھی کسی طرح نہ سلجھے گی۔ اپنے ہم وطنوں کی سادہ مزاجی و کم فہمی و نادانی پر تاسف و حسرت کے آنسو بہاتے ہیں ؎

کہتا ہے مجھ کو جو کچھ سننے گا اس صدی میں ۔۔۔ پوچھا کہ اس صدی میں کیوں چپ رہو گے جی میں
بولے کہ یہ صدی ہے اس بحث اور بیاں میں ۔۔۔ کہتا ہے جو، کہیں ہم وہ کون سی زباں میں
سُنکر یہ بات اُن سے ہر اک کو آیا چکر ۔۔۔ اک صاحب بصیرت چلتے ہوئے یہ کہہ کر
پیر فلک نہ کیونکر ہو اب بحث کھوسے ۔۔۔ جیتے رہیں گرو جی، زندہ رہیں یہ بھوسلے

غیر ملکی حکومت کی بدگمانیاں اور سخت گیریاں، خدا کی پناہ! بات بات پر شبہ، بے بات کی بات پر گرفت۔ خود غزلیہ اور عاشقانہ شاعری کے اندر بھی غدر، بغاوت، و قانون شکنی کے جرائم سرکاری خوردبین میں عیاں۔ اس دار و گیر کی لطیف و شاعرانہ تصویر، شاعر کے نگارخانہ میں ملاحظہ ہو ؎

اک غزل میں اتفاقاً میرا اک مصرع یہ تھا ۔۔۔ "دیدۂ عبرت سے رنگِ دہرِ فانی دیکھئے"
کوئی بول اٹھا، زوالِ حسنِ بت مقصود ہے ۔۔۔ اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھئے
عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے ۔۔۔ بزمِ دنیا میں یہ زورِ بدگمانی دیکھئے

اکبر کی آپ بیتی بھی اس سلسلہ میں سننے کے قابل ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی جنگ عظیم شروع ہوئی ہے۔ تو یاد ہوگا کہ بالکل ابتداء میں اعلان جنگ صرف آسٹریا اور سرویا کے درمیان ہوا تھا۔ برطانیہ اس وقت تک الگ تھا۔ اکبر نے معاً ایک نظم کہی، ایک مصرعہ یہ تھا ؎

بحمد اللہ اب خونِ شہیدان رنگ لایا ہے

مسجد کانپور کے سلسلہ میں گولی چلنے اور مسلمانوں کے شہید ہونے کا واقعہ تازہ تھا۔ "خونِ شہیدان" کی تلمیح اس جانب سمجھی گئی اور شاعر صاحب دھر لئے گئے۔ اکبر صاحب بھی نرے شاعر تھے اکر کی دار و گیر کے مردِ میدان تو تھے نہیں ساعلان کر دیا کہ بہت اچھا، آئندہ شعر گوئی ہی سے توبہ، نہ معلوم کس وقت کیا نکل جائے، اور آپ کیا گرفت کر بیٹھیں۔ لیکن رندِ قدح خوار کی طرح شاعر کی توبہ ہی کیا، اور کے دن کی! توبہ کیجئے! خیر کچھ دن ظاہر کی تو احتیاط رہی بھی۔ لیکن تخلیہ کی مجلسوں میں، قاضی و محتسب کی دسترس سے دور، شغل اسوقت بھی جاری ہی رہا، ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

سینے اِدھر ایسے کہ سہیں جورِ ترنل بھی
کان اُن کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

حکم اکبر کو ملا ہے کہ لکھو اشعار   خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

جنگ یورپ کی تلمیحوں سے اس دور کی غزلیں یکسر خالی نہیں۔ نئی نئی تشبیہیں میدان جنگ سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

یہ بت دل میں گھسے آتے ہیں جرمن کا ستم بن کر
میرا تقویٰ کہاں تک اُن کو روکے بلجیم[1] بن کر

---

[1] پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا حملہ اتحادیوں پر بلجیم کے رستہ سے ہوا تھا، اور بلجیم بیچارہ پہلی ہی زد میں گر گیا تھا

یہ کونسلیں، یہ اسمبلیاں، یہ ووٹ بازیاں، اور الکشن جنگیاں، یہ علامتیں ہیں ہماری ترقی اور آزادی کی! یا مزید حلقے ہیں زنجیر غلامی کے، اور ہمارے حق میں مزید پھندے؟ اکبر کے ہاں یہ تعلیم بار بار اور وضاحت کے ساتھ ملتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا — اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ — اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی — سیلف گورنمنٹ کے آگے آئی
پاؤں کا ہوش، اب فکر نہ سر کی — ووٹ کی دُھن میں بن گئے پھرکی

ایک دوسری جگہ ان کی دُور اندیشی، قوم کی غفلت و کوتاہ بینی کی مرثیہ سرائی یوں کر رہی ہے تاسف اور دلسوزی کا رنگ اب اور گہرا ہے ؎

ہاون تو ہے ہوس کا، دستہ ہے پالسی کا — لیکن اِدھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اسیر مسرور ہو رہے ہیں — ہر سو اُچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں
اس قبلہ و جماعت کا انتشار دیکھو — اس باغ میں خزاں کی اکبر، بہار دیکھو
لکھے گا کلکِ حسرت، دنیا کی ہسٹری میں — اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

ایک اور مقام جنکی شاعرانہ دُور بینی اور حقیقت سنجی، اس ظاہر فریب اور اوپر سے خوشنما منظر کو یوں بے نقاب کر رہی ہے ؎

نیٹو ہے نمود کا محتاج — کونسل تو اُن کی جن کا ہے راج
کہتے جاتے ہیں یا الٰہی! — سوشل حالت کی ہے تباہی
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں — اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
دراصل نہ دیں ہے نہ دنیا — پنجرہ میں پھدک رہی ہے مینا

اسکیم کا جھولنا وہ جھولیں ! لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں

مئی و جون کی گرم گرم لو، اور تپش میں باہر نکلنا ہر ایک کا کام نہیں۔ قاضی و محتسب کی دھڑ پکڑ کی گرما گرمی دیکھ شاعر غریب کو اپنی خیریت تو اسی میں نظر آتی ہے۔ کہ زبان بند رکھی جائے اور بات کرنے کے لئے انتظار کسی مناسب موسم کا رہے۔ بے فصل اگر بیج ڈال دیا جائے، تو پودا ہرگز نہ اُگے گا۔ کہتا ہے کہ جس طرح ایک وقت گفتگو کا ہوتا ہے، اُسی طرح ایک موقع سکوت و بے تعلقی کا بھی ہوتا ہے، اور آج وہی موقع ہے ؎

گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصہ لیکن کس سے کہیئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو

داستانِ غم دل کون کہے، کون سُنے بزم میں موقع اظہار خیالات تو ہو

عدم نشو و نما سے نہ کہو تخم کو بد وقت بالیدگی تخم و نباتات تو ہو

تینوں شعر سوز و درد کی تصویر ہیں، اور انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو لیے ہوئے۔

پھر کہتا ہے کہ ؎

زمانہ نے مساعدت کی، تو کبھی ہماری بھی زبان کھُلے گی۔
ورنہ یہ سکوت، سکوتِ اجل سے ہم آغوش ہو رہے گا

ہم اس زمانہ میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے
ہوا ہی بدلی ہوئی ہے، ملک سے کون لڑے
خدا ہم کو اٹھائے گا جب تو اُٹھیں گے
ابھی تو چپ ہیں، کوئی لاکھ اعتراض جڑے
اگر اُٹھے تو عَلَم اپنا گاڑ لیں گے کہیں
جو اُٹھ گئے تو ہے قصہ ہی ختم، خود ہی گڑے

حق پرستوں کے لئے کھلے ہوئے راستے تو دو ہی ہیں، یا سیدھے سیدھے اس دارِ فانی سے رخصت ہو جائیں، اور یا صبر کے تلخ گھونٹ حلق سے اتارتے رہیں ؂

حق پرستی کا نشاں اب قبر ہے یا صبر ہے
اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط ایک جبر ہے

فرماتے ہیں کہ مومن کے لئے فضا یکسر تاریک، ماحول تمام تر ناساز گار۔ ہر ہوا جو چلتی ہے ناموافق۔ اہلِ ایمان کے لئے اس عالم یاس و حسرت میں بھی بھروسہ صرف رحمتِ باری کا، تاریک خانہ میں بھی ایک شعاع امید ؂

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھپک، جب منہ میں زباں جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیونکر جینا ہو، اللہ ہی اپنا فضل کرے
کیا ناز ہو ایسی ساعت پر، افسوس ہے ایسی حالت پر
یا جھوٹ کہے، یا کچھ نہ کہے، یا کفر کرے یا کچھ نہ کرے
قائل کو بھروسہ قوت کا، اور ہم کو خدا کی رحمت کا
ہونا تھا جو کچھ وہ ہو ہی لیا، وہ بھی نہ ڈرے گا ہم بھی نہ ڈرے

"صاحب" کا ساتھ دیجئے تو دین رخصت، بے نیازی اختیار کیجئے تو دنیا رخصت ؂

بے گزٹ ہو کے جو چلیے تو محلّے میں حقیر   باگزٹ ہو کے جو رہیئے تو فرشتوں میں خفیف

"گزٹ" کے لفظ سے بھی اکبر نے خوب کام نکالے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بے سرکاری خلق کے، بغیر سرکاری اعزاز کے، وہ گر رہیئے تو دنیا میں کون بات پوچھے گا؟ مادی تعلق، منصب و اعزاز کو ذہن میں رکھیئے تو پھر دین سے ہاتھ دھو رکھیئے۔۔

اور تو اور، آپ اپنے کو محض مسلمان کہنا اور کہلانا بھی تو مشکل ہو گیا ہے۔ ادھر آپ

نے اعلان اپنے اسلام کا کیا، ادھر روشن خیالی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور آپ مضحکہ کے ہدف بنکر رہے رہسلمان کہلانے ہی پر اگر آپ کو اصرار ہے تو چارہ بجز اس کے نہیں کہ اپنے کو تجدد کا ستم رسیدہ، صاحب زدہ مسلمان کہلاتے ہے

جو پوچھا مجھ سے ڈورجیم نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا راز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ "گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے، خانساماں ہے

لیکن اس ساری پستی وادبار کے اسباب اکبر کی تشخیص میں خارجی نہیں داخلی ہیں، جن مصائب کے ہم شکار ہو رہے ہیں، یہ خود ہمارے ہی ہاتھوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا، اغیار ہم پر دلیر ہو گئے۔ ہم نے اپنے ملی طور طریقوں کو خیرباد کہا۔ اغیار ہم کو نگلنے لگے۔ ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی تقلید ونقالی شروع کی، بیگانوں نے دیکھتے دیکھتے ہم کو زیر کر دیا۔ جھاڑو جب تک بندھی ہوئی ہے۔ تیز سے تیز آندھی میں بھی محفوظ ہے، ادھر اس کا مٹھا کھلا، ادھر اس کی ایک ایک سینک ہوا کے ہر معمولی جھونکے کے رحم وکرم پر رہ گئی۔ قوم کا شیرازہ قائم رکھنے والی شے تو صرف قوم وملت میں خودی وخودداری کا احساس ہے۔ اقبال کی شاعری کا تو خاص موضوع ہی یہی ہے۔ لیکن اس کی جھلکیاں اکبر کے یہاں بھی موجود ہیں۔ سنا تے ہیں۔

طریق حکمت وتزئین ہر ایک رنگ میں ہے نہ یہ سمجھ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے

نگاہِ غور کرو سوئے ٹرکی و ایران
نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویران!
تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گماں آئے
تمہارے جسم میں کیوں دوسرے کی جاں آئے
جو تو نے بھائیوں کا اپنے ساتھ چھوڑ دیا
تو دستگیر نے تیرا بھی ہاتھ چھوڑ دیا
جو بات ٹھیک ہے، کہتا ہوں میں اسے کھل کر
کہ سلطنت نہ سہی، تم رہو تو مل جل کر

لیکن آج جو بڑے بڑے اقبالمند نظر آتے ہیں۔ اُن کی بھی اقبال مندیاں، خوش بختیاں، کامرانیاں کب تک، کے دن کے لئے؟ ایک دن احتساب کا اعلان کے لئے بھی آنے والا ہے، جہانِ فانی کو فانی سمجھنے والا مشرقی شاعر اس انجام کی خبر کبھی کبھی دن بدمستوں کے کان تک پہنچا دیتا ہے۔

مجبور بدلنے جانے پہ یہاں اقبال و حشم کے دور بھی ہیں
یکتائی کا دعویٰ خوب نہیں، اللہ کے بندے اور بھی ہیں

کہیں یہ فقیر ہندوستان غفلت کے فقروں لیراں کے سامنے آکر صدائے عبرت بلند کرتا ہے ؎

حرج کیا وقعت نہیں میری جو بزمِ غیر میں
غیرتِ مسلم ہے اس کی کس مپرسی دیر میں
تار برقی سے ہوا معلوم حالِ زارِ روس[1]
شور برپا ہے کلیسا میں حرم میں دیر میں
آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد
لیکن آجاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

---

[1] اشارہ ہے ۱۹۱۷ء کے عظیم الشان انقلاب روس کی جانب۔ زار شاہی کا خاتمہ آناً فاناً ہو گیا۔ زارِ روس اپنے وقت کا سب سے بڑا فرعونِ باسامان، اگلے جباروں کی زندہ یادگار تھا۔

اور کہیں اپنوں اور بیگانوں دونوں کو حدودِ انسانیت کے اندر رہنے کی موعظت و تلقین کرتا ہے ؎

تم مِلو یا نہ مِلو مجھ سے، منو یا نہ منو ساتھ رہنا ہے اس مُلک میں اے ہم وطنو

اہلِ مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد آسمان تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

ذیل کا شعر اس وقت کا ہے جب پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر صُلح نامہ مُرتب ہو رہا تھا، اور اس کا خاص اہتمام تھا کہ اب کی یورپ کی تنظیم جدید کی جو بنا تیار ہو، اس کا دامن بھی ترکوں کے وجود کی نجاست سے پاک رہے ؎

کورانہ ترنگیں قوت کی کچھ فائدہ اُن کو دیں گی نہیں
نقشوں میں لکیریں کھینچنے سے فطرت کی حدیں بدلیں گی نہیں۔

واہ واہ واہ، دُوسرا مصرعہ تو اپنی بلاغت، ایجاز و جامعیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ زبان میں ایک مستقل ضرب المثل کی حیثیت حاصل کرے۔

آج جنہیں اپنی طاقت و توانائی پر غرّہ ہے، کیا انہوں نے کبھی خیال نہیں کیا، کہ شمع نے دم بھر میں سینکڑوں پروانوں کی جانیں لے ڈالیں، لیکن خود وہ صرِ صرِ فنا کے ایک طمانچہ کے سامنے مقابلے کو نہ تھی۔ ہاتھی نے ایک قدم اُٹھاتے ہی صدہا چیونٹیوں کو کچل ڈالا، لیکن قضائے الٰہی کے پیلتن کی ہلکی سی ٹکر کے سامنے تو وہ تُودہ خاک تھا۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو، زبردستوں نے زیردستوں کو، سرمایہ داروں نے ناداروں کو تختۂ مشق ہمیشہ ہی بنائے رکھا ہے، لیکن انجام بھی ہمیشہ ہی کیا ہوتا رہا ہے؟ اس کا جواب مصر کے فرعونوں کی لاشیں، رومہ کے قیصروں کی ہڈیاں، بابل کے کھنڈر اسیریا کے ویرانے، مذبوح و مقتول زارِ روس کے جسم کی تڑپ، اور زندہ درگور قیصرِ جرمنی کے دل کی حسرتیں دیں گی۔ اکبر کا مرقعِ سیاست یہ تصویر بھی رکھتا ہے ؎

ع
شک اِس میں کیا ہے کہ ساری دُنیا ہے آج اُن کی رَفل کی زد پر
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ، جبل کی زد پر

سُنتِ الٰہی ایک یہ رکھی گئی ہے کہ سفینۂ ظلم و جور چشم زدن میں غرق ہو کر ضرور رہتا ہے۔ لیکن شروع میں نہیں، قہر و انتقام کی لہریں چاروں طرف سے لپکتی صرف اسوقت ہیں جب پہلے خوب مُہلت مِل چکتی ہے اور تمرد و رعونت، خود فراموشی و خدا فراموشی کی کشتی حد سے زیادہ ہی بھاری ہو چکی ہے۔ اکبر کی ذہانت اس اٹل حقیقت سے یہ مضمون پیدا کرتی ہے کہ دامانِ مشرق کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ عجلت کیوں کر رہا ہے، جب تک اس طغیان و تمرد کی کشتی پوری طرح گرانبار نہ ہو چکے گی، غضبِ الٰہی جوش میں نہ آئے گا۔ گویا اس مشغلہ میں دیر تک مصروف رہنا، آنے والے یوم احتساب کو ٹالتے رہنا ہے ؎

یورپ کو پالسی میں عجلت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

اس تمام سیاسی کشمکش و بین الاقوامی آویزش سے جو بربادیاں اور ہلاکتیں پیدا ہونے والی ہیں اُن سے تو اب کسی کو بھی انکار نہیں، البتہ سوال یہ ہے کہ آخری فتح کس کے ہاتھ رہے گی ؟ صاحبؑ اور صاحب زدوں کا کہنا یہ ہے کہ آخری جیت، ہمت و حوصلہ مندی، باقاعدگی و خوش نظمی "علم" و روشن خیالی" تہذیب و شائستگی کا رہنا یقینی ہے۔ اکبر کا فیصلہ یہ ہے کہ مشیتِ الٰہی تائید اسی فریق کی کرے گی جو نیکو کار ہے اور حسن عمل کے حصار میں پناہ گزیں ہے۔ اور استادی کا کمال یہ ہے کہ اس وعظِ خشک میں بھی زندہ دِلی کی ادائیں بھر دی ہیں ؎

شامت آئی ہے یہ مُسَلّم ہے بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی ؟
میری جانب اشارہ غالب ہے لیعنی اکثر یہ کہتے ہیں اُس کی

خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو! کھل ہی جائے گا، آئی ہے جس کی
اس قدر تو مجھے بھی کھٹکا ہے بڑھ گئی ہے بہت مری وہکی

اہلِ ملک کے لئے اس صورتِ حال کا آخر علاج کیا ہے؟ جتنی زبانیں، اتنی راتیں، اکبر کی تشخیص اور طریقِ علاج سب سے مختلف ہے، وہ کہتے ہیں کہ پرندہ جال میں کیوں پھنسا؟ کس نے اُسے مجبور کیا؟ کسی نے بھی نہیں، بجز خود اس کی ہوس و طمع کے، اکبر بے نیازی، بے طمعی، بے غرضی کا آئیڈیل (مطمحِ نظر) پیش کرتے سیاسیات کے ساتھ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تصوف کی تعلیم دیتے جاتے ہیں ؎

ہو مجھ پہ بتوں کی چشمِ کرم دل کو یہ طلب اصلا نہ رہی
مجھ کو بھی خدا نے غیرت دی، آن کر جو مری پروا نہ رہی
دنیا کا تردد جب تک تھا، جب تک کہ ہم اس کے طالب تھے
پھیری جو نظر غم ہو گئے کم، رغبت نہ رہی، دنیا نہ رہی
سچ پوچھئے تو راحت ہی ملی دنیا سے جدا ہو جانے میں
تھوڑی سی اداسی ہے بھی تو آفت تو مگر برپا نہ رہی

"تحریکِ ترکِ موالات" جو ان کے زمانہ میں چلی۔ اکبر اُس کے متفق ضرور تھے، پھر بھی تحریک کے علم برداروں میں بڑی خامیاں پاتے تھے۔ کہتے تھے، یہ بھی کوئی جنگ ہے، کہ روٹی نہ ملی، نوکری نہ ملی، تو حکومت سے بگڑ بیٹھے، اور رُوٹھ کر جھنجھلاہٹیں لگے غصہ اسی پر اُتارنے، مولوی ہوں یا گریجویٹ، جھنجھلاہٹ وہی الگ ہے ؎

نئی روشنی کا ہو اشتعال کم حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے نہ آفس میں تھے، اور نہ کرسی میں تھے

یہ ٹھہری کہ آپس میں ملجائیے | سیاسی کمیٹی میں پل جائیے!!
اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور | خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور؟

حضرت اکبر نے شخصاً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کی سیاسی مجلسوں سے الگ رکھا، ان کا مطمح نظر وطن کے بجائے عاقبت، ملک کے بجائے حقانیت، اور قوم کے بجائے خدا تھا، اس لئے جن مجلسوں میں سب کی زبانیں چلتیں، وہ خاموش رہتے، اور اس خاموشی کی تعلیم دوسروں کو بھی دیتے ہیں ؎

آزادی کا شور مبارک | یہ تقلیدی زور مبارک
میرا تو ہے اور ہی منظر | میں تو یہ کہتا ہوں اکبر
عارف کو ہے بے ہوشی زیبا | عاقل کو خاموشی زیبا

اُن کے خیال میں سیاسی، ملکی، ملّی، اجتماعی، ہر مرض کی دوا ایک ہی تھی۔ طاعت، عبادت، عبدیت مومن کے لئے ابتلا و آزمائش کا وقت آنا لازمی ہے، مومن وہی ہے جو اس آزمائش میں پورا اُترے، اور انتہائے کرب و اضطراب میں بھی نظر شافیٔ مطلق پر رکھے، اس مضمون کو لے کر پوری ایک غزل کہہ ڈالی ؎

مسجد میں خدا خدا کئے جاؤ | مایوس نہ ہو دُعا کئے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں | مرتے مرتے ادا کئے جاؤ
کتنا ہی ہو وقت بے حجابی | تم پیروی حیا کئے جاؤ
امید شفا خدا سے رکھو | کیوں ترک کرو، دوا کئے جاؤ

غلامی و محکومی کا راز صرف یہ بتاتے ہیں کہ ہم نے بدی کو نیکی پر ترجیح دے رکھی ہے سلطنت و حکمت تو مادی حیثیت سے خلافت و نیابت الٰہی ہے۔ آج ہم اپنے ایمان کو زندہ اور اخلاق کو درست کرلیں تو مادی غلبہ بھی حاصل کرلیں ؎

قوتِ ایمان سے کچھ سب کو سمجھاتی ہے

نیکیاں کثرت سے ہوں، مغلوبیت جاتی ہے

اس حقیقت کا مشاہدہ، تاسف و حسرت کی نظروں سے کرتے رہتے کہ نام وطنیت و قومیت کا لے لے کر ساری دنیا، کیا مشرق اور کیا مغرب محض مادی غرض سندیوں کے لئے ایک دوسرے سے مصروفِ کارزار ہے۔ خوفِ خدا، حق پرستی کا وجود روز بروز عنقا ہوتا جاتا ہے۔ اور اس لئے دنیا میں ہر روز ایک نئی تکلیف کا اضافہ ہو رہا ہے ؎

دینِ خدا ہے حق کی تسلی کے واسطے　　دنیا اٹھی ہے اپنی تعلّی کے واسطے

عارف جو ہیں، رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ　　اللہ ہی ہے اُن کی تسلی کے واسطے

سلطنتوں کا عروج و زوال، زمانہ کی معمولی دھوپ چھاؤں ہے۔ آج اس قوم کا طبلِ اقبال بج رہا ہے۔ دولت کا تاج آج ایک قوم کے سر پر ہے، کل دوسری کے، یہ مد و جزر زمانہ کے سمندر میں ہر وقت، اور ہر آن لگا رہتا ہے، ترک اگر اس وقت حکومت سے بے دخل کئے جا رہے ہیں تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ ماتم انگیز حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صبر و عزم، غیرت و خودداری، صدق و ثبات ہم سے رخصت ہو رہا ہے، اور ہم روز بروز بجائے توفیقِ الٰہی اور قوتِ ذاتی پر اعتماد کرنے کے

لہ جس عہد کے کلام پر یہ گفتگو چل رہی ہے، ترک اس وقت دنیا میں اسلامی اقتدار کے سب سے بڑے اور زبردست نمائندے تھے، سلطان المعظم اس وقت تک خلیفۃ المسلمین تھے، اور خادم الحرمین الشریفین۔ ترکوں کو جنگِ عظیم اول میں جو شکست ہوئی (۱۹۱۸ء میں) یہ محض ایک سلطنت یا جغرافی اقلیم کی شکست نہ تھی۔ عالمِ اسلامی اسے اپنی شکست اور اپنے اوپر ضربِ کاری سمجھا، ہندوستان میں جو عظیم الشان و بے نظیر تحریک، تحریکِ خلافت کے نام سے قائم ہوئی، وہ اسی احساس کا نتیجہ تھی۔

دوسروں کے محتاج و دستِ نگر ہو جاتے ہیں، حسرتؔ ہماری اس قلبِ ماہیت پر نوحہ کرتی۔ اور عبرت آنسو بہاتی ہے ؎

انتظامی بات ہے یہ، ہوتی رہتی ہے یونہی — اس کا کیا شکوہ جو ہم پر اس کو غالب کر دیا
ہاں یہ ہے افسوس، ہم سے چھن گیا صبر و قرار — طالبِ حق کو فلک نے اس کا طالب کر دیا

اس وقت دنیا صرف "صاحب" ہی پر تھوڑے ہی مسلط ہے، ہماری ساری جد و جہد کا مرکز بھی تو دنیا اور محض دنیا رہ گئی ہے۔ اس سے آگے کی دوربینی رخصت، فلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم سے سررشتۂ صبر بہر حال نہ چھوٹنے پائے ؎

ارماں بہ قدرِ طاقت ہر سو نکل رہے ہیں — "صاحب" تو ار رہے ہیں اور ہم اچھل رہے ہیں
غصہ میں ہیں ہم ان پر، وہ ہم پہ ہنس رہے ہیں — دامِ فریبِ دنیا میں دونوں پھنس رہے ہیں
دونوں کو چاہیئے یہ طاقت سے منہ نہ موڑیں — وہ اپنا جبر چھوڑیں، ہم صبر کو نہ چھوڑیں

تحریکِ ترکِ موالات کو درجۂ قبول صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب اس ضابطہ کی پہلی دفعہ کلمۂ عبودیت ہوتی یہ کہ اس کی بنا خود بینی پر ہو کر یہ توعین ابلیسیت[1] ہوتی ؎

---

[1] جولائی ۱۹۲۱ء میں الٰہ آباد میں نیاز حاصل ہوا (آہ کہ وہی آخری ملاقات تھی) میرے اوپر نشہ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کا سوار تھا۔ مہاتما گاندھی کی روحانیت اور تقدس کی تعظیم و احترام میں سرشار تھا۔ بات بات پر انکی بزرگی اور حیثیت کا حوالہ، دل میں اس کی آرزو کہ حضرت اکبرؔ پر بھی یہ جادو چل جائے، دو چار منٹ تو صبر کیا، اس کے بعد ایک بار گی پوچھ بیٹھے، "اچھا صاحب آپ تو گاندھی جی کی روحانیت کے بڑے قائل ہیں اپنی اس کمیٹی میں داخلہ کی پہلی شرط انہوں نے لا الٰہ الا اللہ تو ضرور ہی رکھی ہوگی؟" ——— میں ساری چوکڑی بھول گیا۔ مری ہوئی آواز سے جواب دیا کہ "جی نہیں، ایسا تو نہیں" بولے "بس تو مجھے بھی آگے کچھ پوچھنا نہیں، ایک سیاسی انجمن ہے، جیسی اور بہت سی انجمنیں آج کل ہیں"۔

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم

کہ دل کو طاعت حق سے یہ دور کرتے ہیں

نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز

ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

یہ تو سنجیدہ گفتگو تھی، ورنہ جب ہنسنے ہنسانے پر آتے ہیں تو تحریک ترک موالات سے الگ رہنے کی وجہ کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں، اس کی حیثیت "خانگی" اتنی ہے کہ کسی نامحرم کی زبان سے ادا ہونے کے لائق نہیں، بہتر ہو گا کہ اسے خود انہیں کی زبان سے سنیئے:

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا :

اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یہ شعر سنا کر بولے کہ "یہ بھی آپ سمجھے، میں نے اپنے کو مدخولۂ گورنمنٹ کیوں کہا؟ پنشن پاتا ہوں نا؟ ملازمت میں ہوتا، تنخواہ پاتا ہوتا، تو مدخولہ نہیں منکوحہ کہتا"

(ج) عشق و تغزل

اکبر کی شہرت عام، غزل گو کی حیثیت سے نہیں، تاہم کلیات اول و دوم میں ان کی متعدد غزلیں خاصی سے اچھی موجود ہیں، ایسی کہ انہیں بلا تامل استادانِ غزل اردو کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے۔ کلیات اول کا سالِ طبع ۱۹۰۶ء ہے، اس میں حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دور قائم کئے ہیں۔ سلسلۂ بیان کے لئے ان میں سے ہر دور کے نمونہ کلام پر ایک سرسری نظر کرتے چلیے۔

پہلا دور تا ۱۸۶۶ء اکبر کا سالِ ولادت ۱۸۴۶ء ہے۔ گویا یہ دوران کی شاعری کے بچپن کا تھا۔ شاعر کا سن بیس سال کے اندر تھا۔ یہ سن بھی کوئی سن ہے۔ اپنے اور اپنی

شاعری دونوں کے اس لڑکپن میں، وہ عام غزل گویوں کے بالکل ہم نوا ہیں، تاہم برجستگی، شوخی روانیِ طبع و لطفِ زبان کے جوہر جو آگے چل کر اس آب و تاب سے چمکے، اُس وقت بھی مخفی وغیر نمایاں نہیں، اور رعایت لفظی، لکھنؤ کے رنگ کی بھی خاصی موجود ہے۔ اشعار ذیل کے پڑھتے وقت یہ خوب یاد رہے کہ زمانہ ۱۸۶۶ء اور اس سے قبل کا ہے، اودھ میں انگریزی نئی نئی قائم ہوئی ہے۔ نوابی کو گئے ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں، اودھ و مضافات اودھ میں زندگی کے ہر شعبہ میں، خصوصاً شعر و ادب میں پرانے لکھنؤ کی خو بو پوری طرح باقی ہے بلکہ وہی مذاق ابھی تک حاکم ہے ؎

بے تکلف بوسۂ زلفِ چلیپا لیجیے — نقدِ دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا لیجیے
دل تو پہلے لے چکے، اب جان کے خواہاں ہیں آپ — اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجیے
پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیر زنداں میں رہو — وحشتِ دل کا ہے ایما، راہِ صحرا لیجیے

سنتا ہوں چمن میں جو تیری زمزمہ سنجی — "یاد آتی ہے بلبل، مجھے تقریر کسی کی"

دوسرا مصرعہ غالباً طرحی ہے۔

پھر گئی آپ کی دو دن کی طبیعت کیسی — یہ وفا کیسی تھی صاحب، یہ مروت کیسی
کوچۂ یار میں جاتا تو نظارہ کرتا — قیس آوارہ ہے جنگل میں، یہ وحشت کیسی

جذبۂ دل نے میرے تاثیر دکھلائی تو ہے
گھنگھروؤں کی جانب در، کچھ صدا آئی تو ہے

عشق کے اظہار میں ہر چند رسوائی تو ہے

پر کروں کیا، اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے

آپ کے سر کی قسم، میرے سوا کوئی نہیں

بے تکلف آیئے، کمرہ میں تنہائی تو ہے

دوسرا دور ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۴ء - رندی و ہوسناکی کے مضامین اس دور میں بھی باقی ہیں، تاہم جذبات نگاری کی بنیاد پڑ چکی ہے، رنگِ تغزل کہیں زیادہ نکھر گیا ہے اور لطفِ زبان و حسن بیان کے جوہر چمک اٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

آج آرائشِ گیسوئے دوتا ہوتی ہے — پھر مری جان گرفتارِ بلا ہوتی ہے

شوقِ پابوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز — گھاس جو اگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے

پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں — سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

جس نے دیکھی ہو وہ چتون، کوئی اس سے پوچھے — جان کیونکر ہدفِ تیرِ قضا ہوتی ہے

ہوں فریبِ ستمِ یار کا قائل اکبرؔ — مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

اسی زمین میں ایک مشہور و مقبول غزل مرزا لکھنوی کی ہے۔ اکبر کی غزل اس کے ٹکر کی ہے۔

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا — آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا، تو صورت کا اثر کیا — بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

ہیں نزع میں ہم، آئیں تو احسان ہے ان کا — لیکن وہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

دوسرے شعر میں اکبر کی معنویت پوری طرح علوہ گر ہے، اور چوتھا شعر تو گویا اب ضرب المثل کی حیثیت

اختیار کر چکا ہے۔

یار نے کچھ خبر نہ لی، دل نے جگر نے کیا کیا
نالۂ شب سے کیا ہوا، آہ سحر نے کیا کیا
کھل گیا سب پہ حالِ دل، ہنستے ہیں دوست برملا
ضبط کیا نہ رازِ عشق، دیدۂ تر نے کیا کیا

دورِ سوم۔ ۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۸ء، اس دور کا کلام، رنگِ تغزل میں پختگی کا نمونہ ہے
طرزِ ادا میں سنجیدگی بڑھ گئی ہے۔ مضمون آفرینی پر توجہ زیادہ ہو گئی ہے۔ غزل میں اخلاقی و
روحانی مضامین کی آمد بے تکلفانہ شروع ہو گئی ہے۔ ظرافت کا چٹخارہ بھی جا بجا موجود ہونے لگا
ہے۔ پھر بھی تغزل کا جو رنگ مسلم و مستند اور ثقہ استادوں کے درمیان متعارف ہے اُس سے
مجال نہیں کوئی مصرعہ الگ جا پڑے۔ ملاحظہ ہو۔

دِل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس — ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اِک اِک سے سوا ہیں اکبر — مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

دِل مرا اُن پہ جو آیا تو قضا بھی آئی — درد کے ساتھ ہی ساتھ اُس کی دوا بھی آئی
آئے کھوئے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا — میں بھلا آیا ترے گھر، مری بلا بھی آئی

وائے قسمت کہ مرے کفر کی قسمت پلٹی   بت کو دیکھا تو مجھے یادِ خدا بھی آئی
ہو تیں آغازِ جوانی میں لگا ہیں نیچی   نشۂ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

غنچۂ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا   میں مریضِ ہوش تھا، مستی نے اچھا کر دیا
شانِ محبوبیِ صانع کا نشاں رکھا ہے یہ   ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا
کیا مرے اِک دل کو خوش کرنے پہ وہ قادر نہیں   ایک کُن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا
سب کے سب باہر ہوئے، ہوش و خرد، وہم و تمیز   خانۂ دل میں تم آئے، ہم نے پردہ کر دیا
شاہدِ بزمِ ازل نے اک نگاہِ ناز سے   عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا
شورِ شیریں کا مزہ رکھا اشرِ فرہاد میں   قیس کو دیوانۂ انداز لیلےٰ کر دیا
گردنِ پروانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع   رنگِ گل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا

جس نے یہ سب کچھ کیا اکبرؔ میں تم سے کیا کہوں
اُس نے مجھ کو کیا کیا، دل کو مرے کیا کر دیا

وہ حجاب اُن کا آج تک نہ گیا   نہ گیا اُن کے دل سے تنک نہ گیا
اِک جھلک اُن کی دیکھ لی تھی کبھی   وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا   اچھا ہوا مزا تو محبت کا مل گیا!
ایسے ستم کئے کہ مرا قلب ہل گیا   اور اس طرح کہ سینہ کا ہر داغ چھل گیا
تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا   بلبل کو وجد آ گیا، غنچہ بھی کھل گیا

خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہے کروں جو ناز
اپنے ہی دل میں مجھکو مرا رب بھی مل گیا

اُلجھا نہ میرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مدد دل نے سرے طول امل سے

اُن کی نگہِ مست ہے لبریز معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

اور اک نے آنکھیں شبِ اوہام میں کھولیں
واقف نہ ہوا روشنیِ صبح ازل سے

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسنِ عمل سے[1]

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ
ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

درجہ متحیّر کا ہے ، بے خود سے فروتر
ہے روح کی اُمید ترقی کی اجل سے

بحث کہن و نو ، میں سمجھتا نہیں اکبر
جو ذرہ ہے موجود ہے وہ روز ازل سے

یہ تین دور تو خود حضرت اکبر کے قائم کئے ہوئے تھے ، کلیات اوّل کے زمانہ تک - اب اس کے بعد دور چہارم - ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک سمجھیئے - یہ کوئی مستقل دور نہیں ، اسے دور سوم کا تکملہ ہی سمجھنا

---

[1] یہ غزل حضرت اکبر نے لکھنؤ میں ایک مشاعرہ میں پڑھی لکھنؤ کے ایک مشہور وکیل منشی اطہر علی کاکوروی مرحوم ، ایک صاحب علم و صاحب دل بزرگ بھی مشاعرہ میں موجود تھے - اکبر نے خود یہ روایت مجھ سے بیان فرمائی کہ "جب اس شعر پہ پہنچا ، ابھی پہلا ہی مصرعہ زباں سے نکلا - کہ آنکھیں منشی صاحب سے چار ہو گئیں - منشی صاحب کے تیور پر بل تھے ، کہ قرآن اور خدا سے یہ شوخی کیا معنی - میں تاڑ گیا - برجستہ عرض کیا کہ مصرعہ ملاحظہ ہو - اور پھر دوسرا مصرعہ پڑھا ، تو منشی صاحب پھڑک اٹھے ، بے اختیار مجھے گلے لگا لیا "

چاہیئے ۔ دورِ سوم تک کا کلام، کلیاتِ اوّل میں موجود ہے، اس کے بعد کے چار سال کا کلام کلیاتِ دوم میں ہے البس اسی لئے اس حصّے کے لئے ایک جداگانہ دور قائم کرنا پڑا۔ ۱۹۰۸ء تک غزل میں جتنی پختگی آنا تھی، سب آ چکی تھی، شاعر کی عمر اب ۶۰ - ۶۲ سال کی ہو چکی تھی، اور شمار اب استادوں میں تھا اس کے بعد صنفِ غزل میں کسی جدت کی نہ توقع تھی اور نہ کوئی جدت واقع ہوئی۔ کیفیت وہی قائم رہی، البتہ کمیت کے لحاظ سے یہ فرق ہوا، کہ کلیاتِ اوّل میں بڑا حصّہ غزلوں ہی کا ہے، کلیاتِ دوم میں اوّل تو یہ تناسب ہی گھٹ گیا ہے، اور پھر جتنا حصّہ غزلیات کا ہے بھی، اس میں بھی معاملاتِ صرف عشق و محبت ہی کے بندھے ہوئے نہیں، بلکہ مضمون، اخلاق، معاشرت، فلسفہ، ریاست تصوف و معرفت سب ہی کے شامل۔ با ایں ہمہ اس دور کا عاشقانہ حصّہ بھی کسی معیار سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ لطف و کیفیت ہر ہر سطر سے نمایاں۔ پختگی اور شگفتگی کے ثبوت ہر ہر صفحہ پر۔ مضمون آفرینی اور استادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پھوٹا پڑتا ہے۔ طبیعت کی آمد، جدت مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی ندرت کی بہار دکھانے لگی ہے ؎

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا ۔۔۔ اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا
اس نے خدا کو مانا، وہ ہو رہا بتوں کا ۔۔۔ یا اس نے خوب سمجھا، یا اس نے خوب دیکھا

نہ یہ رنگِ طبع ہوتا، نہ یہ دل میں جوش ہوتا ۔۔۔ یہ جنوں اگر نہ ہوتا، تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غمِ دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا ۔۔۔ مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا
تمہیں دیکھ حسن کے فطرت نے یہ نقش کھینچے ورنہ ۔۔۔ نہ یہ ہوتی چشمِ نرگس، نہ یہ گل کا گوش ہوتا
دل و دیں سب اس کے صدقے، جو وہ خود نما بنا ہے ۔۔۔ کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فروش ہوتا
حسن نظامی، اکبر کا کلام سن کے بولے ۔۔۔ تجھے میں ولی سمجھتا جو نہ خرقہ پوش ہوتا

بتوں سے میل، خدا پر نظر، یہ خوب کہی — شب گناہ و نماز سحر، یہ خوب کہی
تمہاری خاطرِ نازک کا ہے خیال فقط — وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر، یہ خوب کہی
شباب و بادہ و فکرِ مآل کار چہ خوش — جنونِ عشق و خیالِ خطر، یہ خوب کہی
سوالِ وصل کروں یا طلب ہو بوسہ کی — وہ کہتے ہیں مری ہر بات پر، یہ خوب کہی

آہ دل ہی جو نکالی جائے گی! — کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
یاد اُن کی ہے بہت عزلت پسند — آہ بھی دل سے نکالی جائے گی
نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جاں — حشر کہتا ہے منالی جائے گی
یادِ ابرو میں ہے اکبرؔ محو کیوں — کب تری یہ کج خیالی جائے گی

ایک صوتِ سرمدی ہے جس کا آشنا ہوش ہے
ورنہ ہر ذرّہ ازل سے تا ابد خاموش ہے
آئینہ سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس
شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحب آغوش ہے
حضرتِ منصور کہتے ہیں "انا" بھی حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں، جب آشنا ہوش ہے
(یہ تیسرا شعر منصور حلاج کی پُرشور و معرکۃ الآرا بحث میں قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے
دوسرا مصرعہ پڑھتے وقت "تکلیف شرعی" کی اصطلاح یاد رہے)
شوقِ وصل شعلہ رُویاں، کیوں نہ ہو برسات میں — ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے!

رنگِ شراب سے نیت مری بدل گئی
واعظ کی بات رہ گئی، ساقی کی چل گئی

تیار تھا نماز پہ ہیں سن کے ذکرِ حور
جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمہ پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

چمکا ترا جمال جو محفل میں وقتِ شام
پروانہ بے قرار ہوا شمع جل گئی

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

دورِ پنجم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء۔ اس دور کا کلام کلیاتِ سوم میں ہے اور وہی اس تبصرہ کا اصل موضوع ہے۔ شاعر کی عمر اب ستر کے لگ بھگ یا ستر سے اوپر ہے۔ اور اب وہ شاعر سے کہیں زیادہ مفکر ہے۔ دل شاہد و شراب چنگ و رباب کے تذکروں سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ آگ معرفت اور عشق حقیقی کی بھڑک چکی ہے۔ رواجی، مجازی، تغزل کا رنگ ہلکا پڑ چکا ہے۔ غزل کہنا بھی اس زمانہ میں بہت کم ہو گیا تھا، عموماً سیاسی اخلاقی، عارفانہ و ظریفانہ نظمیں کہا کرتے تھے۔ عنوان غزلیات کا کلیاتِ سوم میں بھی خاصہ بڑا نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت، غزلیت کا عنصر ان میں بہت ہی کم ہے۔ عموماً وہ واقعات حاضرہ پر شاعر کے خیالات اور تبصرے ہیں۔ صرف غزل کے سانچے میں انہیں موزوں کر دیا گیا ہے یہ خصوصیت موجود تو کسی قدر اُن کی ابتدائی غزلوں میں بھی ہے، درمیانی کلام میں بڑھ گئی اور آخری زمانہ میں تو یہی خصوصیت، دوسری خصوصیتوں پر چھا گئی اور غالب آگئی۔

کلیاتِ اول کے پہلے اڈیشن کے شائع ہونے پر ایک ناقد نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ:۔

"مصنف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک تھنکر (سوچنے والا، صاحبِ فکر) یا فلاسفر

ہے جس نے اپنے خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔"

حضرت اکبر کو یہ رائے بڑی پسند آئی، اسے وہ اپنی حقیقی داد سمجھے، اور واقعہ ہے بھی یہی، کہ جوں جوں اُن کی شاعری نکھرتی گئی وہ روز بروز اس خیال کے مصداق صحیح سے صحیح تر ہوتے گئے۔ مثال کے طور پر کلیات سوم کی دو ایک غزلیں درج ذیل ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا کہ قالب اگرچہ غزل کا ہے، لیکن رُوح ذرا بھی غزل کی نہیں (غزل اپنے عام عرفی و مقبول معنی میں) جام و سبو کی شکل پر جائیے تو آپ بھی ہر طرف شراب ہی شراب نظر آئے گی، لیکن چکھ کر دیکھیے تو آپ خود ہی پکار اُٹھیں گے کہ " استغفر اللہ، شراب یہاں کہاں۔ یہ تو پیالیوں میں اخلاق و موعظت کی یخنی رکھی ہوئی ہے یا گلاسوں میں طریقت و معرفت کا آب طہور چھلک رہا ہے۔ بوتلوں میں ظرافت کی چاشنی سیاسیات کے شربت میں شیر و شکر ہوتی نظر آ رہی ہے"

ذیل کی غزل کو آپ غزل کہیں گے یا ایک درس تصوف؟ "سخن با زناں گفتن"[1] یہ کسی معنی میں ہے؟

نگاہ اُٹھی ہے احساس ماسوا کے لئے
کہاں ہے دل ذرا رو کے اسے خدا کے لئے
رواں ہو کار جہاں کیوں ہماری مرضی پر
خدا ہمارے لئے ہے کہ ہم خدا کے لئے
عمل خدا کے لئے ہو تو اس کا کیا کہنا
مگر ریا یہ بُری صرف واہ وا کے لئے

لیلائے تغزل کے مجنوں دُور سے محمل کو دیکھ شوق سے اس کی طرف لپکتے ہیں، پاس آ کر اندر جھانکتے ہیں، تو نہ کوئی عشوہ فروش ہے، نہ کوئی زہرہ جبیں، بلکہ ایک شیخ وقت مع اپنے جبہ

---

[1] غزل کی تعریف انہیں الفاظ میں کی گئی ہے۔

و دستار کے تسبیح و تہلیل میں مصروف نظر آتے ہیں ؎

خدا کے نام کا ہے احترام عالم میں — نہ صرف آپ میں ہم میں، تمام عالم میں

اسی کا نام نہ کیوں مرکزِ زباں ہو جائے — کہ اختلاف سے خالی ہو کام عالم میں

خدا پرست کو کافی ہے مثلِ ابراہیمؑ — زوالِ شمس و قمر، صبح و شام عالم میں

یہی مشن تھا جناب رسولِ اکرمؐ کا — اور آج انہیں کا تو روشن ہے نام عالم میں

ذوق نظر کے شیدائی، چنگ و رباب کے رسیا، دور سے باجے گاجے کی آواز سن سنا دوڑتے ہوئے آتے ہیں کہ چلیں اندر سبھا کے ناٹک کا لطف اٹھائیں۔ جلوہ گاہ کا جب پردہ اٹھتا ہے تو سارا وہم و تخیل ہی برباد۔ نہ مطرب ہے، نہ ساز، نہ ساقی ہے نہ انداز، محفل میں بجائے ساز کے سوز ہے لبوں پہ بجائے واہ کے آہ ہے۔ طبلہ کی تھاپ کی جگہ ضربِ اللہ ہو کی لگ رہی ہیں۔ چہروں پر بجائے ہنسی کی کھلکھلاہٹ کے

خشیت الٰہی۔ درمیان میں ایک صاحب حال درویش اپنی آگ سے دوسروں کو گرما رہے ہیں ؎

گو سعی ہوا تے شوق نے کی، بو اس کی نہ نکلی محفل سے

مجنوں نے اڑائی خاک بہت، لیلٰے نے نہ جھانکا محمل سے

دنیا کے تغیر کا نہیں جس شیدائے جمال باری کو!

پروانہ کو مطلب شمع سے ہے، کیا کام ہے رنگِ محفل سے

احساس ہی ایذا کا نہ ہوا! اندر یاد و فغاں میں کیا کرتا

جس وقت تہ خنجر تھا گلا، آنکھ اپنی لڑی تھی قاتل سے

طبیعت زہد خشک سے اکتا چلی ہو، اور دل میں ظرافت کی گدگدی اٹھ رہی ہو، تو اس

ہر رنگ کو بھی لینے کہیں دُور نہیں جاتا ہے۔ ندرت تو اتی کے طلسم ساز کے لیے آگ کو برف بنا کر پیش کر دینا کیا مشکل ہے۔ اس رنگ کا کلام بھی غزلوں ہی کے تحت میں موجود ہے ؎

اَب نہ جنگی عَلَم نہ جھنڈا ہے صرف تعویذ اور گنڈا ہے

کیا ہے باقی جنابِ قبلہ میں کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

غرض آخری دور کا جو کلام غزلیات کے زیرِ عنوان رکھا گیا ہے، اس کا بیشتر حصّہ ایسا ہے کہ بس وہ نام ہی کی غزلیں ہیں۔

بایں ہمہ جب کبھی غزل سرائی پر آئے ہیں، پُورے عاشق بن گئے ہیں۔ جو کچھ بھی عاشقانہ رنگ میں کہا ہے خوب کہا ہے۔ اپنے مرتبہ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے، اور درجۂ اُستادی کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ لطفِ زبان و سلاستِ بیان، اُن کی غزل کی جان ہے۔ دشوار پسندی نے بعض اچھے اچھے غزل گویوں کو غارت کر دیا ہے، اکبر کا گلستان ان کانٹوں سے بالکل پاک ہے، پھر بیان کی لطافت کے ساتھ خیال کی بلندی بھی موجود۔ صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے کہ سیرت کی تہذیب و شائستگی سے غافل ہو جائیں جانتے ہیں کہ ناظرین سب ہی طرح کے لوگ ہیں۔ ایسے بھی جو محض محمل کی آب و تاب چمک دمک سے جی خوش کر لیں گے۔ ایسے بھی جو محمل نشین کی زیارت کیے بغیر دم نہ لیں گے۔ دونوں طبقات کے دلوں کی ڈوریں یہ ناقہ بانِ سخن اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔

رسمی شاعروں کے خلاف اکبر غزل میں تماشہ گاہ فطرت کا نظارہ کرتے ہیں، اور فطرت کے کھلے ہوئے میدان میں، دن دوپہر وہ مزے حاصل کرتے ہیں، جن کی تلاش رسمی شاعروں کو خدا جانے کہاں کہاں سرگرداں رکھتی ہے۔ اور یہ لطف اُنہیں خلوت ہی میں نہیں، جلوت میں بھی ہمہ وقت حاصل ہے۔ لیکن پھر آخر جذباتِ مشرقی شاعر کے رکھتے ہیں، اور اس کو منقطع میں نباہ لیجاتے ہیں ؎

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا | کیا دل کشا یہ سین ہے فصلِ بہار کا
نازل ہیں جوشِ حسن پہ گلہائے دلفریب | جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم ابھار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب | نقشہ کھنچا ہوا ہے خط و زلفِ یار کا
سبزہ ہے یا یہ آبِ زمرد کی موج ہے | شبنم ہے، بحر یا گہرِ آب دار کا
مرغانِ باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں۔ | اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا
موجِ ہوا سے زمزمۂ عندلیب مست | اک سازِ دل نواز ہے مضراب و تار کا
ابرِ تنک نے رونقِ موسم بڑھائی ہے | غازہ بنا ہے روئے عروسِ بہار کا
افسوس اس سماں میں بھی اکبرؔ اداس ہے | سوہانِ روح ہجر ہے اک گلعذار کا

رسمی شاعر بے چارے حقیقت سے بے نیاز، محض الفاظ کی تراش خراش میں لگے رہتے ہیں، ان کی شاعری پر، یہ حقیقی شاعر کیسی جنچی تلی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ رائے شاعرانہ بھی اور صحیح بھی ہے

معنی کو چھوڑ جو ہوں نازک بیانیاں | وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

ذیل کی غزل میں تغزل کے پامال مضمونوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے، آخری شعر اس پایہ کا ہے کہ کہنے والے کی نجات کے لئے بس کرتا ہے

گھٹتا جاتا ہے مری نظروں میں مقدور مرا | بڑھتا جاتا ہے شمار انکے خریداروں کا
بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑتے مرتے ہیں | فیصلہ کر ہی دو اب اپنے گنہگاروں کا
بے خطر پھرتا ہوں بازارِ جہاں میں ہر سو | کیسہ خالی ہے تو کیا خوف ہے عیاروں کا

فطرت اٹھی ہے شفاعت کو، ملائک ہیں خموش
حشر ہے عشق و محبت کے گنہگاروں کا!

غزلیہ شاعری کا سب سے زیادہ پامال مضمون عشق ہے۔ ہر سخن گو کا تختۂ مشق یا تکیہ کلام دفتر کے دفتر اس کی شرح میں سیاہ ہو چکے ہیں اور عاشقوں کی تعداد کا تو کوئی شمار و حساب ہی نہیں لیکن کیفیتِ عشق، لفظ و عبارت کی مدد سے کچھ بھی واضح ہو پائی ہے؟ اکبر اس گونگے کے خواب کی مصوری اپنے مرقع میں کرتے ہیں ؎

عشق میں حسنِ بیاں وجہِ تسلی نہ ہوا　　لفظ چمکا مگر آئینۂ معنی نہ ہوا

اسلوب بیان کی ندرت و بلاغت ملاحظہ ہو۔ شاعر کو دعویٰ اپنی قوتِ گویائی پر ہے، بڑے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو وہ باتوں باتوں میں سمجھا دیتا ہے، دقائق کی گتھیاں وہ ایک اشارے میں سلجھا دیتا ہے۔ "حسنِ بیان" اس ساری داستان کا ترجمان ہے، لیکن عاشق ہونے کے بعد اُسے کچھ الیا نظر آتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتِ گویائی بیکار ہی گئی۔ الفاظ کا ذخیرہ اب بھی وہی، بیان کا ملکہ اب بھی وہی، قدرتِ زبان وہی، لفظ سجل اور سڈول، تقریر بلیغ و شستہ یہ سارا مفہوم "لفظ چمکا" سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہے کہ معنی کی توضیح نہیں ہو پائی۔ کیفیتِ قلب کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے پاتا۔ شیشہ میں آب و تاب، چمک دمک سب موجود۔ لیکن عکس قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے "آئینہ معنی نہ ہوا" جام بلور میں اس پوری کیفیت کا آئینہ ہے۔ ضمناً یہ پہلو بھی "وجہ تسلی نہ ہوا" سے آ گیا ہے، کہ تسلی کا تعلق زبان و بیان سے نہیں، بلکہ قلب اور اس کے احساس سے ہے۔

اسی زمین میں ایک دوسرا شعر بھی ہے، افسردگی یاس و حرماں نصیبی کی ایک بولتی ہوئی تصویر۔ ایسے کلام کی قدر اچڑھتی جوانی میں نہیں، بڑھاپے کو پہنچ کر ہوتی ہے ؎

دل میں کہتے تھے کہ یہ ہو گا وہ ہو گا لیکن
کٹ گئی عمر امیدوں ہی میں، کچھ بھی نہ ہوا

اکبر کے دورِ آخر کی اکثر غزلوں کی تان، یاس و افسردگی کی آہوں پر آکر ٹوٹتی ہے دُنیا کی بے ثباتی، اور اس سے اپنی بے تعلقی، لذاتِ دُنیا کی بے حقیقتی یہ موضوع اکثر غزلوں میں مشترک ہے۔ ذیل کی غزل انہیں جذبات کی ترجمان ہے۔ بعض تشبیہوں کی ندرت پر لطافت لوٹ لوٹ جاتی ہے ؎

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی
ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں

اس خانۂ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث
سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں

افسردہ ہوں عبرت سے، دوا کی نہیں حاجت
غم کا مجھے یہ ضعف ہے، بیمار نہیں ہوں

وہ گُل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے
اُلجھوں کسی دامن سے، میں وہ خار نہیں ہوں

یارب مجھے محفوظ رکھ اُس بُت کے ستم سے
میں اس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں

گو دعویٰ تقویٰ نہیں درگاہِ خدا میں
بُت جس سے ہوں خوش، ایسا گنہگار نہیں ہوں

افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبرؔ
کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

دُنیا میں رہ کر دُنیا سے بے لوث و بے تعلق رہنے کو بہت سے شاعروں نے باندھا ہے، لیکن یہاں پہلے اور تیسرے شعر میں جن لطیف و دلنشیں تشبیہات کی مدد سے یہ مضمون باندھا گیا ہے وہ اکبر ہی کا حصہ ہیں ضعف کا مضمون بھی پامال ہو چکا ہے، لیکن اکبر چوتھے شعر میں ایک نیا پہلو یہ نکالتے ہیں کہ غم و افسردگی میں اس قدر لاغر ہوں کہ لوگ مجھے بیمار سمجھ رہے ہیں، اور دوا کی فکر میں ہیں۔ چھٹے اور ساتویں شعر میں سیاسی رمز اور کنائے ہیں۔

عشق کا دم بھرنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہوں، لیکن واقعی عشق رکھنے والے کہیں دو چار ہی ملیں گے، آہیں سب کرتے ہیں، لیکن مجنوں کا سوز کسی کی آہ میں نہیں ملتا۔ سوزِ عشق

کی اہلیت بس مخصوص ہی اشخاص میں ہوتی ہے، عام خلقت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا، اس مفہوم کو یہ شاعر یوں ادا کرتا ہے ؎

باطن بہت ہیں ایسے جو مشتعل نہیں ہیں
سینہ میں سب کے دل ہیں، سب اہل دل نہیں ہیں

اس مضمون کو ایک مطلع میں بھی ادا کیا ہے ؎

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں
آئینہ کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں

"مقبول" و "قابل" کا تقابل بھی کیا خوب!

اسی زمین میں ایک اور شعر بھی ہے اور وہ اسی مضمون سے متعلق ہے ؎

وہ کم ہیں تڑپنے میں، جنہیں ملتی ہے لذت
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

تیغ کے بسمل تو ہزار ہا نکل آئیں گے، لیکن اس تڑپ میں لذت پانے والے کتنے نکلیں گے، مجاز پر محمول کیجیے یا حقیقت پر، سیاست میں لے جائیے یا معرفت میں۔ بہر حال جس پہلو سے بھی چاہیے الٹ پلٹ کر کے اس شعر کو لیجیے، واقعیت سے خالی کوئی بھی پہلو نہ نکلے گا۔

عاشق خوب جانتا ہے کہ کوئے قاتل میں پھر نا جان سے ہاتھ دھونا ہے، لیکن اگر انجام بینی اس قصد سے باز رکھے، اور دل پر اسے اتنا ہی قابو حاصل رہے تو پھر عاشق کیوں کہلائے ؎

ذوق ہوائے کوچۂ قاتل کو کیا کروں!
مہلک سہی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں

اس کی تڑپ، اس کا سوز، اس کا جوشش و خروش، ان میں سے کوئی شئے وہ اپنے قصد و

اعتبار سے نہیں پیدا کرتا، یہ ساری کیفیات اضطراری ہوتی ہیں اس کا متاثر قلب ، اس سے نخود بخود یہ سب کچھ کرانا رہتا ہے ؎

اظہار اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں

پہلو میں لیکن اس دلِ بسمل کو کیا کروں

ناصح کہتے ہیں کہ نظارہ گل ترک کرے تو دل قابو میں آجائے گا، لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہوا کی مستی اور دوسرے عاشقوں کی صدائیں کب دل پر قابو رہنے دیں گی ؎

قطع نظر گلوں سے نہیں مانع جنوں !

بوئے بہار و شور عنادل کو کیا کروں

داغ کی ایک مشہور غزل ہے ؎

بات میری کبھی سنی ہی نہیں　　جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں

اس کا یہ شعر خوب چلا ہوا ہے ؎

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد　　ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اس زمین میں اکبر نے جو گل بوٹے کھلائے ہیں، ذرا اس کی بھی سیر ہو جائے ؎

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں　　آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

چاہتا تھا بہت سی باتوں کو　　مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں

جرأت عرض حال کیا ہوتی　　نظرِ لطف اس نے کی ہی نہیں

اس مصیبت میں دل سے کیا کہتا　　ایسی کوئی مثال تھی ہی نہیں

آپ کیا جانیں قدر "یا اللہ"　　جب مصیبت کوئی پڑی ہی نہیں

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں!

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

"فالتو" کو کس خوبی سے کھپا دیا ہے! اور "سوسائٹی" کا قافیہ لانا تو اکبر کا مخصوص حصّہ تھا۔ گردشِ چرخ کا شکوہ سب ہی شاعر شروع کرتے آئے ہیں۔ اکبر نے دوسروں کے تجربہ سے فائدہ یہ اٹھایا کہ سرے سے کوئی آرزو ہی فلک سے قائم نہ کی۔ اور مزے میں ہے۔ پانچویں شعر میں ایک نادر مضمون باندھا ہے مصیبت زدہ کی تسکین کے لئے دوسروں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن ہمارے شاعر کو جن مصائب کا سامنا ہوا ہے، ان کی کوئی نظیر اب تک موجود ہی نہ تھی، وہ کس کی مثال سے اپنے دل کو تسکین دیتے۔ مصائب کے فوق الحد ہو نے کا یہ ایک نادر پیرایۂ اظہار ہے۔ چھٹے اور ساتویں شعر کا تعلق ذاتی تجربہ سے ہے، ان کی داد دینا بغیر آپ بیتی کی مدد کے ممکن نہیں۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو:

جلوۂ ساقی و مے جان لئے لیتے ہیں
شیخ خوش ہوں کہ خفا ہم تو پئے لیتے ہیں

دل میں یاد ان کی جو آتی ہوئی شرماتی ہے
درد اٹھتا ہے کہ ہم آہ کئے لیتے ہیں

دورِ تہذیب میں پریوں کا ہوا دور نقاب
ہم بھی اب چاک گریباں کو سئے لیتے ہیں

خودکشی منع، خوشی گم، یہ قیامت ہے مگر
جینا ہی کتنا ہے اب، خیر جئے لیتے ہیں

لذتِ وصل کو پروانہ سے پوچھیں عشاق

وہ مزہ کیا ہے جو بے جان دیئے لیتے ہیں

دوسرا شعر عاشقانہ رنگ میں لاجواب ہے۔ عارفانہ پہلو بھی ہے۔ مضمون کتنا سچا ہے کہ بغیر درد کے اُن کی یاد ہی نہیں ہو سکتی۔ اور اسے کس بانکپن سے ادا کیا ہے، آخری شعر بھی اسی رنگ میں ہے، تیسرے اور چوتھے شعر میں شاعر پھر اپنے اصلی عالم میں چلا گیا ہے۔

نامانوس قافیہ لاکر کلام میں شعریت باقی رکھنا، بلکہ اس کے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ازل سے یہ دولت اکبر کے حصہ میں آچکی تھی۔ فرماتے ہیں۔ اور کس بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

اس دور میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے

اس باغ میں طوطی کے لئے توت نہیں ہے

نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا

سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے

لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب فعل و فعول

چرخا ہی چلا جاتا ہے اور سوت نہیں ہے

نیچر ہی کا مطبخ ہے بہت معتبر اکبر

تم دیکھتے ہو ڈیل میں کہیں چھوت نہیں ہے

اکبر کا اصلی مقام معرفت و حقائق کا "لاہوت" ہے، لیکن جب قافیہ پیمائی کے "ناسوت" میں اُترتے ہیں تو دیکھنے والوں کو "مبہوت" کر دیتے ہیں۔ اب مزید توصیف سے "سکوت" ہی اولیٰ۔

خالص عاشقانہ رنگ کے شیدائی، اپنے ذوق کی تسکین کا سامان عجب نہیں کہ ان غزلوں

یں پا سکیں ؎

عشق کہتا ہے بیانِ حال کی پروا نہ کر
تیرے دل کی خود بخود اُن کو خبر ہو جائیگی
میں شبِ فرقت میں تڑپوں اور وہ سوئیں چین سے
کس طرح مانوں محبت بے اثر ہو جائے گی

تجھے اے اُمیدِ فردا، دل و جان سے پیار کرتے
مگر اپنی زندگی کا نہیں اعتبار کرتے
ہے بتوں کی خود نمائی مری غفلتوں سے قائم
میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے
ترے ہاتھوں کی زینت تو ہے شاخِ گل سے افزوں
ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

صبر رہ جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے
ضبط کرتا ہوں، مگر آہ نکل جاتی ہے
کچھ نتیجہ نہ سہی عشق کی اُمیدوں کا
دل تو بڑھتا ہے، طبیعت تو بہل جاتی ہے
شمع کے بزم میں جلنے کا جو کچھ ہو انجام
مگر اس عزم سے سانچہ میں تو ڈھل جاتی ہے

کتمانِ رازِ عشق مرے آب و گل میں ہے

خاموش ہے زبان، جو کچھ ہے وہ دل میں ہے

افعی و زلف میں کا تو سودا بُرا نہیں!

پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اس کے بل میں ہے

بل" (فردِ حساب) کا تعلق "سودے" سے تو خاص انگریزی دکانداری کا ضلع ہے۔ لکھنؤ کا ذوقِ قدیم اس کی زیادہ قدر نہ کرسکا، البتہ "افعی" و "زلف" دونوں کے لئے "پیچیدگی!" عجب نہیں جو اہلِ لکھنؤ ان مناسبتوں پر "لوٹ لوٹ" جائیں، اکبر کے سارے قصور معاف کردیئے داد میں "دفتر کے دفتر" سیاہ کردیں، لفظ لفظ کیا۔ "نقطہ نقطہ" کی تشریح "مو بمو" کرنے لگیں، بال کی کھال نکالنے لگیں اور "سلسلۂ بیان دیر تک" برہم "ہونے پائے۔

کہیں کہیں شعر اس رنگ کا بھی فرما گئے ہیں جو استادانہ امانت کی روح کو وجد میں لے آئے، مثلاً ؎

اس سروِ قد پہ اکبر مدت سے مر رہا ہوں!

اللہ راست لائے کوشش تو کر رہا ہوں

بے ساختگی تو یہاں بھی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ عموماً کہتے وہی ہیں جو دل میں محسوس کرچکے ہوتے ہیں، اُن کی شاعری اکھاڑہ کا کرتب نہیں، وارداتِ قلب کا عکس ہے۔ اپنے پر جو گذرتی ہے وہی دوسروں کو بھی سنانا چاہتے ہیں۔ خود بھی اپنے اس ہنر سے واقف ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اس کے اور میرے کلام میں ہے کیا؟ ؎

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں

دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنے میں اور رسمی شاعروں میں جو فرق پایا، اُسے بھی صاف صاف بیان کر دیا ہے ؎

میں اپنے آپ میں، ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن اُن سے سنور تا ہے، سخن سے میں سنورتا ہوں

اتنا نمونہ حضرت اکبر کے آخری دورِ تغزل کا کافی ہو گا۔ ضمناً ابتدائی اور وسطی دور کے کلام سے بھی تعارف ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کی عظمت کی بنیاد اُن کے عاشقانہ کلام پر نہیں، دوسرے اصنافِ سخن پر ہے، لیکن اس کے باوجود خاص تغزل میں بھی اُن کا مرتبہ اُردو شاعروں میں کچھ ایسا گیا گزرا نہیں، کہ اُن کے لئے باعث توہین، اور اُن کے پرستاروں کے لئے باعث شرم ہو۔ روزمرّہ شیرینی اور زبان کی صفائی میں تو اُن کی اکثر غزلوں پر داغ کے کلام کا دھوکا ہو جاتا ہے، اور معنوی بلند پروازیوں میں اگر وہ غالب کے ہم سطح نہیں، تو بھی مومن و شیفتہ وغیرہم کے طبقہ میں تو اُنہیں بے تکلف جگہ مل ہی سکتی ہے۔ مثالیں کلام کے ابتدائی اور درمیانی دور میں بکثرت ملیں گی۔ آخری دور میں کمتر۔

(د) اخلاق و معاشرت

اکبر کے صحیفہ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے۔ ان کی شاعری کی رُوح، ان کی اخلاقی و معاشرتی تعلیمات ہیں، ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہو گئے تھے۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں، جنھوں نے اوّل سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ ہر دور میں رفاقت قائم رکھی، ایک تو پیرایۂ ادا و اندازِ بیان کی ظرافت، دوسرے مفہوم سخن و موضوع کلام کے حدود میں اصلاحِ معاشرت و تزکیہ اخلاق

اکبر کی شاعری کے عروج و شہرت کا زمانہ بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی ہے لیکن انکی اصلاحی شاعری کی بنیاد ۱۹ ویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی۔ اور بیسویں صدی کے شروع ہی سے

وہ خاصے مشہور بھی ہو چکے تھے۔ ہندوستان، خصوصاً مسلمانانِ ہندوستان میں عین یہی زمانہ، مغربی تمدن، مغربی معاشرت، مغربی علوم، غرض مغربیت کے ہر شعبہ کے انتہائی عروج، مقبولیت و فروغ کا ہے۔ اکبر جب دنیا میں روشناس ہوئے ہیں، تو اس وقت کی صورتِ حال کا نقشہ ذرا تفصیل کے ساتھ تصور میں لے آئیے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں فرو ہوئے، ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں اور ہندوستان پوری طرح مزہ چکھ چکا ہے کہ زبردست کے مقابلہ میں کمزور کے سر اٹھانے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ ملّتِ اسلامی خصوصیت کے ساتھ اپنی غفلتوں اور عیش پرستیوں کے نتائج بھگت رہی ہے۔ صدیوں تک جس ملک میں حکومت کی۔ بڑے کروفر کے ساتھ، بڑی شان شوکت کے ساتھ، کبھی غوریوں کے نام سے کبھی خلجی بن کر، کبھی سیدوں کے نام سے، اور کبھی تغلق کا جھنڈا اٹھا کر۔ اور آخری صدی دو صدی مغلوں کے نام سے۔ اس ملک میں مسلمان، اب سب سے زیادہ حقیر و ذلیل تھے، ہر سمت سے پٹے ہوئے، چاروں طرف سے مار کھائے ہوئے۔

اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدّت ہوئے رخصت ہو چکے۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو مغلوبیت کی یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ثروت و خوشحالی اوّل تو باقی ہی کہاں، جائیدادیں بارِ قرض سے دبی ہوئی، مکان اور زیور، مہاجنوں ساہوکاروں کے یہاں رہن، اور پھر جو کچھ روپیہ پیسہ رہا بھی وہ ناچ رنگ، کھیل تماشا، ٹیم ٹام کی نذر۔ نہ تعلیم و تربیت نہ اتحاد و تنظیم، نہ ہمت و خودداری، نہ جوشِ توحید و ولولۂ دینی، نہ قناعت و ایثار۔ عقیدے مشرکانہ، اخلاق جاہلانہ، عادتیں مسرفانہ، آپس میں حسد و بغض، ایک کی ناک میں ایک لگا ہوا، عجمیت اور ہندیت کے حملے تو سینکڑوں سال سے جاری تھے، اب آخری زبردست ٹکر، فرنگیت سے ہوئی، اور اس کو کہنا چاہیئے کہ پرانے عربی جہاز کو پاش پاش

ہی کر دیا۔ اِدھر مغرب کی اس زیرک و زمانہ شناس اور اقبالمندی کے لحاظ سے پُرشباب قوم انگریز نے تیر و تبر، توپ و تفنگ سے، کہیں زیادہ بے پناہ حربہ پروپیگنڈا کا استعمال شروع کر دیا، اور اپنے ایجنٹوں، گماشتوں، کارندوں کو اسکول اور کالج کے ادبی قالب میں بنا کھڑا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دل پر برطانیہ کی عظمت کا نقش، ہر زبان پر اقبال سرکار کا کلمہ! دادخواہی کے لئے گھر سے نکلئے تو قانون انگریزی، عدالتیں انگریزی، لڑکوں کو پڑھنے بٹھایئے تو اسکول انگریزی، کالج انگریزی، کتابیں انگریزی، زبان انگریزی۔ سفر کے لئے باہر نکلئے تو سڑکیں انگریزی، سواری (ریل) انگریزی، ٹکٹ انگریزی، سفر کی منزلیں (اسٹیشن) انگریزی دکھ درد میں مبتلا ہو جئے، تو علاج کے لئے دوائیں انگریزی، تشخیص انگریزی، شفاخانے انگریزی، مرہم پٹی انگریزی۔ خط بھیجئے، پارسل منگایئے تو ڈاک انگریزی، ڈاک خانہ انگریزی روپیہ جمع کرنے، بہی کھاتہ کھولنے کا شوق ہو، تو بینک انگریزی سیونگ بینکس انگریزی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں انگریزی۔ قصہ کہانی کے لئے جی لہرائے تو افسانے انگریزی، ناول اور ڈرامے انگریزی۔ ورزشی کھیلوں کے لئے دل للچائے تو کھیل انگریزی، فٹ بال اور کرکٹ اور ٹینس اور انشا[1] شام کو سیر و تفریح کے لئے قدم اٹھایئے تو سامان تفریح انگریزی، پارک

---

[1] ایک بہت پرانا انگریزی کھیل۔ اب مدت ہوئی متروک ہو گیا ہے۔ شروع انگریزی راج میں اس کا بڑا رواج تھا۔ جن شہروں میں شروع شروع انگریزی چھاؤنیاں قائم ہوئی تھیں، وہاں "انشا گھر" کے نام سے عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ میاں منیر شکوہ آبادی ایک پرانے اردو شاعر ہوئے ہیں، صاحب دیوان۔ وہ بھی ایک جگہ لے باندھ گئے ہیں ؎

جیت جاتے اک مہینہ بھر کے بونسر بات میں   ہم جو انشا اس قدر بے فیس دے کے کھیلتے!

ہیں، لان میں، کلب میں، ہوٹل اور ریسٹران میں، رات کو رنگ رلیاں منانے کو جی چاہے تو تماشے انگریزی، تھیٹر، کنسرٹ، آپیرا۔ ماضی کو جاننا چاہیے تو تاریخیں انگریزی۔ حال سے باخبر رہیئے تو اخبارات انگریزی، تار برقیاں انگریزی، پیشہ انگریزی، بیرسٹری، وکالت، ڈاکٹری، انجینیری عہدے انگریزی، علوم انگریزی، فنون انگریزی، صنائع انگریزی اخلاصہ یہ کہ گویا زمین انگریزی آسمان انگریزی۔

اپنی اس پستی اور "صاحب" کی اس بلند پروازی، اپنی خاک نشینی، اور صاحب کی فلک پیمائی دیکھ، حواس بجا کیں کے رہ سکتے تھے؟ خصوصاً جبکہ اپنے دل کا سرمایہ پہلے ہی لٹ چکا ہو، ہوش گم۔ نگاہیں خیرہ، عقل دنگ، مرعوبیت غالب، دماغ مفلوج، ڈوبتے کو گھاس کے تنکے کا سہارا کافی نظر آیا۔ اندھیرے میں اپنے سایہ پر بھوت کا گمان گذرا۔ التباس حواس میں دیو پر پری کا حسن وجمال معلوم ہوا۔ دَیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا۔ اچھے اچھے ہوشمند اور مخلص سید احمد خان اور ان کے سارے رفیق یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ۔ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" بھائیو بجز مذہب کے ہر چیز میں انگریز بن جاؤ۔ فلاح اور زندگی کا سہارا بس اُدھ میں ہے ـــــ حالی بڑے خشوع وخضوع سے مسدس اسلام کھول کر بیٹھے لیکن مناجات کا خلاصہ بس یہی کہ اے پاک پروردگار ہم کو انگریزوں سا بنا دے۔ شبلی نے بڑے ٹھاٹھ سے نامورانِ اسلام کا دربار سجایا۔ لب لباب اس کا بھی یہی، کہ ہمارے اکابر سلف بھی دانایانِ فرنگ سے کتنا قریب تھے! اور نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک، چراغ علی بیچاروں کا تو ذکر ہی نہیں۔

اب قوم تھی اور اس کے سر پر جادوئے فرنگ! ہر طرف سحر سامری کا دور دورہ ہر سمت سے دجالی تہذیب کا حملہ۔ معیار کمال یہ ٹھہرا کہ انگریزی بولنا آجائے، لب ولہجہ

"صاحب" کا سا ہو جائے ۔ ڈگریاں اور امتحانات سرکاری نصیب میں آجائیں ۔ اپنی زبان بگاڑ
کر بولی جائے ۔ اپنی زبان، اپنے علوم، اپنے ہاں کے کھانے پینے، اپنے طرز کے پہننے اور رہنے، اپنی
ساری معاشرت، اپنے خاندان، اپنی برادری، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے بھی شرم آنے لگے ۔
اپنے ہاں کی ایک ایک چیز میں ذلت وحقارت نظر آنے لگے ۔ معزز صرف "صاحب" اور "میم صاحب"
ٹھہر جائیں ۔ اپنے ہاں کی شرم وحیا، حجاب، نقاب اس لئے قابل نفرت کہ میم صاحب کھلے بندوں
سب کچھ دیکھتی دکھاتی پھرتی ہیں ۔ جن و ملائک کا شمار اس لئے اوہام میں کہ "مل" اور "اسپنسر"
ان کے قائل نہیں ۔ عرش کا وجود اسلئے باطل کہ جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ۔ وحی، نبوت
توحید کے بنیادی مسائل اس لئے فرسودہ ومتروک کہ پادری صاحب اپنی گڑھی ہوئی مشرکانہ مسیحیت
میں ان پر دلائل عقلی نہ قائم کر سکے ۔ داڑھی منڈانا اس لئے واجب کہ صاحب منڈاتے ہیں ۔ سود
جیسی حرام کمائی اسلئے جائز کہ صاحب کے دیس میں شہر شہر بینک کھلے ہوئے ہیں ۔ "سرا"
ذلیل "ہوٹل" معزز ۔ مختار کار ندہ حقیر، "ایجنٹ" قابل عزت ۔ "حکیم" غریب کس مپرسی میں پڑے ہوئے
"ڈاکٹر" ہاتھوں ہاتھ لئے جارہے ہیں !

غرض فرش سے لے کر عرش تک، ذرہ سے لے کر آفتاب تک، علم وعمل معاشرت اخلاق
عقائد کے دائرہ میں کوئی شے ایسی نہ تھی جو "صاحب" کے نام کا کلمہ ۔ پڑھ رہی ہو ۔ ساری فضا اسی
مرعوبیت سے معمور، "دانش فرنگ"، "حکمت مغرب"، "عقلائے فرنگ" "اقبال سرکار" "دانایان مغرب"
وغیرہ خدا جانے کتنے فقرے اور ترکیبیں اس دور مرعوبیت کی یادگار، علوم متعارفہ کی طرح
بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے، اور ادب کا گویا جزو بن گئے ۔ "فرنگی" کا لفظ اس سے
قبل ذم وہجو کا پہلو لئے ہوئے تھا ۔ اس دور میں "فرنگ" محل مدح وعظمت میں استعمال ہونے لگا
—— دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہیں ۔ زبردست جب کمزوروں پر غلبہ پا جاتے

ہیں، تو بس یہی ہونے لگتا ہے۔ ہر چیز انہیں کی عینک سے یہ خود بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ اور اب نہ اپنی عقل باقی رہ جاتی ہے، نہ اپنی نظر۔ اور تاریخ والوں کا بیان ہے کہ قوموں کی قسمت میں یہ دستور ازل سے لکھا چلا آرہا ہے ؎

وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے ازل کے دن سے یہ اے ہوتی آئی ہے

تو یہ تھی وہ فضا جس میں اکبر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں انہیں اپنا پیام پہنچانا تھا۔ رسمی شاعر نہ تھے، ہوتے تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جس طرح اور ان کے ہم عمر، اچھے اچھے خوش فکر، زینت مشاعرہ ہو رہے تھے۔ یہ بھی آراستہ پیراستہ طرحی غزلیں کہتے رہتے، ایلے طرح بھی قافیہ پیمائی میں لگے رہتے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ صاحب نظر تھے، ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے، ایک خاص مقصدیت لے کر آئے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بار ان کے شانہ پر تھا۔ یوں کہیے کہ فطرت کی جانب سے ایک "رسول" ہو کر آئے تھے "صاحب کتاب" حقیقی رسولوں کے جانشیں اور ادنے خادم۔ دل کڑھا، دماغ متاثر ہوا، آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا، جو دوسروں کی نظر سے اوجھل تھا۔ ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردِ عمل تھا۔ ان کی شاعری اول سے آخر تک، اس مادیت و فرنگیت کا جواب ہے۔ ان کے ترکش کا ایک ایک تیر اس نشانہ پر آکر لگتا ہے۔ ان کے فلسفہ، ان کی ظرافت، ان کی سیاسیات کے دائرہ کی معمولی سی بھی پیمائش ممکن نہیں، تاوقتیکہ نظر اس مرکزی نقطہ پر نہ جمالی جائے۔

یہ رنگ موجود شروع ہی سے تھا، سن و تجربے میں پختگی کے ساتھ نکھرتا گیا، یہاں تک کہ آخر میں ہر ساز سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا۔ عورتوں کی بے پردگی سے متعلق ان کا مشہور و ضرب المثل قطعہ ان کے آخر زمانہ کا نہیں، شروع ہی کا ہے، اور کلیات سوم میں نہیں "کلیات اول" میں درج ہے ؎

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیویاں | اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہُوا | کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

"عقل پر پردہ پڑ جانا" اس محاورہ کا تصرف اس خوبی سے، اس سے قبل کبھی کیوں ہُوا ہو گا!

قوم کی انتشاری و اضطرابی حالت خود اپنی ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہے، اس کا نقشہ بھی، اُن کے قلم کا کھینچا ہُوا، بہت مدت کا ہے ؎

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا | چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر | اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیات سوم میں اصلاح معاشرت ہے، تزکیۂ اخلاق ہے، شعائر اسلامی کا احیاء ہے، تہذیب اسلامی کی تجدید ہے، اور یہ وعظ سطر سطر میں موجود ہے، لیکن مولانا حالی کی طرح خشک واعظ نہیں وہ پہلے شاعر ہیں، پھر کچھ اور۔ پہلے ظریف ہیں، پھر مصلح۔ پہلے نقاش فطرت ہیں۔ پھر معلم اخلاق اُن کی محلس میں شراب کے گلاس گردش میں رہتے ہیں، خوش رنگ، خوش مزہ، یخنی کے پیالے تقسیم نہیں ہوتے[1] اور یہ اس رندِ پاکباز کی کرامت ہے کہ حلق سے اُترتے ہی وہ شراب خانہ خراب نہیں رہ جاتی۔ شراب طہور ثابت ہوتی ہے لا فیہا غول ولا ہم عنہا ینزفون،

اکبر سے قبل بنگال کا ایک نامور فرزند بنکم چندر چٹرجی بھی یہی مشن لے کر پیدا ہُوا ہوا تھا، تہذیب جدید کے خطرات کا اُس نے پوری طرح اندازہ کر لیا تھا، اور بنگالی زبان

---

[1] یہ تشبیہہ بھی خود حضرت اکبر ہی کی سجھائی ہوئی ہے۔ کہیں فرما گئے ہیں (افسوس ہے کہ کلیات میں کہیں وہ قطعہ نہ ملا) کہ لوگ مجھ میں اور حالی میں فرق دریافت کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کہاں وہ آفتاب۔ آخری مصرعہ کا آخری ٹکڑا ہے" وہ یخنی میں شراب"

میں اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سے اس سیلاب کے روکنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی تھی۔ اردو میں بھی اس کا ایک آدھ ترجمہ درگیش نندنی وغیرہ کے نام سے آچکا ہے۔ بنکم نے اپنا حربہ نثر کی شمشیرِ عریاں کو رکھا تھا۔ اکبر نے اس کے بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا۔ بنکم کی تلوار کا کاٹ سب نے دیکھا، اکبر کا نشتر عموماً زیر آستیں رہا۔

جدید تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا مظہر آزادیٔ نسواں ہے، اس شاندار لفظ کے عقب میں حقیقت عریاں، بے پردگی، بے حجابی، و بے عصمتی کی ہے۔ اکبر کے ترکش کے اکثر تیروں کا ہدف یہی ہے۔

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے۔ وہاں شوہر سے بھی حمیت و غیرت سلب ہو جاتی ہے۔ اکبر کے نگارخانے میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پر آویزاں ملے گا ؎

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب اُن کو نہیں آتا، انہیں غصہ نہیں آتا

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس کثرت سے دائر ہوتے رہتے ہیں، اور شہادتوں میں جیسے جیسے حیاسوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے وہ وہاں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں، اور "صاحب" کے قدموں کے طفیل ہندوستان بھی ان برکتوں سے مستفید ہو چلا ہے۔ اب یہاں بھی ایسے واقعات الشاذ کالمعدوم کے حکم میں نہیں رہے ہیں۔ لیکن یہاں ابھی احساس حمیت و غیرت بہرحال کچھ نہ کچھ زندہ ہے، اس لئے واقعہ ہو چکنے کے بعد حسرتیں بھی ہوتی رہتی ہیں، اور ندامتیں بھی۔ یہ کیفیت اکبر کی زبان سے سنیئے ؎

کیا گزری جو اک پردہ کے عدو دوروکے پولس سے کہتے تھے

عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، بیوی بھی گئی، زیور بھی گیا

اس غزل کے چند اور شعر بھی ہیں، درد و عبرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے - بہت بے محل نہ ہوگا اگر انھیں بھی اسی سلسلہ میں سن لیا جائے ؎

اکبر نہ تھا بت خانہ میں، زحمت بھی ہوئی اور زر بھی گیا

کچھ نام خدا سے انس بھی تھا - کچھ ظلم بتاں سے ڈر بھی گیا

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر

اک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا، اور مر بھی گیا

کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل

افسوس کہ بت بھی ہم سے چھٹے اور چھوٹ خدا کا گھر بھی گیا

جو گورِ غریباں تھا خوشیوں سے اُس قصر پہ کل میں رویا بہت

کوئی متنفس تھا نہ وہاں، اندر بھی پھرا، باہر بھی گیا

آخری شعر میں شاعر جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے - اکبر دنیوی حیثیت سے بھی ایک خاصے بڑے آدمی تھے - وطن (الہ آباد) میں عشرت منزل کے نام سے کوٹھی بنوائی (اپنے صاحبزادہ کے نام پر)، ایک زمانہ میں وہ واقعی عشرت منزل ہی تھی - دعوتیں جلسے، اسپیچیں، شعر و سخن چہل پہل، فرنیچر اور سامان آرائش وغیرہ - آخر زمانہ میں حالت اس کے ٹھیک برعکس - پہلے محبوب بیوی نے داغ مفارقت دیا، پھر نوجوان محبوب بیٹا رخصت ہوا - جج صاحب کی پنشن ہوئی - آنکھیں خراب ہوئیں، صحت نے جواب دیا - بڑے صاحبزادے پردیس میں ملازم - مکان سنسان، پائیں باغ ویران، سامان آرائش و نمائش غائب - ہر طرف سناٹا چھایا ہوا - متوحش

کا عالم، ایک حضرت اکبر، خود، ایک مرد ملازم، ایک بوڑھی ماما۔ بس کُل اتنی آبادی۔

خیر، یہ ایک جملہ معترضہ آگیا تھا۔ اب پھر پہلے شعر کیا گزری جو اس کو دہرا کر آگے چلیے۔

ایک جگہ بے پردگی اور تعلیم نسواں کو لازم و ملزوم بتاتے ہیں، اور دو مختلف مفہوموں (پردہ اٹھنے اور تعظیم کے لئے اٹھنے) کے لئے لفظ اٹھنے کے اشتراک سے کیا خوب شاعرانہ استدلال کا کام لیتے ہیں ؎

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو — پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

تخیل تو شاعرانہ لیکن اس واقعیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے، کہ پردہ شکنی کی حمایت میں سب سے بڑی دلیل یہی، کہ پردہ کی چار دیواری کے اندر رہ کر علم کی تازہ ہوا نصیب ہونا ممکن کہاں ہے، اور "علم و تعلیم" کے جو معنی اس گروہ کے ذہن میں ہیں، اُن کے لحاظ سے یہ قول ہے بھی بالکل بجا۔

ہمارے ہاں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ شرع سے واقف ہے، خانہ داری کے طور طریقے سیکھے، کہ آگے چل کر اسے گھر کی ملکہ بننا ہے۔ بچپن میں والدین کی اطاعت، اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانۂ جنت خیال کرے۔ خانگی شیرازہ اس کی ذات سے بندھا ہوا ہے۔ خاندان کی مسرتیں اس کے دم سے قائم رہیں۔ صحیح معنی میں "اہل خانہ" ثابت ہو۔ اولاد کو تربیت کے بہترین راستہ پر ڈال سکے۔ شوہر کی عزت و محبت، بڑوں کی تعظیم و خدمتگذاری اور چھوٹوں کے الفت و شفقت کے جذبات لے کر دنیا میں آنکھ کھولے اور انہیں جذبات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔ فرنگیوں کے یہاں عورت کی عزت کا معیار ہی کچھ دوسرا ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لئے باعث توہین ہے، موجب تحقیر ہے۔ ان کی فرہنگ میں

ادب و تعظیم، اطاعت و خدمت گذاری مرادف ہیں محکومی کے، غلامی کے۔ اُن کا قول کہ عورت اپنے کو چھپانے کے لئے نہیں، دکھانے کے لئے آئی ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ جب دیکھئے گھر ہی کے اندر، شوہر کے، یا ساس نند کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے۔ وہ عورت ہی کیا جس کے حسن گفتار حسن رفتار، حسن صورت، زیب زینت، خوش لباسی، گلے بازی، رقاصی، کے چرچے "سوسائٹی" میں عام نہ ہوں، اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں۔ اس کا نام زبانوں پر لذت کے ساتھ آئے، اس کا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کردے، اور اس کا تصور دلوں میں شوق۔ بہترین عورت وہ نہیں جو بہترین بیوی ہو یا بہترین ماں۔ بلکہ وہ ہے جس کی ذات، دوست احباب کی خوش وقتیوں کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو، اور ایسی ہو کہ اس کی رعنائی و دلربائی کے نقش ثبت ہوں، کلب کے درودیوار پر، پارک کے سبزہ زار پر، ہوٹل کے کوچ اور صوفے پر۔

"ہمارے" اور "اُن کے" تخیل کے اس بُعد المشرقین کو اقلیم لفظ و معنی کا یہ تاجدار دو لفظوں میں جس جامعیت اور حسن بلاغت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے، یہ اس کا حصہ تھا ؎

حامدہ چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بیگانہ تھی

اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

"چمکی" میں وہ بے پناہ بلاغت ہے کہ سننے والا لوٹ لوٹ جائے۔ یہ "چمک" مخصوص ہے "نئی روشنی" کی چمنیوں کے ساتھ بڑے فانوسوں میں، ڈیوٹ والے چراغوں میں چمک دمک بھلا کہاں! شرم و حیا سے آزادی، دنیا کی دلستانی کے لئے ناز و انداز، قابلیت کے جوہر کی جِلا، یہ سب کچھ اس ننھے سے لفظ "چمکی" سے ظاہر و آشکار، اور پھر "شمع انجمن" اور "چراغ خانہ" کی مثال کس قدر روشن، کیسی ضیا بار! تشبیہہ کی تشبیہہ اور پھبتی کی پھبتی! شعر کیا ہے بیسویں صدی کی "کالج گرل" کی قد آدم تصویر۔

حسن و ناز کی دُنیا میں قابل داد اب تک کم سخنی، کم گوئی وبلے زبانی تھی، مشرقی شوہر "چاند سی دُلہن" بیاہ کر اسلئے لاتا تھا کہ وہ اسے اپنے اندھیرے گھر کا چراغ بنائے، اور تخیل "خانہ آبادی" کا غالب رہتا۔ اب جو جاگ کر دیکھتے ہیں تو محفل کے طور ہی کچھ اور ہیں، نقشہ ہی بدلا ہوا۔ ٹھاٹھ بزم آرائی کے جمے ہوئے حجاب کی جگہ بے حجابی۔ سکوت کی جگہ طوفانِ تکلم۔ مستوری کی جگہ نمائش۔ عاشق بیچارہ، اس کایا پلٹ پر ونگ حیران، گم صم۔ کل تک جو نقش تصویر تھا، وہ آج گرا موفون نظر آرہا ہے ؎

خامشی کا نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق

اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

شان سالق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں

بت جو تھے دیر میں، ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھا مصرعہ، اپنی لطافت کے، بلاغت کے، جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب بس آپ! تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب رہنمائی کر رہا ہے کہ۔ جو کچھ ہوا ہے قدرتی نتیجہ ہے تغیر ماحول کا۔ جب فضا میں آسائش کی جگہ آرائش نے لے لی، راحت پر لذت مقدم ہوگئی۔ مردوں کا مطمح نظر بجائے تسکین قلب کے ہیجان نفس قرار پا گیا، تو قدرتاً عورت نے بھی اپنی محبوبیت کے انداز بدل دیئے۔۔ مردوں کے دل میں جگہ پانے کے طریقے بھی اب دوسرے ہوگئے۔

اکبر کے اس مرقع کا ایک اور منظر ؎

اعزاز بڑھ گیا ہے۔ آرام گھٹ گیا ہے   خدمت میں ہے وہ لیزی[1] اور ناچنے کو ریڈی[2]

---

[1] سست کاہل (LAZY)   [2] آمادہ، تیار، مستعد (READY)

تعلیم کی خرابی سے ہوگئی ہر بالآخر شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی

"شوہر پرست بیوی" اور "پبلک پسند لیڈی" ان دو لفظوں کے کوزہ میں کیسا مشرق و مغرب کا سمندر سمو دیا ہے۔ مشرق کا منتہائے نظر تو خدمت کا تھا، زچہ خانہ اور باورچی خانہ کا۔ اور مغرب کے ہاں ناچ کلب، بال روم اور کنسرٹ کا۔ اور عورت غریب بھی کرے کیا۔ نظام تعلیم بھی اسی ڈھنگ کا ہے۔ شروع سے سکھایا یہی جاتا، دل میں بٹھایا یہی جاتا ہے۔

آج یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے ماہرین نفسیات (سائیکالوجی) و حیاتیات بشری (ہیومن بیالوجی) کہہ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں، کہ دونوں صنفوں کے درمیان کشش جنسی بالکل طبعی ہے۔ دونوں جب باہم ملیں گے، اور کوئی امر مانع موجود ہوگا نہیں، تو آگ کا دفعتاً بھڑک اٹھنا اس بجلی کا اکبارگی رگڑ سے پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔ شریعت اسلام نے اس گہری اور بنیادی حقیقت کے پیش نظر، بدکاری کے نفس عمل کو ہی حرام نہیں قرار دیا، بلکہ اس منزل تک پہنچنے کی جتنی راہیں ہیں، ان پر بھی پہرے بٹھا دیئے۔ گویا دشمن کی پوری "ناکہ بندی" کر دی۔ بانس ہی نہ ملے گا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔ بیگانہ عورت و مرد کو اختلاط کے جب موقع ہی نہ ملیں گے تو پینگ بڑھنے ہی کہاں پائیں گے۔ بالکل یکجائی کو چھوڑ کر، باقی آگے بڑھ کر مشترک پڑھنا لکھنا حرام، مشترک کھیل کود حرام۔ بلا ضرورت یکجائی ناجائز، تاک جھانک حرام، تاکہ سوسائٹی میں، مفاسد کا زہر سرے سے پھیلنے ہی نہ پائے معاشرت ہمیشہ بے داغ رہے۔ تعلیم جدید نے، تہذیب جدید نے، ان میں سے ایک ایک بند کو توڑا، نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا، آزادیاں بڑھیں، بے حیائیاں آئیں، بے حجابیاں دلیل ترقی بنیں۔ جو باتیں کل تک اَن ہونی تھیں آج ہو کر، گذر رہی ہیں، بھولے بھالے لوگوں نے کہا، کہ محافظ عصمت یہ تعلیم ہوگی نہ۔" سبحان اللہ! زنگی کا نام اگر کافور رکھ دیا گیا تو گویا چہرہ

کی سیاہی بھی دور ہو جائے گی! توقع لٹیروں سے پہرہ داروں کے کام کی کی جانے لگی! ــــــ اب تو مثالیں کوئی کہاں تک گن سکتا ہے۔ لیکن اکبر کے زمانے میں بھی فرانس کی میڈیم ڈی اسٹیل[1] اور انگلستان کی جارج ایلیٹ[2] کی سی ہستیاں خاص نہیں تھیں۔

اکبر کے توسط سے ایک مختصر سا مکالمہ، ایک صاحب اور صاحبہ کے درمیان سُنیئے ؎

بس بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ — علمی مباحثہ ہوں ذرا پاس آ کے لیٹ

دونوں نے پاس کر لئے ہیں سخت امتحان — ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگمان

بولی یہ سچ ہے، علم بڑھا اور جہل گھٹ گیا — لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

یہ سب سچ، لیکن پھر بھی یہ کہتے اور سوچتے ہیں کہ حیا و حجاب کے قیود و احکام تو مسلمان عورت کے لئے ہیں، جب دین ہی سرے سے غائب ہو گیا تو اب اس اخلاقی جکڑ بند سے آخر حاصل کیا؟ پردہ تو لفافہ ناموس کیلئے ہے جب ناموس ہی نہیں تو اس کی بقا کیسی؟ کھانا پینا زندہ جسم کی ضرورت کے لئے ہے۔ لیکن جب زندگی ہی رخصت ہو چکی، تو مُردہ کو کوئی نہیں کھلاتا پلاتا۔ صندوق میں قفل اس وقت تک پڑے رہتے ہیں، جب تک اس میں قیمتی مال محفوظ ہے، لیکن جب خالی ہو گیا تو اب اس کی حفاظت خود ایک دردِ سر ہے۔ پھولوں کی قدر جب ہی تک ہے، جب تک وہ تازہ و شاداب ہیں۔ باسی سوکھے، مرجھائے پھولوں کو گلے کا ہار بنانا کوئی کیوں پسند کرنے لگا؛

فرماتے ہیں ؎

---

[1] فرانس کی مشہور ادیبہ اخلاق کے قانون سے آزاد۔

[2] انگلستان کی مشہور ناول نویس، مردانہ نام رکھنے والی خاتون۔ ایک اہلِ قلم مرد، جارج ہنری لوئیس کے ساتھ مدتوں بے نکاحی بیوی کی طرح بسر کی۔

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید
بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے
نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ!
شمعِ خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

چوتھے مصرعہ کی تشبیہ اکبر ہی کا حصہ تھا۔

خاتونِ مشرق کو مغربی میم بنا دینے کا اب تک نتیجہ کیا نکلا ہے؟ خود مردوں ہی نے شیکسپیر وملٹن کی ورق گردانی اور مِل واسپنسر پر دماغ سوزی کر کے اب تک دنیا بلکہ ہندوستان ہی کی محدود دنیا میں کون سے خاص امتیازات حاصل کر لئے ہیں؟

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار
کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

خیر یہاں ذکر مردوں کی نہیں، عورتوں کی تعلیم کا ہے۔ مرد جس طرح پڑھ پڑھ کر، بڑھ بڑھ کر، "صاحب" کے بیرے بنتے گئے۔ صاحبیت میں ضم ہوتے گئے۔ اپنوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے اسی طرح عورتیں بھی بڑھ بڑھ کر میم صاحبیت میں گم ہوتی گئیں۔ ہاتھ سے نکلتی گئیں۔ کلیات اول میں ان کا قدیم ترین کلام ہے۔ اس حقیقت کو اس دور میں ظرافت کی کشتی میں لگا کر پیش کرتے ہیں ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں | گھٹا کی دولت اچھی ہیں بڑھا کیں
رہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن! | وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

کلیات سوم میں اس مرقع میں آب ورنگ ذرا اور زیادہ بھر دیتے ہیں ؎

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا | اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
کچھ جوڑ تو ان میں کے ہیں بال میں رقصاں | باقی جو تھے، گھر ان کا تھا افلاس کا مارا

بی بی زہرا ہیں جب تو میاں بن بھی گئے چلارا ‏ ‏ ‏ ‏ بہرا وہ بنا کسپ ہیں، یہ بن گئیں آیا!

آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا ‏ ‏ ‏ ‏ دونوں جو کبھی ملتے ہیں، گاتے ہیں یہ مصرع

خیال نہ گذرے کہ اکبر سرے سے تعلیم نسواں ہی کے مخالف تھے، اور لڑکیوں کے بالکل ہی ناخواندہ رکھنے کے حامی۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی و ہمدرد یقیناً تھے۔ لیکن تعلیم تعلیم میں بھی تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ تائید میں اس تعلیم کے تھے جو قوم میں نمونہ رابعہ بصریہ کے نہ سہی، دورِ مغلیہ کی جہاں آرا بیگم کے پیدا کرے۔ نہ اس تعلیم کے جو زینت ہو ہر آپیرا ہاؤس کی، ہر پکچر پیلیس کی۔ اس تعلیم کو وہ رحمت نہیں، خدائی قہر سمجھتے تھے، جس پر بنیادیں تعمیر ہوں، ہالی وڈ[1] کی۔ وہ آرزومند تھے اس نظام تعلیم کے، جو مہربان مائیں، وفا سرشت بیویاں اور اطاعت شعار لڑکیاں پیدا کرے، نہ اس کے جو تھیٹر میں ایکٹری اور برہنہ رقاصی کے کمالات کی جانب لے جائے[2]۔ وہ ملک میں حوریں پیدا کرنا چاہتے تھے کہ دنیا نمونۂ جنت بن جائے۔ پریوں کے مشتاق نہ تھے کہ ملک کا ملک راجہ اندر کا اکھاڑہ ہو کر رہ جائے۔ اُن کا قول تھا ؎

---

[1] Hollywood امریکہ کا مشہور شہر۔ فلمی دنیا کا کہنا چاہیے کہ دارالسلطنت۔ ہزارہا کی آبادی، روزانہ فلم سازی کی مختلف شاخوں، محکموں میں سرگرم رہتی ہے۔

[2] ۱۹۱۲ء کے آخر کا ذکر ہے کہ ایک برطانوی "مس صاحبہ" ماڈ ایلن (Maude Allan) نامی مشہور "آرٹسٹ" ہندوستان تشریف لائیں۔ بڑی دھوم دھام کے ساتھ انگریزی اخبارات روز ہی اُن کے تذکروں اور کارناموں سے بھرے رہتے تھے۔ آپ کا آرٹ "ناچ" تھا، ایک خاص ناچ کے وقت جسم پر ہلکا باریک سا لباس، غالباً موتی کی لڑیوں کا رہتا تھا۔ نیم برہنہ تو خیر شروع ہی سے رہتی تھیں۔ رقص جب شباب پر پہنچتا تو گردش اس تیزی کی کرتیں کہ گویا جسم میں کوئی کمانی لگی ہوئی ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۱۱ پر

دو شوہر و اطفال کی خاطر اسے تعلیم　　قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مزید توضیح دیتے ہیں ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر　　خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں اُن کے منتظم！　　اُستاد ایسے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں

"اُستاد جی" آپ سمجھے، محاورۂ لکھنؤ میں ارباب نشاط کے "تعلیم" دینے والوں کو کہتے ہیں۔ خود لفظ "تعلیم" بھی لکھنؤ کی زبان میں اس خاص معنی میں مستعمل ہے) ایک طویل نظم میں اپنا پورا مسلک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے (صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۲) چند شعروں سے اندازہ کیجئے ؎

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے　　لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

معاشرت میں سراسر فتور ہے　　اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے

لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت　　جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت

آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت　　ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت

ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ　　شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

لباس کی لڑیاں ایک ایک کر کے ہوا میں اڑنے لگتیں۔ یہاں تک کہ جسم پر ایک تار بھی باقی نہ رہ جاتا۔ گو یہ ضرور ہے کہ گردش رقص اس تسلسل تیزی کے ساتھ ہوتی کہ دیکھنے والے کی نظر کا جمنا ناممکن تھا۔ اور یہی آپ کے آرٹ کا کمال تھا۔ حضرت اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے تحریر فرمایا کہ "مس ماڈ ایلین آئی ہوئی ہیں۔ سنا ہے کہ برہنہ ہو کر اسطرح ناچتی ہیں کہ شائقین صائمین کو وجد آجاتا ہے۔" یہ ذکر دسمبر ۱۹۱۳ء کا ہے، اسوقت تک یہ کمالات بہرحال بعض پیشہ ور بیسواؤں ہی تک محدود تھے۔ اور اب؛ حدیث نبویہ میں جو الکاسیات العاریات آیا ہے یعنی لباس پوش مگر برہنہ اسکی صحیح تفسیر اس دور سے قبل کیونکر کسی کی سمجھ میں آسکتی تھی！

عصیاں سے محترز ہو، خدا سے ڈرا کرے   اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دُعا کرے

آگے حساب کتاب، نوشت و خواند، اصول حفظ صحت، کھانا پکانے، کپڑے سینے، وغیرہ کو

درسِ نسوانی کا لازمی نصاب بتا کر آخر میں فرماتے ہیں ؎

دانا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے
دُنیا میں لذّتیں ہیں، نمائش ہے، شان ہے
ان کی طلب میں، حرص میں سارا جہان ہے
اکبرؔ سے یہ سُنو کہ جو اس کا بیان ہے
دُنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب
آج اس کا خوشنما ہے، مگر ہو گا کل خراب

عجب دقیانوسی خیال کے تھے! آخر تک "آج" اور "کل" کے چکر میں پڑے ہوئے ہے۔ "آج" تو خیر آج ہی ہے۔ یہ "کل" آخر کیا بلا ہے! خواہ مخواہ ہر عیش کو منغّص کر دینے والا! فرماتے جائیے، یہ سب کچھ تھے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانے ہوئے، سمجھے ہوئے تھے، کہ رفتارِ زمانہ کا رُخ پھیرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، انبیاء تک کو یہ قدرت نہیں۔ مشیت تکوینی ہر صورت میں اپنا چکر، اپنا دورہ پورا کر کے رہتی ہے۔ ہودؑ و صالحؑ کی نصیحت کس نے سُنی؟ یحییٰؑ و عیسیٰؑ پر کتنے ایمان لائے؟ یونسؑ و لوطؑ کی تصدیق کتنوں نے کی؟ بے چارے ہر

دور میں طعنے ہی سنا کئے، شاعر ہونے، ساحر ہونے، مجنوں ہونے کے۔ آج کی اصطلاح میں VISIONERY ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد ہی عذاب الٰہی کے زلزلہ نے یک بیک، دہر پکڑا ہو۔ اور مایۂ ناز نظام تہذیب و تمدن کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دیں ہوں۔ زار روس کی جباریت و شہنشاہیت مطلقہ کا چشم زدن میں مٹ کر رہنا، اس غیبی گرفت کی تازہ چشم دید مثال ہے۔ اور پھر اس سے بھی بڑھ چڑھ کر یورپ کی پہلی مہابھارت، اور یہ دوسری مہابھارت، ان سطروں کی تحریر کے وقت تک ناتمام۔

حضرت اکبر بھی اپنے مشن کی کامیابی سے مایوس تھے اور بار ہا اس کا اظہار فرمایا ہے کلیات دوم میں ایک قطعہ میں آزادیٔ نسواں کے مستقبل کا مرقع کھینچتے ہیں، حسب معمول دلکش فرماتے ہیں کہ ضبط نفس، اور تقویٰ و ایمان رکھنے والے تو گذر گئے۔ اب دور دورہ ہے۔ صاحب کے قائم کیئے ہوئے کالج کے نوجوانوں کا ـــ

اُٹھ گئے وہ جنہیں مقدور تھا خودداری کا

نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم، نہ وہ دل کی اُمید

ولولے کے نکلنے لگے کالج سے جواں

شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

کرکٹ فیلڈ ان کی مسجد، تھیٹر اُن کی عید گاہ۔ اس تمدن کے لازمی نتیجہ کے طور پر ـــ

بحث میں آہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب

دورِ گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

عورتوں کو "حقوق" سیاسی حقوق مل گئے۔ "مطالبات" منظور ہو گئے۔ کام وہ مردوں کے دوش بدوش کرنے لگیں ہے ـــ زہرہ ممبر ہوئیں، وو ٹر تھیں جناب خورشید

کچھ پرانے بڈھے ٹھڈے زندہ تھے، ڈرے ہوئے سہمے ہوئے، بولے کہ گل کھلانے کے لئے صاحبزادے کچھ کم تھے، جواب صاحبزادیوں کو بھی اس میدان میں لایا جارہا ہے ؎

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار

کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

روشن خیال دنیا کی لعنتوں، متمدن دنیا کی ملامتوں کی بجلیاں، ان دقیانوسیوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں ؏ نعرۂ تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

اور تو اور، گھرانوں کی کنواریاں، المومنات الغافلات نہیں، شوخ و بیباک بھلی کھائی ہوئی ؏ لڑکیاں بول اٹھیں خود بہ طریق تائید

دولہا بھائی کی تو ہے رائے نہایت عمدہ

ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ ہوا ہے، بیت الغزل، سارے قطعہ کی جان ؎

خود تو کٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہو

ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

شیخ بیچارہ اس حملہ کی تاب کہاں سے لاتا، بھاگ کر حجرہ میں پناہ لی، اگندمی اندر سے چڑھا لی ؎

اکبر افسردہ شد از گرمی ایں طرز سخن

شیخ بگریخت و در صومعہ خویش خزید

تجدید کی جے، تالیوں کی گونج میں پکار رہی گئی، اور آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں دونوں نے مل کر حصولِ آزادی کی مبارکباد گائی ؎

کھُل گیا دَر، نہ رہا شاہدِ مشرق کو حجاب
غُل مچا ہر سُو کہ بول اُٹھے یہ مغرب کے مُرید
للّٰہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

ایک پُرانی غزل میں بھی مضمون اس آزادیٔ نسواں کا آگیا ہے ؎

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک
بنے رہو گے تم اس مُلک میں میاں کب تک
جو مُنہ دکھائی کی رسم پر مُصر ابلیس
تو مُنہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک

مقطع میں انجام کی پیشین گوئی ہے ؎

سُنا ہے حضرتِ اکبر ہیں حامیٔ پردہ
مگر وہ کب تک اور اُن کی رُباعیاں کب تک

اسلامی نظامِ تہذیب کے جوہرِ لطیف یہی عصمت و عفت، شرم و حیا کے جذبات ہیں، اور فرنگیت کی زد بھی سب سے پہلے اخلاق کے انہیں ستونوں پر پڑتی ہے، اسلئے قدرۃً اکبر نے بھی طبع آزمائی اس موضوع پر بہت زائد کی ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی مغربیت و فرنگیت کے جو نمایاں مظاہر ہیں، اُنھوں نے تقریباً ان سبھی پر کم و بیش توجہ کی ہے۔ عبرت پذیری اُن کے قلب کا، اور عبرت آموزی اُن کے قلم کا جوہر ہے۔ اس ایک قوت کے سہارے، ہر تختۂ زمین میں نئے نئے شگوفے کھلاتے ہیں اور ہر ریگستان کو لالہ زار بنائے چلے جاتے ہیں۔

کمیٹی سازی اور جلسہ بازی کے مشغلوں میں پڑ کر دین کی طلب اور رُوح کے تعلق کے ضُعف

کا عکس ذرا اکبر کے جامِ جم میں ملاحظہ ہو ؎

جن پہ ہر گام پہ اک دامِ بلا ہے در پیش!

نفس کو تو انہیں باتوں میں مزا آتا ہے

اس کمیٹی میں نہیں رُوح کی لذت کا خیال

ممبر اٹھ جاتے ہیں جب ذکر خدا آتا ہے

خالص دوستی، بے غرضانہ محبت، کے لفظ سیاسیات حال کے لغت میں بے معنی ہیں۔ ہندو اگر اتحاد کا ہاتھ مسلمانوں کی طرف بڑھا رہا ہے تو صرف اس لئے کہ دونوں مل کر انگریز سے مقابلہ کریں۔ انگلستان اگر روس سے لگاوٹ کر رہا ہے، تو محض اس غرض سے کہ جرمنی سے لڑنے کے لئے ایک زبردست حلیف ہاتھ آجائے۔ خود مطلبی کا نام مہذبوں کی اصطلاح میں ڈپلومیسی ہے دِل سے نہ یہ اُن کا شریک، نہ وہ اُن کا دلوں میں زہر کے انگارے بھرے ہوتے، لبوں پر میٹھے بول۔ اسلام کے شاعر کو عبرت کا یہ منظر دیکھ، اپنے ہاں کا بھولا اور بھلایا ہوا سبق الحب للّٰہ والبغض للّٰہ کا یاد آجاتا ہے، اور اس کے منہ سے یہ نالۂ موزوں نکلتا ہے ؎

اب تو یاری کا اسی پر رہ گیا ہے انحصار!

جس کا تو حاسد ہے اُس کا جو ہو حاسد، تیرا یار

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

جنگ جب تک تھی بتوں سے نام تھا اللہ کا

اب تو ہر اک ہے مجاور اک جدا ندگاہ کا!

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

ہاں تجارت اور پالیٹکس میں دیکھیں جو سُود

چند روزہ متفق ہوں، ورنہ اے شیخ و ہنود

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

۱۸-۱۹۱۷ء کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے اخباری میدان میں بحث طریقت و شریعت کے درمیان چھڑ گئی۔ شریعت کا جھنڈا لاہور میں دفتر زمیندار سے بلند ہوا۔ طریقت والوں نے دہلی کی ایک خانقاہ میں پناہ لے۔ یہیں سے ضربیں لگانا شروع کیں۔ اور جب دیکھا کہ حریف کی گولہ باری بے پناہ ہے، تو جٹ حکومت سے درخواست مداخلت کر دی۔ اکبر نے عین اس وقت جبکہ اشتعال جذبات کا شباب تھا مصلحت شناسی، و مصالحت جوئی کے چھینٹے ڈالنے شروع کئے۔ آگ اپنے وقت پر بہر حال بجھتی ہی، (اور مدت ہوئی کہ اب اسکی خاکستر بھی باقی نہیں) البتہ اکبر کے چشمۂ اصلاح کے وہ قطرے یادگار رہ گئے۔ وہ کبھی ان شاء اللہ خشک نہ ہوں گے۔ پوری نظم ذرا طویل ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو ؎

اس وقت مولویت صوفیت سے بھڑ گئی ہے

اغیار کو ہو مژدہ، آپس میں چھڑ گئی ہے

ملا کو زعم ہے یہ دانم چرا نگویم!

صوفی کو یہ کہ دارم پائے چرا نہ پوئم

ملا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو!

صوفی کہا ہے اشارہ، میرا پیالہ دیکھو

ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے بڑھیئے!

صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھیئے!

کہتے ہیں کر رہے ہیں ہم یہ رفتار میشن
دیکھا نہیں تھا، لیکن مُردوں پر آپریشن!

اس وقت کیا تمہاری یہ خوش خیالیاں ہیں
آپس کی گالیاں ہیں، غیروں کی تالیاں ہیں!

شیعہ ہوں خواہ سُنی، مُلّا ہوں خواہ صوفی!
بے سود جنگِ باہم ہے سخت بے وقوفی

دیکھ ذرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے
موقوف کب یہ حالت آپس کے شور پر ہے

وقت نزع باہم ہرگز نہیں ہے یارو
اللہ کو پکارو، اللہ کو پکارو!

سب سے گہرا دام لفظ "ترقی" ہی ہے مغرب کا ہر عیب آج ہماری نظر میں ہنر ہے۔ اس کی ہر بد روئی ہماری آنکھ میں حسن ہے، اگر ہم عیب کو عیب ہی سمجھ لیں، جب بھی کوئی صورت تو اس سے بچنے کی بھی نکالیں، سوچیں لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ معائب کو مناقب نقائص کو کمالات، سمجھ رہے ہیں، اور زہر کو تریاق کے درجہ میں رکھ رہے ہیں۔ "ترقی"، "تہذیب" "شائستگی"۔ "ارتقا"۔ "روشن خیالی" وغیرہ چند الفاظ کان میں پڑ گئے ہیں۔ الٹ پلٹ کر یہی ہماری زبان پر آرہے ہیں، یہی ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔ شوق انہیں مقصدوں کی تحصیل کا، ارمان انہیں مقصدوں کی تکمیل کا۔ داد دیجئے، فرشتوں کے مشہور معلم کی ذہانت کی، شکار کو پھانسنے کے لئے کیا افسون کانوں میں پھونک گیا ہے۔

شیطان نے ترکیب تنزل کی نکالی ان لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو

شکاریوں کا بیان ہے کہ جب شیر کا شکار منظور ہوتا ہے تو درختوں میں بھینسے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ شیر ان کی خوشبو پا، انہیں نوش جاں کرنے جلدی جلدی لپکتا ہوا، جھپٹتا ہوا آتا ہے، اور شکار کرنے کے عوض خود ہی شکار ہو جاتا ہے۔ شاعر اس تشبیہ کو بھی اپنے کام میں لاتا ہے ؎

شیرانِ شرق کا انہیں منظور ہے شکار

بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

حقوق سیاسی کی توسیع پر مسرور ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ اب ہمارے نمائندے اِتنوں کے بجائے اِتنے ہوگئے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس طرزِ انتخاب نے خود ہماری جماعت کے اندر کیسی پھوٹ پیدا کر دی ہے، باہمی رشک و حسد، بدگمانی و نفسانیت، خود غرضی، و نااتفاقی میں کتنی ترقی دے دی، اور طرح طرح کے ناجائز لالچوں، ترغیبوں کا دامن ہمارے نفس کے لئے کتنا وسیع کر دیا ہے۔ عذابِ عقبیٰ کو چھوڑیئے، یہ عذابِ دنیوی اپنے ہاتھوں مول لیا ہوا کچھ کم ہے! ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے

خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کیا کم ہے

یہی راگ ایک دوسری دھن میں سنیئے ؎

قوم کے دِل میں کھوٹ ہے پیدا	اچھے اچھے ہیں ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ	سمجھیں اس کو فرضِ کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی	سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر[1] کی	ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

---

[1] لفظ "سر" کا تلفظ لکھنؤ اور دہلی دونوں کی بول چال کی زبان میں "سِر" (بالکسر) ہے نہ کہ "سَر" (بالفتح)

اس جدید نظام اخلاق کو تعلق نہ والدین کی خدمت وتعظیم سے، نہ بزرگوں کی بزرگداشت سے، نہ اللہ و رسول کے احکام وحقوق سے۔ فضا ہی ایسی تیار ہو گئی ہے، ماحول ہی ایسا بن گیا ہے ؎

باپ ماں سے شیخ سے، اللہ سے، کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

یہ شاعری شاعری نہیں، حقیقت کی ترجمانی ہے۔

آخرت کا خیال جانے دیجئے۔ یہ ارشاد ہو کہ تہذیب جدید نے اس دنیا کی زیست کی سہولتیں کہاں تک پیدا کی ہیں؟ جینا آسان کر دیا ہے یا اور مشکل؟ جنگ، ہلاکت غارت گری وسفاکی کے وہ حیرت انگیز آلات ووسائل، جو چنگیز و ہلاکو کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے، کس کے ایجاد کئے ہوئے ہیں؟ موٹر، موٹر سائیکل، ریل، لاری، ٹریم، کے روزانہ ناگہانی حادثوں نے ہر بڑے اور متمدن شہر میں موت وہلاکت کا اوسط کچھ گھٹا دیا ہے یا اور بڑھا دیا ہے؟ روزمرہ کی ضروریات زندگی کی اس کمیابی اور اب تو نوبت نایابی تک پہنچ چکی ہے کی کوئی مثال پچھلی تاریخ میں ملے گی؟ ملوں کی بھرمار، چمنیوں کی افراط، انجنوں کی ریل پیل کے مزدوروں کی آبادی کی گنجانی، ہر وقت کی گھڑگھڑاہٹ، ہر گھڑی کے شور وہنگامہ دَم بدم کے دھوئیں نے بڑے بڑے متمدن شہروں کی صحت کا کیا حال کر دیا ہے؟ بڑے شہروں کے شہریوں میں فیصدی کتنوں کے دانت درست ہیں؟ معدے ٹھیک ہیں؟ آنکھیں عینک سے بے نیاز ہیں؟ جو سکونِ قلب، آسائش وراحت، تمدن بیگانہ دیہاتیوں کو حاصل ہے۔ اس کا کوئی حصہ بھی تمدن جدید کے پُر آشوب، ہنگامہ پرور، ہیجان آفرین، مرکزوں میں رہنے والوں کو نصیب ہوتا ہے؟ اس قسم کے سوالات کا حل اکبر کی ترجمانِ حقیقت زبان یوں پیش

کرتی ہے ؎

تہذیب تو جسے تم کہتے ہو اس سے کہہ

دُنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے؟

نقشوں کو تم نہ جانچو، خلقت سے مِل کے دیکھو

کیا ہو رہا ہے آخر، کیسی گذر رہی ہے؟

دِل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردّد

کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے؟

سُنتے آئے ہیں کہ ہر درد کی دوا علم ہے، خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے، محتاج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے، بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے۔ کہیں اور کبھی بے شک یہی ہوتا ہوگا، لیکن اپنے نصیب کو کیا کہہ کر روئیے کہ یہی تریاق زہر بن گیا ہے۔ ہمیں سابقہ جس علم سے اس دور میں پڑا ہے وہی تو امراض کا مورث ہے، مفاسد کی اصل اور بدبختیوں کا منبع ہے جسے شربت کا نام دیا گیا، وہی جام زہر نکلا۔ جسے رہبر کہہ کر پکارا گیا، وہ رہزن ثابت ہوا جس نظام کو ہم نے نام "علم" و "تعلیم" کا دے رکھا ہے، وہی تو عین جہالت ہے۔ یہ تو عین وہی "علم" ہے جس کا مقصود دلوں میں حبِ دُنیا کو اور پختہ و راسخ کرنا ہے۔ خیال عقبیٰ و آخرت کے لئے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں۔ نصابی تعلیم کا فلسفہ خدا اور رسول ؐ کے اعتقاد سے ناآشنا، اس کا سائنس مادیات کے اُوپر کچھ دیکھنے سے اندھا۔ اس کی حکمت میں جنت و دوزخ، حُور و ملک کا وجود عنقا۔ اس پڑھائی لکھائی کے نتیجے جو نکلنے تھے، نکل کر رہے۔ ان پر برہم ہونا اور ساتھ ہی اس نظام کی تائید کئے جانا، تو گویا یہ چاہنا ہے کہ آگ پیدا ہو جائے لیکن اس میں جلانے کی قوّت نہ ہو! پانی کا وجود ہو، لیکن وہ کسی شئے کو تر نہ کرسکے! آفتاب

نکل آئے، لیکن کوئی شئے اس سے متوتر نہ ہونے پائے! اکبر کی تشخیص میں یہی نظام تعلیم تو ہے
جس نے ابتری ہمارے اخلاق میں، معاشرت میں، مذہب میں، پیدا کر دکھی ہے ۔

اِک علم تو ہے ثبت بننے کا، اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اس علم کی سب دیتے ہیں سند، اُس علم میں ماہر کون کرے
جب علم ہی عاشقِ دُنیا ہو، پھر کون بتائے راہِ خُدا
جب خضر اقامت پر ہوں فدا، تائید مسافر کون کرے
سودا بھی ہے رنگِ طبع بشر، فطرت ہی میں ہیں اسبابِ جنوں
اکبر کو بھی ہوش آجائے، تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

اسی حقیقت کی ترجمانی، ایک دوسرے وزن و قافیہ میں ۔

مسٹرِ نقلی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی ۔۔۔ شرح اس کی نامناسب ہے، ملی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس ۔۔۔ چارہ کیا تھا اے خدا تعلیم ہی ایسی ملی

یہی مضمون ایک تیسری جگہ ۔

اس چیز کا کیا کہنا اکبر، تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا، ہموار کیا، اور ایک کیا

جو قوم کو ابتر کرتے ہیں، اب اُن کا اثر پر رونا ہے
معلوم نہیں کیا مطلب ہے، معلوم نہیں کیا ہونا ہے
اس کا جو سبب ہے سُن لو، سب پر وہ عیاں ہی ظاہر ہے
الفاظ صریح و واضح ہیں، یہ مطلع اکبر حاضر ہے ۔

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے فقط بازاری ہے

جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

فرماتے ہیں کہ ملّت کی شیرازہ بندی اگر مقصود ہے تو علیگڑھ اس درد کی دوا نہیں ہو سکتا۔ ملازمت اور چپراسی کے سکوں کی ٹکسالوں کا کام تو یہ قومی کالج ضرور دے سکتے ہیں۔ لیکن قوم کا قوام تو انگریزی سے نہیں۔ عربی ہی سے درست ہو سکتا ہے۔ خشک حقیقت کو ظرافت کے چٹخارہ کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں ؎

یہ بات تو کھری ہے، ہرگز نہیں ہے کھوٹی

عربی میں نظم ملّت، بی اے میں صرف روٹی

لیکن جناب لیڈر یہ شعر سُن کے بولے

بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی

اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے

کس کی نظر ہے غائر، کس کی نظر ہے موٹی

لیکن نظم ملّت و اصلاح اُمّت کی اب پرواہی کس کو ہے؟ یہ دین کا اب سوال ہی کیا؛ پیش نظر تو صرف دنیا اور اس کی ترقیاں ہیں۔ کونسل اور اسمبلی، اسکول اور کالج، جاہ و منصب، مشاہرہ و اعزاز۔ خودی کی پرستش سے اب فرصت کس کو جو خدا کی پرستش پر توجہ کرے۔ شاعر یہی منظر دیکھ کر صدا لگاتا ہے ؎

مذہب نے پکارا اے اکبر، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نظام کائنات میں اذیت و تکلیف کا وجود رکھا ہی اس غرض سے گیا ہے اس سے نفس میں شکستگی

و تفرع پیدا ہو۔ دھن بجاتے "اسباب" کے مسبب الاسباب کی پیدا ہو، مخلوق اپنے ہم جنسوں سے بے آس ہو کر خلوص و خضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرے۔ چنانچہ دنیا میں جو عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہی ہے۔ فطرتِ سلیم ایسے موقعوں پر راہ ہدایت پا جاتی ہے۔ لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں جو الٹا اثر لیتی ہے، اس کی شقاوت و قساوت کے لئے یہ تمام تازیانے بے اثر رہتے ہیں۔ ہر تازہ نشان غیبی، ہر جدید آیتِ الٰہی، ہر تنبیہہ فطرت، غفلت و جمود، الحاد و اسراض میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ جو تریاق ہونا چاہیئے تھا، وہ اس کے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہے۔ ہجوم مصائب میں بھی اسے تکیہ مادی اسباب پر، اور بھروسہ دنیوی وسائل پر رہتا ہے۔ دستِ سوال ہر بڑی کوٹھی کے مکین، ہر اونچے دفتر کے سر دفتر کے آگے، دراز ہوتا رہتا ہے۔ پیٹ کا سوال ہر عالیشان دفتر کا طواف کراتا رہتا ہے۔ ہر امیر، ہر وزیر، ہر بڑا افسر امیدوں کا مرکز، حاجتوں کا قبلہ بنا رہتا ہے۔ اللہ سے بے تعلقی مصیبتوں کے ہجوم کے وقت بجائے گھٹنے کے کچھ اور بڑھ ہی جاتی ہے۔ اکبر اپنے گرد و پیش یہ منظر دیکھ، اپنی زبان حقیقت ترجمان سے اس پر نوحہ خوانی کرتے ہیں، لیکن خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ یارانِ مجلس کو درد و عبرت کے تذکروں سے واسطہ کیا۔ یہ تو اس کے نام ہی سے وحشت کرتے ہیں۔ بزم میں قدم اس شان سے رکھتے ہیں کہ چہرہ پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوا ہے، نشاط و زندہ دلی کا ساز ہمراہ ہے، لیکن منہ سے صدائیں درد و عبرت کی نکل رہی ہیں، اور زیر لب آواز سوز و فغاں ہی کے سُروں میں آرہی ہے۔ بزم میں تماشائی زیادہ ہیں، اہلِ نظر چند۔ تماشائی یہ سوانگ[1] دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں، اور اہلِ نظر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، ایک جھلک

---

[1] حالی ۔ اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی   بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

دیکھتے چلیئے ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسمان نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیریاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ہم کو
دُعا منہ سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

فضا کی حالت یہ ہے کہ سچی بات زبان سے نکالنا مشکل، بس جو کچھ سب کہہ رہے ہیں، وہی کہے جایئے جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں، وہی کئے جایئے جس حمام میں سب ہی ننگے ہیں تو اسی میں آپ بھی بلا امل بے پردہ ہو جایئے، جب تو آپ اچھے، آپ کی باتیں اچھی، آپ کی سوسائٹی اچھی، ادھر کلمۂ حق زبان سے نکالا کہ مارے گئے، ہر طرف آوازے کسے گئے، نکالے گئے، اعزاز و عافیت کی تلاش ہے تو جو رنگ چھایا ہوا ہے، بس اسی میں چپکے سے خود بھی رنگ جایئے ؎

یہ عجب عمل، یہ عجب اثر، یہ عجیب نقش ابھرے گئے
جو بچے بہت تو بچے رہے، جو کھری کہی تو دھرے گئے
تری بزم اکبرؔ خوش بیان ہے محل فرحت دوستاں
جو ملول آئے وہ خوش گئے، جو فسردہ آئے ہرے گئے

مذہب اور اخلاق، خدا و رسولؐ، حشر و ملائکہ کو چھوڑیئے، اسوقت ڈگری حاصل کرنے، اگر بیجویٹ ہونے، ڈاکٹریٹ کی سند ہتیانے، کونسل کی ممبری اچک لینے، ملازمت میں داخل ہوجانے کی دھن میں اتنے حواس بھی کسی کے نہیں، کہ خشک عقلی و علمی بحثوں پر قوت خوض صرف کی جائے، اور اتنی فرصت کسے کہ رومی و رازی نہ سہی سعدی و طوسی کے لئے ہی وقت نکالا جائے؟ معیار تو صرف یہ ٹھہر گیا ہے کہ فلاں مطالعہ جلب زر میں، حصول جاہ میں، کہاں تک معین ہوگا؟ اور

بس۔ یہ لمبی کہانی، اکبر کی زبانی دو لفظوں میں سن لیجئے ؎

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض
سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا
بہر خدا جناب، یہ دیں ہم کو اطلاع
صاحب کا کیا جواب تھا، بابو نے کیا کہا

لڑائیاں حکومتوں کے درمیان پہلے بھی ہوئی تھیں، اب بھی ہوتی رہیں۔ البتہ پہلے ان کی بنیاد تحفظ عقائد، پاس عزت، حفظ ناموس تھی۔ گویا کوئی نہ کوئی پہلو خودداری کا لئے ہوئے۔ اب دنیا اس درجہ غالب آگئی ہے کہ یہ سب اڑ اڑا کر، جنگ کی محرک تقریباً ہر جگہ تجارتی رقابت رہ گئی ہے اور معاشی مسابقت! رلاتے ہیں ؎

مذہب کے واسطے و شرافت کے واسطے
ہے اب تو جنگ حکم و تجارت کے واسطے
لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھ کو پر بڈ پر
تیار ہو رہا تھا، میں جنت کے واسطے

کسی زمانے میں ہمیں تعلیم یہ ملی تھی کہ راہ خدا میں کچھ کرو، حتی الامکان خلق کی نظر سے پوشیدہ کر کے، اور جو کچھ بھی خیرات کرو، اس سے مقصود بس اللہ کی رضاجوئی ہو، نہ کہ بندہ پر کوئی احسان، لیکن اب حالت یہ ہے کہ چندہ بعد کو دیا جاتا ہے اور اعلان پہلے کیا جاتا ہے، جلسوں میں بھی، تالیوں کی گونج کے درمیان، اور پھر اخبارات کے ذریعہ سے بھی، بلکہ بہت سی صورتوں میں تو بس اعلان ہی اعلان، وعدہ ہی وعدہ رہتا ہے، اس سے آگے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ اور پھر اس "کار خیر" سے مقصود کیا ہوتا ہے، عموماً و بیشتر یہی نہ کہ فلاں

انجمن کی صدارت، فلاں مدرسہ کی سرپرستی ہاتھ آجائے، فلاں پارٹی یا اخبار اور رسالے تک رسائی ہو جاتے ہیں، یا پھر یہ کہ چند خان بہادری کے، آنریری مجسٹریٹی کے، نائٹ ہڈ کے، غرض کسی معزز منصب یا خطاب کی قیمت سمجھ لیا جاتے، شاعر اپنے چاروں طرف یہ سماں دیکھ کر حسرت و یاس کی لے میں پکار اٹھتا ہے ؎

کچھ دیکھتا نہیں ہیں دل زار کے لئے

جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے

ایک دوسری جگہ عبرت و حسرت کے اس گنجینہ کو شوخی و ظرافت کے دوشالہ میں ڈھانپ کر پیش کرتا ہے ؎

پھر شاہ نے پیش کمیشن کہہ دیا اظہار میں

قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں

بیبیاں اسکول میں ہیں۔ شیخ جی دربار میں

انتشارِ ملت کی اس سے صحیح تر تصویر اور کیا ہو گی؟

حمایت مذہب کے دعوے، اب بھی زبانی بہت کچھ کئے جا رہے ہیں، لیکن عموماً اس جلیل بلند بانگ کے پیچھے حقیقت کیا ہوتی ہے؟ یہی نہ کہ ذاتی مخالفتوں، مخاصمتوں کی تسکین کا موقع ہاتھ آئے اور مخالف کی رسوائی اور بدنامی جی بھر کر ہو رہے۔ مخالف اگر "وہابی" ہے تو آپ اس کی ضد میں صوفی اپنے کو کہنے لگے، اور اس کی وہابیت کو خوب خوب اچھالئے۔ حریف اگر "بدعتی" ہے تو آپ اس کے جوڑ پر اتباع سنت کے مدعی ہو جایئے، اور اس کے بدعتی ہونے کو خوب چمکایئے، خوب پھیلایئے۔ اکبر کا قلم یہ سادہ تصویر یوں پیش کرتا ہے، بلاغت کے رنگین

نقش اس پر اضافہ ہے

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے، ہاں اُس کے لئے لٹھ تان سکے

مذہب نے ہمیں پہچان لیا، ہم اس کو نہیں پہچان سکے

خدا فراموش نظامِ معیشت اور خود پرست آئینِ معاشرت کے اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ امن و عافیت کا نشان نہ رہا، انبساطِ قلب و سکونِ خاطر کے الفاظ بے معنی رہ گئے، آئینِ ہمدردی کے بجائے فلسفہ "تنازع البقا" اور "کارزارِ حیات" کا رائج ہو گیا۔ زندگی کی ضرورتیں گراں ہوتیں، بدکاریاں ارزاں ہوتیں، ہلاکتیں بڑھیں، عمریں گھٹیں، ہیجان میں بیشی، اطمینان میں کمی آئی، محبتیں مٹیں، خصومتیں اُبھریں۔ خدا فراموشی کا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے "تمدّن و تہذیب" کی اس زندگی سے عقبیٰ جیسی سنورتی ہے۔ اسے تو "کل" پہ اٹھا رکھیے۔ آج کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیا برباد ہوئی جاتی ہے۔

گلشنِ مشرق کا باغبان اپنی آنکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے، اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ سکتے، ہاں اپنے اوپر تو کسی حد تک اختیار اب بھی باقی ہے۔ زبان پر مرثیہ ہے، لب پر آہ ہے۔ آستین آنکھوں پر ہے، اسے ہٹا کر دیکھیے تو کچھ بوندیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں، ممکن ہے مستقبل کا جوہری ان موتیوں کی کچھ قیمت لگا سکے

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں

باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں

ذاتی ترقیاں ہیں، قومی ہے یا تنزل

گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں

ٹانکے وہ لگ رہے ہیں جو کر وٹوں میں ٹوٹیں

بخیئے جو فطرتی تھے، وہ اب اُدھڑ رہے ہیں

سطح زمیں سے پوچھو کیا بل رہا ہے اس کو

نظروں میں پھلجھڑی ہے گو پھول جھڑ رہے ہیں

چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی

لیکن اُمید کیا ہو جب دل اُجڑ رہے ہیں

یہ زیور معانی کس کی کرینگی زینت

لفظوں میں یہ نگینہ کیوں آپ جڑ رہے ہیں

فلسفہ کو چھوڑیئے کہ یہ تو خود ہی ظنیات و احتمالات کی بھول بھلیاں ہے سائنس کو لیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قطعیات، و یقینیات کا ہادی ہے اور سائنٹیفک ترقیاں مخصوص فیض ہیں تمدن جدید کا۔ لیکن یہ ارشاد ہو کہ یہ آلات اور نت نئی ایجادات والی ترقیوں سے دُنیا میں برکتیں زیادہ پھیلی ہیں یا لعنتیں؟ مجموعی طور سے ان سے ابتک دُنیا کے ذخیرۂ مسرت و راحت میں اضافہ ہوا ہے یا جنگ و جدال میں، قتل و غارت میں، جعل سازی اور دھوکہ بازی میں؟ ان سے تحریک و تقویت انسان کے جذبات ملکوتی کو زیادہ پہنچی ہے یا جذبات بہیمی کو؟ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات و مشاہدات محفوظ ہیں۔ آہ سرد کے ساتھ وہ "صاحب" اور "صاحب" کے لائے ہوئے سائنس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہم نے تو اپنا اخلاق، اپنا جوہر شرافت، سب آپ کی خوشی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو بیگانہ بنا لیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپ کی تشریف آوری سے اُلٹی مصیبتیں ہی بڑھ کر رہیں ؂

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں، نہ بھائی خوش ہیں، نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا، دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں

جو دیکھا سائنس کا یہ چکر، دھرم پکارا کہ اے برادر
ہمارے دور کیں تپ مگن تھے۔ تمہارے دورے ہیں پاپ خوش ہیں

مشرق و مغرب کا جو فرق ہے وہ مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ بُعد المشرقین ہے۔ جزئیات میں نہیں، کلیات میں ہے۔ فروع میں نہیں اصول میں ہے، عرض میں نہیں، جبلت و سرشت میں ہے۔ وہ مادیت میں مست ہیں، ہم روحانیت میں غرق۔ وہ تجارت و ثروت کے گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں۔ ہم صبر و قناعت کے حجرہ میں فقر کی کملی لپیٹے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا کے چپہ چپہ سے واقفیت کی دھن میں ہیں، ہمیں اپنے عرفان نفس کی کوششوں سے کہاں فرصت وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں وہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے اچھل پڑتے ہیں کہ "انسان کی اصل بندر ہے"۔ ہم بدمستی و بیہوشی میں بھی نعرہ لگاتے ہیں تو یہ کہ "انسان خدا میں گم ہے"۔ اکبرؔ اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی — مغربی میں ہے میل جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست — "فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست"

اکبرؔ نرے واعظ نہ تھے، حکیم اخلاق بھی تھے، راہِ راست کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو جانے والے نہ تھے، راستہ کی پیچیدگیوں، راہ رو کی الجھنوں سے بھی واقف تھے سالہا مسافروں

کو راہ کے پیچ و خم، منزلوں کی مشکلات کی بابت بھی ہدایتیں دیتے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہی پیچیدہ واقع ہوئے ہیں، حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا بچہ بھی آنکھ بند کرکے رٹ ڈالے۔ جذبات کی کشش ایک سمت ہوتی ہے، عاقبت اندیشی کا فتوٰی دوسری جانب۔ اور پھر خود جذبات کے اندر بھی باہمی آویزش، کشمکش۔ اکبر کہیں کہیں ان گتھیوں کو بھی سلجھاتے گئے ہیں۔ جا بجا ان کی حکیمانہ فکر و عارفانہ نظر نے اخلاق و معاشرت کے محض جزئیات ہی کو نہیں، بلکہ فلسفہ، اخلاق کے اصول کو لیا ہے، اور بنیادی مسائل کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

شباب کی بدمستیاں، وبے احتیاطیاں کس نوجوان اور پختہ عمر والے کو نہیں معلوم؛ ساتھ ہی مذہب و اخلاق کی عدالت کا فیصلہ بھی سب پر روشن ہے۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ کُل چار مصرعوں کے اندر (بھلا چار مصرعوں کی بھی کوئی لمبائی ہے؟) پہلے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، آپ ابھی اسی کو دیکھتے ہوتے ہیں کہ وہ مرض کی ایک ایک علامت بیان کرنے لگتے ہیں۔ آپ ان کی داد ابھی دینے بھی نہیں پاتے کہ چٹ پٹ وہ ایک نسخۂ شفا بھی تجویز کر ڈالتے ہیں! مکمل تشخیص اور علاج کُل چار مصرعوں میں: ؎

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی، اور نفس نے چاہا رنگ پری
شیطاں نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ برا، اور خوفِ خدا ہے اس کی دوا

دین و مذہب کی تحصیل بہتوں نے محض ایک علم یا فن کے طور پر کرنا شروع کی ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ اس کو برتیں، اسے اپنی زندگی میں نباہیں، اُسے ایک مسلکِ حیات قرار دیں۔

محض اس کے کچھ مسائل یاد کرلیتے ہیں۔ مقصود ان معلومات پر عمل کرنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانا ہوتا ہے، یا پھر دوسروں کی لت اڑکرنا۔ اکبر کا قول ہے کہ مذہب و اخلاق سے فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب کہ ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انہیں جزو زندگی بنالیا جائے، نہ یہ کہ ان کے قیل وقال سے کام محض گرمیٔ محفل کا لیا جائے۔ لیکن عمل میں ظاہر بینوں کو لذت کہاں، نفس کو لذت تو دوسروں ہی کے بتانے پڑھانے، سکھانے میں آتی ہے ؎

علم دین حاصل کیا لیکن قباحت یہ ہوئی!

صرف سکھلانے میں لذت ہی عمل میں کچھ نہیں

زلیست کا مصرعہ بنے خود آہ سوزاں ہے لطف

ورنہ اے اکبر تری نظم و غزل میں کچھ نہیں

مذہب کا بلبل چہکا لینے، مذہب کا محض نام رٹ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل شئے ایمانیات میں عقیدۂ توحید ہے، اور اعمال میں درستی اخلاق۔ جب یہ حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے جب یہ نہیں حاصل، تو کچھ بھی نہیں حاصل۔ باقی سب لفاظیاں اور اصطلاحی بولیاں ہیں ؎

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکالِ ظاہر ہیں!

جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں، بُرے جو ہیں وہ کافر ہیں

وہی ہیں پاک طینت، لو لگی ہے جن کی خالق سے

نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست، بس وہ طاہر ہیں

مذہب کی حیثیت انفرادی سے زیادہ جماعتی تھی تو پہلے بھی، لیکن اب تو کہنا چاہیے کہ یہی جماعتی حیثیت اور سب حیثیتوں پر غالب آگئی ہے۔ کوئی شخص اگر عیسائی ہے تو اس کے

معنی اب یہی رہ گئے ہیں کہ اس کا میل جول، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پہننا، عیسائیوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کے طور طریقے فرنگیوں کے سے ہوں گے، سال میں "بڑا دن" منائیے گا، خوشی کریگا کیک کھائے گا۔ ہفتہ میں اتوار کو کام کاج بند رکھے گا۔ ملنے جلنے میں رہے گا۔ عجب نہیں کہ گرجا بھی ہو جائے۔ کوئی صاحب اگر شیعہ ہیں، تو معنی یہ ہیں کہ محرم میں مجلس کریں گے عزاداری ماتم میں پیش پیش ہوں گے۔ آمد و رفت شیعوں کے ہاں رکھیں گے کوئی بزرگ اگر سُنی ہیں، تو میل جول اہلِ سنت سے رکھیں گے، مدحِ صحابہؓ کے جلسہ جلوس میں شریک ہوں گے، گھر کی ریت رسم سنیوں کی سی رکھیں گے۔ کسی شخص نے تبدیل مذہب کر دیا تو اس کے معنی اب یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی، اپنے جماعتی ماحول میں تغیر کر دیا۔ فلاں فلاں کے بجائے فلاں فلاں سے تعلقات اور رابطے بڑھ گئے۔ عقاید کا سوال بالکل دوسرا ہے۔ اس کا تعلق صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہے۔ یہاں گفتگو مذہب کے صرف ظاہری، معاشری، و مجلسی پہلو سے متعلق ہے۔ اس لئے اکبرؔ کہتے ہیں کہ معتقدات کی کرید کی حاجت دنیا کو بالکل نہیں۔ دنیا کے دیکھنے کی بات تو صرف اتنی ہے کہ وضع اور طور اعمال اور اخلاق کیسے ہیں ؎

مذہب ہے امرِ قومی، سمجھو نہ فعل ذاتی

معذور سب ہیں اس میں، گنگو ہوں یا وفاتی

شیعہ ہوں خواہ سُنی، لالہ ہوں یا برہمن!

مذہب کو مورثوں سے سب پاتے ہیں عموماً

پولٹیکل ضرورت بے شک تھی اس کی اوّل

اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل

اچھا بُرا نہ کہدو تم مذہبی بنا پر

اخلاق اس کے دیکھو ہے اصل تو یہ جوہر

تعلیم جو ہے عمدہ صحت اگر ہے اچھی

پاؤ گے اس کو اچھا، طینت اگر ہے اچھی

ناری ہے یا کہ ناجی، اس کا بیاں نہیں ہے

سوشل طریق یہ ہے، اور وہ تو راز دیں ہے

دُنیا کا قانون تکوینی کچھ ایسا رکھ دیا گیا، کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں، ایک آج ملازمت سے موقوف ہوتا، یا پنشن پر ہٹتا ہے اس کے گھر میں ماتم برپا ہوتا ہے۔ لیکن جس نے اس کی جگہ پائی۔ کوئی اس کے گھر میں دیکھے، کیسے شادیانے بجتے ہوتے ہیں۔ پُرانی آبادی ویران کر کے، محکمہ آسائش بلدہ وہاں ایک خوش نما خوش فضا پارک بنوا تا ہے۔ خلقت وہاں تفریح کے لیے اُمنڈ اُمنڈ کر جمع ہوتی ہے، اور ہر وقت ہنستی بولتی ہستیوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ لیکن ادھر بھی کبھی خیال کیا گیا ہے، کہ کتنے بھرے پُرے گھر مسمار ہو لیتے ہوں گے۔ جب جا کر یہ قطعہ زمین پارک کے لیے نکلا ہے اُن بنتے بولتے گھر والوں پر کیا کچھ گذری ہو گی اپنے اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت۔ اپنے گھروں سے بے گھر ہوتے وقت انہیں کُڑھتے دیکھ کر، اپنی کھیل کود کی جگہ پر اپنے کھانے پینے، لیٹنے سونے کی جگہ پر پھاوڑے چلتے دیکھ کر، اُنہیں خاک میں اَٹتے اور پٹتے دیکھ کر! فاتح اپنی فتحمندیوں کا جشن مناتا ہے، بھولا ہوا، بالکل بھولا ہوا، کہ کتنی سہاگنیں بیوہ ہو گئیں کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کتنے خاندان برباد اور کتنے گھر بے چراغ! ۵

یہ بات ہے صاف تجھ سے سن لے، کتابیں اس کو کیا پڑھے گا
قیود دُنیا کے ہیں مُعیّن، جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

انسان معصیت سے باز اگر کھنچتا ہے تو عموماً اُسی وقت، جب خود گناہ ہی کی قوت سلب ہو چکی ہے، ورنہ جب تک قوت و سامان موجود ہے نفس پرستیوں اور سیہ کاریوں کا سلسلہ ذرا مشکل ہی سے موقوف ہوتا ہے سہ

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے
مگر اس بزم میں سچ یہ ہے کہ جی ہاں ہے بہت
وعظِ تقوٰی نہ کہو، رحم کرو اکبر پر
چشم بد دور، ابھی طاقتِ عصیاں ہے بہت

نیکی اور بدی پر آخرت میں ثواب و عذاب جو کچھ بھی مرتب ہو، وہ تو ہوگا ہی، ایک بین فرق دونوں کے درمیان تو اس دُنیا میں بھی محسوس ہوتا ہے۔ کہ طاعت کے بعد طبیعت میں شگفتگی اطمینان، سکون پایا جاتا ہے، اور معصیت کے بعد طبیعت کو اضطراب لاحق رہتا ہے سہ

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کارِ ثواب
دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

محض کتابی معلومات، انسان کے جوہر باطن کو صیقل نہیں کر سکتے، اس کے لئے اچھی صحبت لازمی ہے زندگی پر اثر زندہ شخصیت ہی کا پڑتا ہے۔ ایمان میں، قوت عمل میں رسوخ زندہ معلم ہی کے واسطہ سے نصیب ہوتا ہے۔ عالمِ بے عمل وہی کہلاتے ہیں۔ جن کے دماغ کتابی معلومات سے لبریز ہیں۔ لیکن دِل غفلت کی نیند سو رہے ہیں سہ

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

جستجو ہم کو آدمی کی ہے　　وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

ایک اور موقعہ پر:

کام نکلے گا نہ اے دوست کتب خانوں سے

رہیئے کچھ روز کسی محرم اسرار کے ساتھ

انسان کو اپنے خلاف مزاج دنیا میں ہزارہا واقعات ملتے رہتے ہیں، لیکن کارخانۂ دہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا اس کے بس کی بات نہیں، یہ نظام کائنات تو اس کی مرضی کا نہیں کسی اور ہی کی مشیت کا پابند ہے، اسلئے مآل اندیشی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان ہر ناملائم واقعہ پر، ہر حادثہ پر، صبر و تحمل، بلکہ رضا و تسلیم سے کام لے۔ یہی اصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دیں گے۔

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں

بے حد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں

چل بسے چھوٹے بڑے، تھا جن سے لطف زندگی

مجھ کو کس کو ناز ہے، میں ناز اب کس پر کروں

وصل کی شب حسب موسم ہو ہی جائے گی بسر!

لطف اٹھاؤں یا درازی کی دعا شب بھر کروں

کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص غایت و مصلحت کے ماتحت حرکت کر رہا ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹے فعل کا معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہے گا۔ ہر مبتدا کی خبر ضرور نکلے گی۔ ہر ادنی سی ادنیٰ حرکت کوئی نتیجہ ضرور پیدا کر کے رہے گی۔ انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے، اور دل کو عیش و عشرت کی غفلتوں میں نہ پھنسنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے

ساتھ گزر سکتی ہے۔ جامِ حیات میں تلخی پیدا کرنے والی ہماری ہی فراموش کاریاں، غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مسلسل غزل میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

اکبرؔ اس فطرتِ خاموش کو بے حِس نہ سمجھ
ہاں بصیرت سے تہی، دیدۂ نرگس نہ سمجھ
راحتِ زیست کے سامان سے دھوکے میں نہ آ
امتحاں گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبتِ کار پہ رکھ!
خاتمہ جس کا ہو افسوس، اسے آفس نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حُسنِ عمل
بہ انجام یہ امرت ہے، اسے بِس نہ سمجھ
دِل کا دُنیا کی امیدوں سے بہلنا ہے بُرا
زندگی تلخ جو کر دیں، انہیں مونس نہ سمجھ

تعصب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کی نظر جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ہمدردی، رواداری، دوسروں کی بہوخواہی زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے۔ البتہ فطرت کی نیرنگیوں، مشیتِ تکوینی کی عجائب کاریوں، علمِ مطلق کے مظہروں کو دیکھ کر حیرت ضرور طاری ہوتی رہتی ہے ؎

شیخ جی کی نظر میں مَیں ہوں فقط میری نظروں میں ساری دُنیا ہے
بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبرؔ مجھ کو حیرت ہے، اُن کو غصہ ہے

علائقِ دنیوی کی جتنی کثرت ہوگی، اسی نسبت سے سامانِ غم و الم بھی بڑھتے رہیں گے۔ امن و عافیت

مقصود ہے تو دنیوی تعلقات کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے ۔

ایک جتا ہے، ایک پگھلتا ہے کام دنیا کا یونہی چلتا ہے

دل تعلق بڑھا کے پچھتایا پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسرے کی عیب جینی و نقص جوئی میں تو بہت پیش پیش رہتا ہے، لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطاکاریوں کی جانب کبھی بھولے سے بھی توجہ نہیں کرتا۔ اس کو کیس پر لطف انداز سے ادا کرتے ہیں ؂

میری نسبت جو ہوا ارشاد، وہ میں نے سنا

یہ تو کہیئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اس کا ضمیر قائم کر سکتا ہے کہ وہی اس کی اصل کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے۔ انسان ساری دنیا کو دھوکہ میں ڈال سکتا ہے، لیکن خود اپنے ضمیر سے کوئی شئے مخفی نہیں رکھ سکتا ؂

نہ بھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے

تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

اخلاق کی صفائی، نفس کے تزکیہ کے لئے محض گوشہ نشینی کافی نہیں۔ اصل شئے قلب کی بے تعلقی ہے اور اس کا مدار عمل پر ہے اچھی باتوں کے داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ دل سے ماننے والے ان پر عمل کر کے دکھا دینے والے، کم ہی نکلتے ہیں ؂

حرص دنیا سے نہیں ہر صاحب عزلت بری

خانقاہیں اور ہیں، اور دل کا کونا اور ہے

مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند

خوب کہنا اور ہے، اور خوب ہونا اور ہے

نفسِ بشری کی ایک خاص کمزوری دنیا پر ہمیشہ سے مسلط رہی ہے، اور اب تو بہت ہی بڑھی ہوئی، پھیلی ہوتی ہے۔ انسان دوسروں کی بدکاری پر انہیں بُرا بھلا کہہ لینا اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہے، اور خود اپنی اصلاح کی طرف ذرا توجہ نہیں کرتا۔ گویا عبادت وحسنِ عمل کا بنیادی پتھر، اللہ کی حمد نہیں شیطان پر لعنت بھیجنا ہے۔ یہ صورت حال اکبر کے فلسفۂ اصلاح سے بالکل مخالف ہے۔ اہلِ فرنگ۔ اگر ہمیں ناتواں وبے بس پاکر، ہمیں اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں تو اس کا یہ علاج ہرگز نہ صحیح ہے نہ کافی، کہ ہم بس انہیں کوستے کاٹتے رہیں، ان کے طور طریق پر لعنت بھیجتے رہیں۔ ہم کو اصل فکر اپنی ترقی واصلاح کی کرنا چاہیئے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ شیطان نے اس شیطانی دور میں شیطنت کی یہ ترکیب خوب نکالی ہے کہ اللہ کے کچھ بندوں کو بس اس پر لگا دیا ہے کہ وہ شیطان پر لاحول پڑھنے ہی میں لگے رہیں، اور حمد ومناجات توحید وحسنِ عمل کے لئے وقت ہی نہ نکال سکیں ؎

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی

خدا کی حمد کیجئے ترک، بس مجھ کو بُرا کہیئے

ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں کہ حریف اگر ہمارے اوپر ستم پر ستم توڑ رہا ہے، اور ہم ایں کہ بجائے اپنی اصلاح حال وتصحیح اعمال کے محض اس پر لعنت بھیجنے میں لگے ہوئے ہیں، تو نتیجہ ہم اور وہ دونوں ہو کر رہیں گے۔ قانونِ فطرت، انتقام دونوں سے لیگا۔ حریف سے اس کی زیادتیوں کا۔ ہم سے ہماری کوتاہیوں کا۔ اُس سے اقدامِ جور وستم کا، ہم سے غفلت وجمود کا، عدو کی تباہی، ہماری فلاح کی خود بخود مستلزم ہرگز نہیں ؎

یہی خصائل یہی طبیعت رہی اپنی تو قسمت یہی رہے گی
زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا، ہماری حالت یہی رہیگی

یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو از صبح اُمید کیا
یہی ہے زلفِ بتاں کا سودا، تو میری شامت یہی رہیگی

عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکرِ عصیاں عبث کیا
عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت یہی رہے گی

سکونِ خاطر و اطمینانِ قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے، سارے اولیا انبیاء کا بتایا ہوا، سمجھایا ہوا راستہ ع صد ہزاراں پیر بر وے متفق
یعنی دنیا سے بحیثیت دنیا کے بے تعلقی و بیزاری۔ دِل میں تو اور لگن کسی اور ہی کی لگی رہے۔ باقی ہاتھ پیر، چلتے، پھرتے حرکت کرنے، اسی دنیا میں رہیں، بقول عارف رومؒ ؎

ہیچ کنجے بے دد و دام نیست! جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف نے بھی کی ہے ؎

جو اہلِ دنیا کا رُخ کروگے سکونِ خاطر کبھی نہ ہوگا
شریکِ غفلت بہت ملیں گے، شریکِ عبرت کوئی نہ ہوگا

یہی ہے مذہب کا جزوِ اعظم کہ دینِ دنیا پہ ہو مقدم
نئے طریقے ہیں لیکن اے دوست ہو گا سب کچھ یہی نہ ہوگا

صدیوں پیشتر اس آوازۂ حق کی منادی کردی گئی تھی کہ اطمینان قلب و راحتِ دل صرف اُن لوگوں کا حصہ ہے جو ایمانِ کامل رکھتے ہیں، اور اپنی بدعملیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ اکبر کی آواز بھی اسی آوازۂ حق کی صدائے بازگشت ہے۔ خلقت کو اصلاح دنیوی

کا راستہ بتاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلام مجید کے اوراق سامنے کھلے ہوتے ہیں، انہیں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا کان لگا کر تو سنیئے ؎

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیونکر — اسباب نہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر [1]

اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہے کام — طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا ہو یہ کام [2]

بے طاعت و نیکی نہیں تاثیر دعا کچھ — آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ [3]

منظور مفاخر کا اگر تجھ کو سبق ہے — تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے [4]

یہ کشمکش فطرت دنیا ہے مسلسل — اک آج اگر صاحب طاقت ہے تو اک کل [5]

---

[1] "جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آئی ہے خود تمہارے ہاتھوں آئی ہے" (سورۂ شوریٰ رکوع ۴) "تمہیں جو کچھ بھی برائی پیش آتی ہے خود تمہارے نفس کی لائی ہوئی ہے" (سورۂ نساء رکوع ۱۱) خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دے (سورۂ رعد رکوع ۲)

[2] "خدا ہر قسم کی فراہمی اسباب پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں" - (سورہ کہف رکوع ۵) "ساری قوت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے" (سورۂ بقرہ رکوع ۲۰) "حکومت و اختیار صرف خدا کا ہے" (سورۂ یوسف رکوع ۵)

[3] مسلمانو، فلاح عاقبت نہ تمہاری تمناؤں پر موقوف ہے، نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے۔ پس جو شخص برا کرے گا، اس کی سزا پائے گا" (سورۂ نساء رکوع ۱۸)

[4] وہی خدا تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا، تمہیں میں کافر بھی اسی نے پیدا کئے اور مومن بھی" (سورۂ تغابن رکوع ۱) [5] "ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں" (سورۂ آل عمران رکوع ۱۴)

نیکی کی طرف رُخ ہو یہی ناموری ہے[۱]   کھوٹے کو جُدا کر دے، وہی بات کھری ہے

لیکن یہ سارا دفتر وعظ و پند، یہ ساری شاعری و بلاغت، یہ ساری فلسفہ سنجی و نکتہ آفرینی ایک طرف، اور فطرت کی رفتارِ تکوینی، مشیتِ الٰہی کا رُخ دوسری طرف، مشیت نے بڑے بڑے انبیاء و رسل کو ظاہری نتیجہ کے اعتبار سے ناکام رکھا، جس حکمتِ تکوینی نے خدا معلوم کتنے ہی معرکوں میں صورت و ظہور کے اعتبار سے کفر کو ایمان پر، اور ظلمت کو نور پر غالب رکھا۔ اس کی عادت میں بیسویں صدی کے ایک مصلح شاعر کی خاطر فرق کیونکر پڑ سکتا تھا؛ ہدایت و گمرہی کے دور کا آخری سلسلہ انسان کے نہیں، انسان آفرین کے ہاتھ میں ہے۔ اس کارخانہ کائنات کی بنیاد جس علت پر رکھی گئی ہے، اسی پر کارخانہ برابر چلتا رہے گا، پیمبروں جیسی مقبول و برگزیدہ ہستیاں جب فطرت کی رفتار کو نہ بدل سکیں تو کسی شاعر غریب کی بساط ہی کیا۔ اکبر بھی اس تماشا گاہِ عالم میں اپنا جلوہ حسن و ادا، کمال و جمال کے ساتھ ادا کرکے رخصت ہوگئے، لیکن چلتے چلتے یہ بھی کہہ گئے کہ زمانہ کا رُخ میری یا کسی کی بھی تبلیغ سے نہیں پھر سکتا، چند ہی روز میں یہ حال بھی ماضی بن جائے گا، یہ "آج" بھی "کل" میں تبدیل ہو جائے گا۔ حال کی تازگی ماضی کا افسانہ پارینہ بن جائے گی۔ اُس وقت کوئی نوحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔ احساسات خود ہی تبدیل ہو چکیں گے، عیب ہنر بن جائیں گے، اور کمال کا نام بے کمالی پڑ جائے گا۔

عقل کو جنون کا لقب دے کر پکاریں گے اور جنون کی تعبیر عقل سے کریں گے ؎

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

۱؎ تم میں جو سب سے زیادہ پاکباز ہے، وہی خدا کے نزدیک سب سے معزز ہے۔ (سورہ حجرات رکوع ۲) "جو لوگ عزت کے خواستگار ہیں، سو عزت تو ساری کی ساری صرف خدا ہی کی ہے۔" (سورہ فاطر رکوع ۲)

کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کونسی چیز گم ہو گئی عنفوان شباب کی لذتوں اور مستیوں میں پڑ کر یادہی کس کو رہ جاتا ہے، کہ ہائے کیسی معصومیت کا زمانہ رخصت ہو گیا، بے فکریوں کا وقت کیا خواب و خیال بن گیا! اور نئی نئی فکروں ذمہ داریوں کا کتنا سخت بوجھ سر پر آپڑا ہے! آنکھ کھلتی ہے مگر کب؟ جب وقت ہاتھ سے نکلے ہوئے بہت عرصہ ہو چکا ہوتا ہے عجب نہیں کہ کچھ ویسا ہی حشر ہماری موجودہ معاشرت کا بھی ہو۔ اکبر کے جام جم میں اس قلب ماہیت کے ایک ایک جزیہ کا عکس موجود ہے۔ بہتر ہو گا یہ مرثیہ کا آخری بند سنا کر مجلس کو کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کر دیا جائے[1]

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسین اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

---

[1] افسوس کہ وہ "دوسرا وقت" کبھی نہ آیا مضمون کی تقسیم شروع میں پانچ حصوں میں کی گئی تھی اور پانچویں حصہ کا عنوان "تصوف، معرفت، فلسفہ" تھا لیکن مضمون جب ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء میں رسالہ اردو میں نکلا، تو صرف چار ہی حصے نکلے، اور پانچواں حصہ سارے کا سارا چھپنے سے باقی رہ گیا تھا اب ۱۹۴۳ء میں نظر ثانی کے وقت اتنی ہمت نہ ہوئی کہ تکملہ کے لئے پوری محنت ایک مستقل مقالہ کی گوارا کی جائے۔ یوں ہی بہت زیادہ وقت نظر ثانی کی نذر ہو گیا تھا، مضمون اسی طرح ناتمام صورت میں شائع ہوتا ہے! دنیا میں خدا معلوم کتنی خیالی اسکیمیں اور کتنے منصوبے اسی طرح ناتمام رہ جاتے ہیں اور انسان انہیں چھوڑ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جاتا ہے! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! (عبدالماجد مئی ۱۹۴۴ء)

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردہ کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا انداز طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہونگے

عقاید پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال سم ہونگے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

اردو کا ایک بدنام شاعر[1]

یا

گنہگار شریف زادی

لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ "جان عالم" کا لکھنؤ۔ زمانہ یہی انیسویں صدی عیسوی کے وسط کا۔ آج سے کوئی ستر پچھتر سال قبل۔ ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل کا ترانہ۔ ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینہ میں جوشِ تمنا۔ ہر شام میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم۔ یہاں رہس کا جلسہ، وہاں اندر سبھا کی پریوں کا پرا۔ اِدھر زبان پر ضلع جگت اور پھبتیاں، اُدھر گلے سے تانیں اور ہاتھوں سے تالیاں۔ گلی گلی "جنت نگاہ و فردوس گوش" چپہ چپہ "نامانِ باغبان و کفِ گل فروش"۔ بڑے بڑے متین اور ثقہ، گویوں اور سازندوں کی سنگت میں، اچھے اچھے مہذب اور متقطع بھانڈوں اور ڈھاریوں کی صحبت میں سفید پوشوں کے دامن عبیر اور گلال کی پچکاریوں سے لالوں لال، جبے اور عمامے والے، پشوازوں کی گردش پر نثار۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کی اصطلاح میں "آرٹ" اور "فائن آرٹ" کا دور

---

[1] رسالہ سہیل (علیگڑھ) ۱۹۲۷ء۔ نظرثانی ۱۹۴۴ء

دورِ عشق کا چرچا حسن کا شہرہ ۔ اس فضا میں ایک صاحب حکیم تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں ، کوئی عالمِ دین نہیں ، صوفی و درویش نہیں ، واعظ و مصلح نہیں چوچلوں کے آدمی یار باش ، رند مشرب ، اہلِ بزم کے خوش کرنے کو شعر و شاعری کا ساز لے کر بیٹھے تو انگلیاں اُنہیں پردوں پر پڑیں جن کے نغمے کانوں میں رچے ہوتے تھے اور منہ سے بول نکلے تو وہی جن کے نقش دلوں میں جمے ہوئے تھے ۔

غزلیں شاید زیادہ نہیں کہیں ، کہیں ہوں گی بھی ، تو اس وقت کسی کی زبان پر نہیں تھوڑا بہت جو کچھ کہا اُس کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

کہنے میں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے

پھرتے ہیں اُنہیں غیر ابھارے کئی دن سے

اک شب مرے گھر آن کے مہمان رہے تھے

ملتے نہیں اس شرم کے مارے کئی دن سے

آخر مری آہوں نے اثر اپنا دکھایا

گھبرائے ہوئے پھرتے ہو پیارے کئی دن سے

پھر شوق سے کیا اُس بتِ عیار سے بگڑی

ہوتے نہیں باہم جو اشارے کئی دن سے

حکیم صاحب کی حکمت و طبابت سے یہاں غرض نہیں ، شاعری کی دنیا میں حکیم صاحب کا نام نواب مرزا ہے اور تخلص شوق اور ان کے نام کو قائم رکھنے والی ، اُن کی غزلیں نہیں ، مثنویاں ہیں ۔ تذکروں میں ہے کہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے ، ہوں گے ۔ لیکن یہ مثنویاں یقیناً یا تو اُستاد کے بعد کی ہیں ، یا اُن کی زندگی میں اُن سے چرا چھپا کر کہی ہیں ، ورنہ آتش کی نظر

پڑنے کے بعد عجب نہیں کہ نذرِ آتش ہو جائیں۔ خواجہ آتش کی متانت و ثقاہت کب اس کی روادار ہوتی کہ سعادت مند شاگرد آوارگی اور تماش بینی کی بولی ، ٹھولی میں وہ نام پیدا کر جائیں کہ تہذیب کی آنکھیں ان کا نام آتے ہی نیچی ہو جائیں، اور عریاں نگاری کے وہ شرارے چھوڑ جائیں کہ اُن کی یاد کی چمک دمک قائم ہے بھی تو اسی روشنی میں!

اِن مثنویوں کا نام پڑھے لکھوں کے مجمع میں لیا جائے؟ تہذیبِ جدید کی اجازت ہے کہ ایک مشرقی شاعر کی عریاں نگاری کی لفظی یادگاروں کا نام لیا جائے؟ نواب مرزا شوق لکھنؤ کا تھا۔ انگلستان کا نہ تھا، فرانس کا نہ تھا، امریکہ کا نہ تھا، کہ اس کی ہر بے حیائی "آرٹ" کا کمال سمجھ لی جاتی، اس کی ہر عریاں نگاری پر کمالِ فن کی داد ملتی، اور اس کا ہر عیب ہنر بن جاتا! بیسویں صدی کا نہیں، اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط کا تھا "نئے ادب" کے دور سے بہت قبل کا تھا۔ آج کے "ترقی پسند" ہندوستان کا نہ تھا کہ اس کی ہر فحش نگاری "ترقی پسندی" کی سند اور دستاویز بن جاتی! بہر حال مثنویاں منسوب تو اُن کی جانب کئی ایک ہیں، لیکن لذتِ عشق کی زبان قطعاً شوق کی زبان نہیں[1] اور نہ یہ عشق بھی مشکل ہی سے اِن کی تسلیم کی جا سکتی ہے ہاں یہ ممکن ہے، نو مشقی کے زمانہ کی کوئی ابتدائی کوشش ہو۔ یقین کے ساتھ جن دو مثنویوں کو اُن کی تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے اُن میں سے ایک کا نام بہارِ عشق ہے اور دوسری کا زہرِ عشق۔ شہرتِ عام زہرِ عشق ہی کے نصیب میں آئی۔ دونوں میں نہ کوئی پلاٹ ہے، اور

---

[1] ۱۹۲۷ء میں یہ محض قیاس سے لکھا گیا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں لذتِ عشق کا ایک بہت قدیم مطبوعہ نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا۔ اس کے سرورق پر تصریح ہے کہ یہ مثنوی شوق کی نہیں، شوق کے ہمشیر زادہ آغا اور حکیم صاحب کی ہے۔

نہ کوئی طلسم کشائی، نہ شاعر منبر پر بیٹھ کر اخلاق کا وعظ کہہ رہا ہے۔ نہ کالج کے لکچر روم میں تحلیل نفسیاتی کر رہا ہے۔ اُسے محض اپنی ہوسناکی کی کہانی سُنانی ہے، در یہی وہ خوب مزہ لے لے کر سنا رہا ہے پھر چونکہ محض "آپ بیتی" ہی سنانی ہے، اس لئے "جگ بیتی" سُنانے والوں کی طرح کسی دوسرے کو عاشق فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئی ہے۔

بہارِ عشق میں افسانہ کا انجام، شادی پر ہوتا ہے۔ پیش نظر نسخہ کانپور کے مطبع علوی علی بخش خاں کا چھپا ہوا ہے۔ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء کا۔ یہ نسخہ نسبتاً صحیح ہے، حال کے مطبوعہ نسخے، علاوہ بہت زائد اغلاط مطبعی کے آخر سے ناقص بھی ہیں۔ شادی کا ذکر ان میں غائب ہے۔ کل نظم میں آٹھ سو سے اوپر شعر ہوں گے، اشعار کی خاصی بڑی تعداد ایسی ہے، جو بزرگوں کے سامنے کیا، بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بھی پڑھنے کے قابل نہیں۔ خدا معلوم ان ذاتِ شریف سے لکھے کیونکر گئے!

کتاب کے شروع میں حسبِ دستور زمانہ بادشاہ کی مدح ہے اور سُننے کے قابل ہے ارشاد ہوتا ہے ؎

نوبتِ مدحِ شاہ آئی ہے — اے قلم وقت جبہ سائی ہے
کر رقم اب دُعائے شاہِ زماں — کہ ہے وہ مُلکِ ہند کا سلطان
آفتابِ سپہر جاہ و حشم — شاہ واجد علی شہِ عالم

یہ "شاہِ زماں" اور "سلطانِ ہند" اور "شہِ عالم" اور "آفتابِ سپہر جاہ و حشم" کے خطابات اُس وقت عطا ہو رہے ہیں، جب حکومت اور بادشاہت کے سارے اختیارات چند ایکڑ اگر نہیں تو چند میل کے رقبہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے اور اس محدود چار دیواری کے اندر بھی مجال نہ تھی کہ "صاحب عالیشان رزیڈنٹ بہادر" کے حکم کے خلاف کوئی انگلی تک ہلا سکے!

آگے اور سنیے ۔

خلق پر سایۂ الٰہی ہے ۔ مالکِ تاج و تخت شاہی ہے
ہے بشر، پر خدا کی قدرت ہے ۔ نیک سیرت ہے، خوبصورت ہے
سرورِ خسروانِ عالم ہے ۔ پسچ تو یہ ہے کہ جانِ عالم ہے
دل تمنای وصل او دارد! ۔ چہ بلا شکل آرزو دارد!

اِن آخری شعروں میں بادشاہ کی تعریف رعایا کی زبان سے ہو رہی ہے، یا جہاں پناہ اپنے کسی محل کو یاد فرما رہے ہیں ؛

قصّہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک روز لبِ بام ایک ماہ لقا دکھائی دیتی ہے، اس کے حسن کا عکس اس آئینہ میں ملاحظہ ہو ۔

بام روشن ہے طور کی صورت ۔ سر سے پا تک تھی نور کی صورت
حسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند ۔ چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
گل سے رخسار، گول گول بدن ۔ گات جس طرح قمقمے روشن
ناک میں تبسم کا فقط تنکا ۔ شوخی چالاکی مقتضا سن کا
آستیوں کی وہ چُنی کرتی! ۔ جسم میں وہ شباب کی بھرتی
قد میں آثار سب قیامت کے ۔ گوری گردن میں طوق منت کے
عکس رخ موتیوں کے دانوں میں ۔ بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رگِ گل سی کمر لچکتی ہوئی ۔ چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

یہ منظر دیکھتے ہی حکیم صاحب اپنی ساری حکمت بھول بھال سو جان سے عاشق ہو جاتے ہیں۔ گھر تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے اور جب کسی طرح گرتے پڑتے پہنچتے ہیں تو اٹوائی کھٹوائی

لے کر پڑ جاتے ہیں غش پر غش آنے لگتے ہیں۔ زندگی سے یاس ہو جاتی ہے۔ ماں باپ بھائی، بہن، دوست احباب سب گھبرا جاتے ہیں اور طرح طرح کا دوا علاج کر کے جب اُسے بے اثر پاتے ہیں تو رونے دھونے میں لگ جاتے ہیں۔ اِن مرحلوں کے بعد ایک روز ایک راز دار دوست آ کر حکیم صاحب کے دِل کی نبض ٹٹول ان کے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، اور اس مقدس مشن پر روانہ ہو جاتے ہیں، کہ اُن کے گھائل کرنے والی ستمگر پری پیکر کے گھر کا پتہ لگائیں گے اور کسی دم دلاسے سے اُسے گھیر گھار ان سے لا ملائیں گے۔ دِریار پر پہنچ کر پہلے گھر کی مہری کو گانٹھتے ہیں۔ یہ مہری بنی ٹھنی ہوئی خود اس انتظار میں کھڑی ہیں آپ ان چھب تو دیکھتے ہی چلیں، زبان سے لاحول پڑھتے ہوئے لیکن نظر کو نظر سے دو چار کرتے ہوئے ؎

. . . . سانولا رنگ چلبلی صورت
لال نیفہ ازار بند بڑا! گچھا ایک کنجیوں کا اس میں پڑا
کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی آنکھ اِک ایک سے ملاتی ہوئی
آنکھ اِک ایک پر لگاوٹ کی بات اِک ایک سے گھلاوٹ کی
حسن کے دِن جوانی زوروں پر رات کی باسی مہندی پوروں پر
یہاں ٹھری کبھی وہاں ٹھری دو منہہ ہنس بول لی جہاں ٹھری
آگے اور پیچھے مار، فوج کی فوج دھینگا مشتی کسی سے گالی گلوج

یہ نہ دیکھیئے کہ کیا کہا، نظر اس پر رکھیئے کہ کیسا کہا۔

جیسی رُوح ویسے ہی فرشتہ۔ اگر یہ عاشق صاحب تاشینی میں طاق تھے تو ان کے دوست صاحب بھی کُٹناپے میں شہرۂ آفاق۔ زنانی ڈیوڑھی تک رسائی پیدا کر کرا، ان نام کی

بیگم صاحبہ پر کچھ ایسا افسوں پڑھا، اور "عاشقِ صادق" پر حالتِ نزع کے طاری ہونے کا کچھ اس طرح سماں باندھا، کہ آخر وہ اُن کے بھرّے میں آگئیں۔ یہ بیگم صاحبہ بھی خیر سے کچھ معصوم نادان نہ تھیں، خوب کھیلی کھائی ہوئی تھیں، لیکن پھر آخر ناقص العقل۔ ایک شریف بدمعاش کی قسماقسمی اور خدا رسول کے واسطوں پر یقین کر بیٹھیں، اور درگاہ حضرت عباسؑ[1] کی حاضری کا بہانہ کر، گھر سے سوار ہوگئیں۔ کہاروں کو پہلے ہی سے پٹی پڑھادی گئی تھی۔ سواری آکر لبِ مرگ "عاشقِ بیمار" کے دروازہ پر رُکی۔ خدمتگار خبر دینے آتا ہے کہ ڈیوڑھی پر ایک سواری آئی ہے لیکن خدمتگار صاحب بھی آخر کس دل پھینک مخدوم کے خادم تھے، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں "ایک ماما بھی آئی ہے ہمراہ۔ کتنی چالاک ہے خدا کی پناہ" ماما پردہ نشین نہیں بے پردہ ہے اور "حُسن نہ گذرے" آپ کے اخلاق کے دارالافتاء ہیں۔ "سرو و خانۂ ہمسایہ" ہی کی طرح وقفِ عام ہے۔ موقع ہے کہ آپ اپنی متانت اور ثقاہت کو خطرہ میں ڈالے بغیر، چپکے سے ایک نظر، اچٹتی سہی، اِدھر بھی ڈال لیں ؎

پوچھتی آئی ہے یہاں تک گھر ہاتھ رکھے کھڑی ہے کولے پر
اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر پھبتیاں کہہ رہی ہے اِک اِک پر
ہنسی ٹھٹھا ضلع جگت ہیں طاق چل رہی ہے زبان تڑاق پڑاق
کھڑی اک اک کا منہ چڑھاتی ہے ہنسنے دیتی ہے لوٹی جاتی ہے
چوٹی نیچی ہے باسی ہاروں سے لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے
راستے والے جو گذرتے ہیں ! منکے کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں

بہر حال سواری اُترتی ہے۔ تخلیہ میں یکجائی ہوتی ہے۔ شہدپن کو کھیل کھیلنے کا موقع ملتا ہے

[1] لکھنؤ کے غربی حصے میں ایک مشہور شیعی زیارتگاہ۔

شرم وحیا کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور بے حیائی و نفس پرستی کے پردے ہر طرف چھوڑ دیئے جاتے ہیں، ایک طرف ہوسناکی کی تمنائیں ہیں، دوسری طرف انکار کی ادائیں ہیں، منّت وسماجت کی دھیمی آوازیں تو خلوت گاہ کی دیواروں کے اندر گونج کر رہ جاتی ہیں، البتہ ڈانٹ پھٹکار گرما گرم صدائیں پردہ کے باہر بھی صاف سنائی دے رہی ہیں ؎

بل بے فقرہ ترا معاذ اللہ — میرے تو ہوش اُڑ گئے واللہ
وہ گھ کہتے تھے ہے لبوں پہ جان — مکر کے صدقے جھوٹ کے قربان
کون کہتا ہے زہر کھایا ہے — یہ بھی اِک شعبدہ بنایا ہے
توبہ کس درجہ بے حیائی ہے — واہ کیا دیدہ کی صفائی ہے
کیا کہوں اور بے حیا تجھ کو — پھٹے منہ لعنتِ خدا تجھ کو
میں بڑا چکمہ کھا گئی افسوس — جو ترے چل میں آگئی افسوس
جھوٹا بدذات فیلیا مکار — ان گنوں پر ترے خدا کی سنوار
مکر کا بانی جھوٹوں کا سرتاج — سنتے تھے فیلسوف دیکھا آج
ایسے فقروں کو کوئی کیا سمجھے — اور تو کیا کہوں خدا سمجھے

لیجئے اب تو آواز اور بلند ہوگئی، اور لہجہ میں غصہ کی تھرتھراہٹ نمایاں ہوگئی ؎

پھر وہی آنکھوں پہ تیرے چھائی ہے — کچھ نگوڑے کی شامت آئی ہے
کبھی آفت نہ یہ اٹھائی تھی — چھائیں پھوئیں میں نوج آئی تھی
کیا دھما چوکڑی مچائی ہے — تیری بختاوری یہ کھ آئی ہے
موذی، بدذات، بے حیا، بے شرم — جانتا ہے کہ ہم ہیں گرما گرم!
کس قدر صاف تیرا دیدہ ہے — ایک نٹ کھٹ حرامزادہ ہے

کون سمجھے تھے تو ادھورا ہے — ارے تو سب گنوں میں پورا ہے

میں اگر بولنے پہ آؤں گی ! — لاکھوں دُھرّے ترے اُڑاؤں گی

ابھی سب کہہ کے سُنکے رکھ دونگی — سات پیڑھی کو پُن کے رکھ دونگی

اور وہ ہوتیاں ہیں البیلی — میں نہیں کچّی گولیاں کھیلی

گالیاں کیسی، کوسنے دونگی — میں بھی اک اپنے نام کی ہوں گی

رحم کرتا ہے مجھ پہ نادانی — وہاں ماروں جہاں نہ ہو پانی

تیری بیلیہ پہ بوٹیاں کاٹوں — چیل کوؤں کو بیٹھ کر باٹوں

یہ جو شعر آپ نے سُنے پھر بہت صاف اور سنجیدہ ہیں باقی اشعار کی ایک بڑی تعداد نقل کے قابل کسی طرح بھی نہیں بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے شرم وحیا کا لباس اُتار کر پھینک دیا ہے، تہذیب شائستگی کی جانب سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور آواز گو نکل رہی ہے انسان کے حلق سے، لیکن ہے تمامتر جذبات سفلی وحیوانی کی ـــ ظالم نے مصوّری کی یہ خداداد قابلیت کاش کسی شریفانہ نظم میں صرف کی ہوتی! شاعر جس ماحول میں تھا اس میں اخلاق کی پستی، جذبات کی خودنمائی ورکاکت، بے حیائی وعریاں نگاری کی کمی کچھ نہ تھی، حمام میں سب ہی ننگے تھے۔ آخری دربار اودھ کے شعرائے باکمال اور سخن گویانِ شیریں مقال میں کون اس میدان کا مرد نہ تھا؟ بایں ہمہ ان کاملوں کی سرداری کا تاج شوق ہی کے سر پر رکھا گیا اس بزم کی صدرنشینی نواب مرزا ہی کے حصّہ میں آئی، لیکن اس صدارت وسرداری کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ آج اردو شاعری کی تاریخ میں کہیں اس غریب کے لئے کوئی جگہ[1] ہے؟ اردو کے مشاہیر شعراء کی فہرست میں کسی نمبر پر ان کا نام آتا ہے؟ اگر

---

[1] یہ صورت حال ۱۹۲۷ء کی بیان ہوتی۔ دور "ترقی پسندی" کے طلوع ہونے سے بہت قبل۔ اسوقت خود اس مقالہ کا لکھنا اور اسے بھری مجلس میں سُنانا، ذرا جرأت ہی کا کام تھا۔

تذکرہ نویسوں نے ان کا یا ان کی مثنویوں کا ذکر تک بھی کیا ہے؟ شاعروں کا کوئی طبقہ آج تلمذ یا کسی دوسری حیثیت سے اپنا انتساب ان کی جانب پسند کرتا ہے، یا اس کے برعکس ان کا نام آتے ہی کچھ جھینپ سا جاتا ہے اور بے اختیار اپنی تبری کرنے لگتا ہے؟ نقادان شعر کے حلقوں میں، سخن سنجوں کی صحبتوں میں، پڑھے لکھے اور شریف گھرانوں میں نواب مرزا شوق اور ان کی مثنویوں کی کچھ بھی وقعت اور پرسش ہے؟

کلام کا کچھ نمونہ اوپر گذر چکا، اور بہت کچھ ابھی آنے کو ہے۔ محاورات پر یہ عبور بیگمات کے روزمرہ پر یہ قدرت، زبان کی یہ صحت، بیان کی یہ سلاست، جذبات نگاری کی یہ قوت، کیا ہر شاعر کے نصیب میں آئی ہے؟ ان تمام حیثیات سے، شوق کا کلام اردو کے کسی شاعر سے فروتر ہے؟ پھر آخر اس بے التفاتی کی وجہ؟ شوق کی کس مپرسی کا کوئی سبب؟ وجہ ظاہر اور سبب واضح ہے۔ مشرق، کم از کم اسلامی مشرق، اپنی جبلت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ قدر شرم وحیا کے جذبات کی کرے، عزت کی مسند پر جگہ شرافت کے لئے خالی کرے اور اپنا سر عصمت و عفت کی تصویروں کے آگے خم کردے۔ بے حیائی، عریاں نگاری اور تحریری مشہدین کی عزت و وقعت اس کی سرشت کے مخالف ہے جس طرح ہر فرد ایک مخصوص طبیعت اور خاص مزاج رکھتا ہے، ہر قوم کا بھی ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے، ہر تمدن کی بھی ایک مخصوص سرشت ہوتی ہے۔ قومی زندگی کی جو کارروائیاں اس عام مزاج و سرشت کے مخالف ہوتی ہیں، وہ کبھی قوم کے قوام میں نہیں داخل ہونے پاتیں قومی تمدن کا مستقل نظام انہیں اپنے میں جذب کرنے، قبول کرنے اور اپنا جزو بنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور نظام تمدن کا ایک بڑا مظہر ہر قوم کا شعر و ادب ہوتا ہے۔ شوق کی کھلی ہوئی عریاں نگاری، مشرق کے ذوق سلیم کے مخالف تھی، بگڑی اور اجڑی ہوئی تہذیب اسلامی کے بھی منافی تھی، اس لئے

اسلامی مشرق نے شوق کی تمام دوسری شاعرانہ خوبیوں کے باوجود اُن کے لئے اپنی فہرستِ مشاہیر میں کوئی جگہ نہ رکھی۔ اور نام کو بالکل "گُم نام" ہونے سے بچاکر رکھا بھی تو "بدنام" کر کے زندہ رکھا، مشرق کا صوفی بگڑے گا، بہکے گا بھی، تو بندگی میں خدائی کے دعوے کرنے لگے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ مغرب کے ترقی یافتہ حکیم کی طرح اپنی انسانیت کو بھلا کر فخر اپنے بندر ہونے پر کرنے لگے! بے ہوش ہوجائے گا۔ بدحواس نہ ہوگا۔ "بگڑنے پر بھی بات اُس کی بن گئی"، جانعالم کا ہندوستان، بھانڈوں اور سازندوں کا ہندوستان، لاکھ بگڑنے پر بھی اپنے سے اتنا بیگانہ نہیں ہوا، اپنے کو اتنا نہیں بھولا، کہ کوئلہ کا نام ہیرا رکھ دے اور پیتل کو سونا سمجھنے لگ جائے۔

غرض نواب مرزا کو اپنی پست مذاقی اور مبتذل نگاری کی سزا مشرق کی معدلت گاہ سے ملی اور بجاطور پر ملی، لیکن وہ خود بھی آخر مشرقی ہی تھا، باوجود انتہائی بے حیائی کے یہ ناممکن ہوا کہ چوری کے جرم پر سینہ زوری کا بھی اضافہ کرے۔ لارڈ بائرن اور آسکر وائلڈ[1] کی سی یہ جرأت و جسارت کہاں سے لا سکتا تھا، کہ گندہ نظم اور گندہ ترنثر کو شعر و ادب کا بہترین نمونہ کہکر پیش کرتا! یہ بے باکی اور ڈھٹائی نیویارک کے ایوننگ گرافیک، لندن کے نیوز آف دی ورلڈ اور لندن لائف، بمبئی کے ٹائمز آف انڈیا السٹریٹیڈ ویکلی اور اسی مرتبہ کے اور اونچے اونچے فرنگی اخباروں رسالوں ہی کے حصہ میں آئی ہے، لفظ و عبارت ہی نہیں، فوٹو اور تصویریں تک زیادہ سے زیادہ عریاں چھاپتے رہیں اور نام "آرٹ" کی ترقی

---

[1] اور اب تو وہ دونوں غریب بھی ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور جوائس اور ان جیسے بیسیوں اہل قلم مردوں اور خاتونوں کے آگے گرد ہو کر رہ گئے ہیں۔

گا-یا صحت کے دکھ درکھاؤ گھالے دیا کریں[1]! غریب مشرقی کا تخیل بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا عمل میں کیسی ہی شرمناک کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوں لیکن ایمان میں فحش و بے حیائی کا جواز داخل نہ تھا - اپنے شہدپن کی کہانی سنانے کو تو سنا ڈالی لیکن معاً یہ خیال بھی سامنے آگیا کہ خود تو جی بھر کے تباہ ہو چکے، نہو کہ داستانِ فسق دوسروں کے لئے سامانِ تباہ کاری بن جائے - آخر مشرقی تھے، مسلمان تھے، بات کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے خود اپنے انجام کا بھی خیال آگیا اُٹھے تھے شیطان پورہ کی دلالی کرنے، رُخ خود بخود خانقاہ کی جانب پھر گیا - اور ابتدا میں جس کی حمد میں زبان کھُلی تھی ؎

کس زباں سے کروں صفاتِ خدا — کیا بشر سمجھے کنہ ذاتِ خدا

جب نبی یُوں کہے کہ اے مالک — ما عرفناک حق معرفتک

انتہا میں بھی اُسی کا خوف غالب آگیا، اور اسی کی خشیت نے قلب کو لوزا دیا - زبان اب چل رہی ہے اور مضمونِ عشق ہی پر چل رہی ہے، لیکن اب وہ کسرا پا فسق نہیں - ذرا کان لگا کو تو سُنئے یہ ایوانِ عشق میں داستانِ فسق بیان ہو رہی ہے، یا ذکر و شغل کے حلقہ میں تسبیح و تہلیل ہو رہی ہے ؟ ؎

اب سُنیں صاحبانِ عقل و شعور — ہے یہ دُنیا تمام مکر اور زور

شہد ظاہر میں زہر اندر ہے — جس قدر اس سے بھاگے بہتر ہے

صاحبِ عقل کو نہیں ہے زیب — کہ اُٹھائے جہاں میں رہ کے فریب

سب یہ دُنیا سوائے فانی ہے — عشقِ معبود جاودانی ہے

ہائیں! یہ کیا سے کیا ہو گیا! ابھی تو شرافت اور متانت کانوں میں اُنگلیاں دیئے ہوئے تھی، اور اب ہے کہ آنکھیں بچھا دینے کو تیار! کہاں ابھی گلفام و سبز پری کا سوانگ جما ہوا تھا، اور کہاں روحی

[1] ملاحظہ ہوں انگلستان کے رسالہ Health & Efficiency کے چند نمبر

"غزالی" کے مواعظ کا دفتر کھل گیا ہے

کہتے ہیں صوفیان صافی دل | کہ ہے عشق خدا بہت مشکل
عشق اللہ کا جو مائل ہو | ترک دنیا کرے تو حاصل ہو
اب یہ لازم ہے جو کہ ہے انساں | ترک دنیا کرے بہر عنواں
کوئی الفت نہ بے وفا سے کرے | عشق کرنا ہے تو خدا سے کرے
چار دن کی یہ زندگانی ہے | جو ہے اس کے سوا وہ فانی ہے
ہے وہ مستجمع جمیع صفات | لائق سجدہ ہے اسی کی ذات
وہی اوّل میں ہے وہی آخر | وہی باطن میں ہے وہی ظاہر
کون سی جا ہے جس جگہ وہ نہیں | چاہیئے ہے نگاہِ وحدت بیں

تلقین زہد و موعظہ معرفت سے طبیعت اکتا چلی ہو، تو بس تھوڑے سے صبر کی اور ضرورت ہے چند ہی شعر باقی رہ گئے ہیں:

لکھتے ہیں صوفیان با توقیر | عشق اللہ ہے عجب اکسیر
جس کو اس در تلک رسائی ہے | دین و دنیا کی بادشاہی ہے
مثلِ سیماب دل کی ہے تاثیر | خاک ہو جائے تب بنے اکسیر
دنیا کہتے ہیں جس کو پردہ ہے | باقی اللہ کے سوا کیا ہے
منکشف اس کی کیا حقیقت ہو | وہی جانے جسے بصیرت ہو
پردے اٹھ جائیں جب جدائی کے | حال اسدم کھلیں خدائی کے

یہ کس کا کلام ہے؟ کسی صوفی خرقہ پوش کا؟ کس زاہد خلوت گزیں کا؟ کسی فقیر تارک دنیا کا؟ یا اسی صیاد دشمن کا جو ابھی ابھی اپنی سیہ کاری کی داستان مزے لے لے کے سنا رہا تھا؟

اس بدنام مشرقی کے مقابلہ میں مغرب کے نیک ناموں کے پاس کیا ہے ؟ یہ ننگ مشرق تھا، جو فخر مغرب ہیں، سوال ان کی بابت ہے۔ یہ مشرقی تخیل کا اسفل سافلین تھا، لیکن جو مغربی تخیل کا اعلےٰ علیین ہے اس کے صحن چمن میں گلگشت کے بعد، پند و موعظت، سلوک و معرفت عبرت و اخلاق، کے کتنے گلدستے تیار ہو سکتے ہیں ؟

(۲)

نواب مرزا کا شاہکار بہارِ عشق نہیں، زہرِ عشق ہے، اس کے نام کو بری یا بھلی جو کچھ بھی شہرت حاصل ہے۔ اسی زہرِ عشق کے طفیل میں ہے۔ یہ مثنوی بہارِ عشق سے چھوٹی ہے کوئی پانچ سو شعر ہونگے، بحر وہی، زبان وہی، طرز بیان وہی، لیکن درد و اثر کے اعتبار سے اس سے بڑھ چڑھ کر۔ بہارِ عشق کا خاتمہ وصل کی شادمانی پر ہوا تھا، زہرِ عشق کا انجام ہیروئن کی خودکشی اور عاشق کے اقدام خودکشی پر ہوتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ نظم بہارِ عشق کے مقابلہ میں بہت مہذب اور سنجیدہ ہے۔ عریانی اس میں اگر ہے بھی تو بس اتنی جتنی ہر عاشقانہ افسانہ میں ہوتی ہی ہے۔ ہیروئن اس کی بھی کوئی عصمت مآب نہیں، لیکن دوسری طرف کوئی "لکھا بیسوا" بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شریف گھرانے کی ایک الھڑ لڑکی، نوعمری کی نادانیوں میں مبتلا ہو گئی ہے تاہم غیرت و عزت سے بالکل ہاتھ نہیں دھو بیٹھی ہے۔

لکھنؤ میں شروع شروع تھیٹر کا رواج ہوا تو کسی کمپنی نے اس تماشہ کو اسٹیج پر بھی دکھایا تھا۔ پرانے لوگوں سے یہ روایت سننے میں آئی ہے کہ گنہگار کنواری کے جنازہ کا اٹھنا اور اس کے پیچھے پیچھے غم زدہ والدین کا ماتم کرتے ہوئے چلنا اور پچھاڑیں کھا کر گرنا، جب دکھایا گیا تو تماشہ گاہ ایک بزم عزا بن گئی، لکھنؤ کی نزاکت، قیامت خیز واقعیت کی نقل کا بھی تحمل نہ کر سکی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کا تار بندھ گیا۔ بعضوں کو غش آگئے اور ایک آدھ

نے شاید خودکشی کی بھی ٹھان لی۔ اس پر تماشہ کا دکھانا قانوناً ممنوع ہو گیا اور کتاب کی اشاعت بھی عرصہ تک بند رہی۔ اب چند سال ہوئے لکھنؤ کے مطبع مجتبائی نے پھر شائع کیا ہے۔ میرے پیش نظر اس مطبوعہ نسخہ کے علاوہ ایک بدخط قلمی نسخہ بھی ہے، اندازے سے کوئی پچاس ساٹھ سال اُدھر کا لکھا ہوا۔

کتاب کے سرنامہ پر حمد باری و نعت رسول کی مہریں ثبت ہیں ؎

لکھ قلم پہلے حمد ربِّ ودود   کہ ہر ایک حباب ہے وہی موجود
ذات معبود جاودانی ہے   باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے
ہمسر اس کا نہیں، ندیم نہیں   سب ہیں حادث، کوئی قدیم نہیں
مدح احمد زبان پر کیونکر آتے   بحر کوزہ میں کس طرح سے سماتے
ذات احمدؐ کو کوئی کیا جانے   یا علی جانے یا خدا جانے

آگے چل کر بجائے جہاں پناہ کی مدح کے ۱۲،۱۰ اشعار عشق کی تعریف و تعارف میں ہیں، ان میں سے بعض شعر اپنی صفائی و روانی کی بنا پر عام زبانوں پر چڑھ گئے ہیں ؎

عشق سے کون ہے بشر خالی   کر دیئے اس نے گھر کے گھر خالی
پڑتے ہیں اس میں جان کے لالے   ڈالی ہے جگر میں یہ چھالے
اس سے اُمید رکھنا ہے بے جا   بھائی مجنوں سے کیا سلوک کیا
آتش ہجر سے جلاتا ہے   آگ پانی میں یہ لگاتا ہے
مار ڈالا تماشبینوں کو   زہر کھلوا دیا حسینوں کو

قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ؎

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر   وہیں رہتا تھا ایک سوداگر

اُس کے ایک نوعمر حسین لڑکی تھی، ماں باپ کی آنکھ کا تارا۔لکھی پڑھی، نستعلیق۔ ایک روز اپنے کوٹھے پر آئی، نواب مرزا سے آنکھیں چار ہوگئیں۔ یہ حضرت تو اپنا دل نذر کرنے کے لئے ہر وقت ہتھیلی پر لئے پھرتے ہی تھے، کھٹ سے عاشق ہوگئے اور اپنے ماں باپ کے سامنے خوب خوب فیل لائے۔ اب کی عشق یک طرفہ نہ تھا، اُدھر بھی اثر ہوچکا تھا، ایک روز ایک ماما، نامۂ شوق چپکے سے لاکر شوقؔ کے ہاتھ میں دے گئی۔ خوشی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں، اور خوشی سے پُرنم آنکھوں کے ساتھ کھول کر پڑھا ؎

ہو یہ معلوم تم کو بعد سلام — غم فرقت سے دل ہے بے آرام

شکل دکھلائیے کبریا کے لئے — بام پر آ ذرا خدا کے لئے

دل کی چوٹ بُری ہوتی ہے۔ لڑکی محبت کی ماری، عقل و ہوش سے اندھی ہوچکی ہے پھر بھی شریف زادی ہے، اس لئے قلم اس سے زیادہ بے حیائی پر نہیں اُٹھ سکتا، فوراً اپنی خودداری کو یوں سنبھالتی ہے ؎

سارے اُلفت نے کھو دیئے اوسان — ورنہ یہ لکھتی میں خدا کی شان

اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے — جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

اس محبت پہ ہو خدا کی مار — جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار

عاشق صاحب یہ پڑھ کر بھلا جامہ میں کہاں سما سکتے تھے، ایک جواب بحر طویل میں دھر گھسیٹا۔ جا و بیجا، مناسب و نامناسب، سبھی کچھ زبانِ قلم نے اُگل ڈالا، اُدھر سوداگر زادی بھی بڑی برق دم نکلیں، انہیں کے جوڑ کی۔ کھوٹے کھرے مال کی خوب پرکھ رکھتی تھیں۔ پیام "شوق" پڑھ کر خوب لطف لیا۔ اور ہنس کے بولی کہ "واہ وا کیا خوب!" جواب لکھنے بیٹھی تو بسم اللہ یوں کی "کچھ قضا کو نہیں ہے دامنگیر"، اور پھر خوب خبر لی ؎

ذکر ان باتوں کا یہاں کیا تھا | چھیڑنے کو یہ تیرے کہا تھا
یہ تو لکھے تھے سب ہنسی کے کلام | ورنہ ان باتوں سے ہے کیا کام
مجھ کو ایسی تھی تیری کیا پروا | بام پر تو بلا سے آ، کہ نہ آ
تم پہ مرتی، میں کیا قیامت تھی | کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
میری جانب سے یہ گماں کیا خوب | جھوٹ جم جم سے ہے بہت مرغوب
کالا دانہ ذرا اُتروا لو! | رائی لون اس سمجھ پہ کروا لو
دیکھ تحریر فیل لائے آپ | خوب جلدی مزے میں آتے آپ

چند روز اسی طرح مزہ مزہ کی نوک جھونک جاری رہی۔ اس کے بعد ایک جمعرات کو وہی درگاہ کی زیارت کا چلتا ہوا فقرہ کام آیا۔ شامت کی ماری کی سواری، والدین کے گھر سے چلی اور نواب مرزا کی ڈیوڑھی پر آ کر رکی۔ آگے جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ شرافت لٹی، عزت ڈوبی۔ آمد و رفت کا سلسلہ اس کے بعد قائم ہو گیا۔ لیکن یہ چوری چھپے کی ملاقات کب تک راز رہ سکتی تھی۔ گھر والوں کو ٹوہ لگ گئی۔ اور والدین نے اپنی رسوائی دفع کرنے کو یہ تجویز کیا، کہ لڑکی کو لکھنؤ سے دور شہر بنارس میں کسی عزیز کے پاس پہنچا دیا جائے۔ ادھر لڑکی کو بھی سن گن مل گئی۔ دل نے کہا کہ .. ہائے کٹ جانے کی بات ہے، ماں باپ کو بھی آخر اس روسیاہی کی خبر ہو گئی۔ اب ان کا سامنا کیا کیسے جائیگا؛ اس زندگی سے تو موت بھلی! نو عمری کا زمانہ، دل دنیا کی تلخیوں سے نا آشنا، حوصلے زندہ، اور ولولے تازہ۔ سامنے دنیا اور اس کی بہاریں، ابھی لڑکی ہی ہے۔ کوئی پیرزال نہیں، کچھ بیمار دکھی بھی نہیں۔ بس بات کیا ہے، صرف اتنی کہ رگوں میں مشرقی شرافت کا خون گردش کر رہا ہے دماغ میں خاندانی روایات کی یاد محفوظ ہے، دل میں غیرت و حمیت کی آن باقی ہے۔ جان جیسی عزیز چیز سے ہاتھ دھونا گوارا، لیکن اس کی برداشت نہیں کہ سب عزیزوں، قریبوں کی نظروں

ہیں ذلیل و رسوا ہو کر زندگی بسر کی جائے۔ بس یہ دل میں ٹھان آخری ملاقات کے لئے عاشق کے پاس آتی ہے ـــــ جان دینا تو عاشقوں کا کام سمجھا جاتا ہے یہاں جان دینے پر وہ آمادہ ہے جو خود اس قابل ہے کہ دوسرے اس کے اوپر اپنی جانیں فدا کرتے ! ؎

تھی نہ فرصت جو اشکباری سے   اتری روتی ہوئی سواری سے

شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں عاشق و معشوق کی جدائیوں اور وداعی ملاقاتوں کے منظر بارہا دکھائے ہیں ۔ خودکشی ، اقدام خودکشی ، اور مصنوعی خودکشی کے منظروں سے بھی اس کے صفحات خالی نہیں - اور رومیو جولیٹ کے بعض سماں تو بہت ہی موثر اور درد انگیز سمجھے جاتے ہیں ، لیکن ہے اس فرنگستان کے مشہور و ممتاز ڈرامہ نگار کے ہاں کوئی منظر جو اثر و عبرت انگیزی میں مشرق کے اس بدنام شاعر کے کھینچے ہوئے نقشہ کا مقابلہ کرسکے ؟

خیر وہ حسرت نصیب آتی ہے اور کہتی ہے ؎

اشقربا ہو گئے مرے آگاہ   تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ

وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں   جبر کیونکر یہ اختیار کریں !

گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس   پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

لیجئے کہاں ابھی غفلت کے قہقہے بلند ہو رہے تھے ، اور کہاں عبرت کا درس شروع ہوگیا ! دنیا اور اس کی ساری دلفریبیاں ایک ایک کرکے رخصت ہو رہی ہیں ، اب سابقہ پڑنے کو ہے بندی کا اپنے مالک سے ، کمزور کا زور والے سے ، بے بس کا قدرت والے سے ، غفلتیں دور ہوگئیں ، مدہوشیاں کافور ہو چلیں ۔ شمع جھلملانے لگی ، چہرہ پر زردی چھا گئی اب نہ جوانی میں وہ لذت و سرور ، نہ حسن و رعنائی میں وہ پندار و غرور ۔ اب ندامتیں ہیں اور اشکباریاں عبرتیں ہیں اور آہ و زاریاں ـــــ موت کی آمد نے تنک ہر غافل کو اسی طرح جھنجھوڑ کر ہوشیار

کر دیتا ہے ۔

جائے عبرت سرائے فانی ہے ۔۔۔ مورد مرگ ناگہانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے ۔۔۔ آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے ۔۔۔ آج دیکھا تو خار بالکل تھے
بات کل کی ہے نوجوان تھے جو ۔۔۔ صاحب نوبت و نشان تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی ۔۔۔ نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرت حور مہ جبیں نہ رہے ۔۔۔ ہے مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام ۔۔۔ کون سی گور میں گیا بہرام
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج ۔۔۔ آج وہ فاتحہ کو ہیں محتاج
تھے جو خود سر جہاں میں مشہور ۔۔۔ خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے ۔۔۔ نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے ۔۔۔ استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
تاج ہیں جن کے ٹکتے تھے جو ہر ۔۔۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسہ سر
اک یوسف جو تھے جہاں میں حسیں ۔۔۔ کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے ۔۔۔ یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ ۔۔۔ نہ کسی جانل و دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے ۔۔۔ باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کر طائران خوش الحان ۔۔۔ پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے ۔۔۔ آج وہ، کل ہماری باری ہے

موت کے تصور سے اچھے اچھے دلیر اور سورما لرز اٹھتے ہیں، یہ تو بے چاری ایک پردہ نشیں لڑکی ہی تھی، کمسن و نادان۔ یہ وصیتیں کرتے وقت اس کے جسم نازک کے اندر کے قلب نازک کی کیا حالت ہوگی؟ — آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے، دل کا ہول بڑھتا جاتا ہے۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے۔ کلیجہ میں پتھے لگے ہوئے ہیں۔ زبان لڑکھڑا رہی ہے آواز تھرا رہی ہے، الفاظ پورے پورے ادا نہیں ہو پاتے، پھر بھی تقدیر کے نوشتہ پر صبر کر کے، طبیعت کو سنبھالتی جاتی ہے، آنسو پونچھتی جاتی ہے اور کہتی ہے ؎

ہم اگر جان دے دیں کھا کے سم	تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہمجولیوں میں بہلانا	یا مری قبر پر چلے جانا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور	ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی	ڈھونڈنے کس طرف کو جائے گی!
رو کے رہنا بہت طبیعت کو	یاد رکھنا مری وصیت کو
میرے مرنے کی جب خبر پانا	یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہو لیں سب اقربا جس دم	رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم	ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی	دور پہنچے گی میری رسوائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے	لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب امیر	قبر پہ بیٹھنا نہ ہو کے فقیر

گنہ گار سوداگر زادی، اپنے گناہ کا احساس رکھتی تھی، خلق میں اپنی رسوائی سے شرماتی بھی، کوئی امریکی آرٹسٹ، کوئی فرنگی "فلم اسٹار" نہ تھی، کہ فخر اپنی بے حیائی پر اور ناز اپنی سیاہ کاری

پر کرتی۔ گناہ گار بننا قسمت میں لکھا کر آئی تھی، سوبن چکی۔ لیکن گناہ کی اشاعت کی روادار کسی حال میں نہ تھی۔ دامنِ عصمت داغدار ہونا تھا، ہو چکا، پھر بھی عزت کے معنی سے واقف تھی شرافت کی قدر و قیمت پہچانتی تھی۔

پردہ پوشی کے لئے کیسی کیسی منت و سماجت کرتی ہے ؎

سامنا ہو ہزار آفت کا　　پاس رکھنا ہماری عزت کا

جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں　　آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں

میری منت پہ دھیان رکھیئے گا　　بند اپنی زبان رکھیئے گا!

تذکرہ کچھ نہ کیجیئے گا مرا　　نام منہ سے نہ لیجیئے گا مرا

اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا　　ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا

آپ کاندھا نہ دیجیئے گا مجھے　　سب میں رسوا نہ کیجیئے گا مجھے

ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے　　تاکسی شخص پر نہ حال کھلے

ذکر سنکر نہ میرا رو دینا　　میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

کہتے ہیں مرد کی خاطر عورت اپنے کو مٹا دیتی ہے۔ فنا کر ڈالتی ہے۔ کم از کم ہندوستان کی عورت کا تو بیشک یہی حال ہے۔ خود تو جان دے رہی ہے مگر یہ اب بھی گوارا نہیں کہ مرد کا رویاں میلا ہو۔ آشتی و تسلی کا دھیان آخری سانس تک قائم ہے ؎

رنج کرنا نہ میرا ہی قرباں　　سن لو گر اپنی جان ہے تو جہان

دے نہ اس کو خدا کبھی کوئی درد　　ہوتا نازک کمال ہے دلِ مرد

دل میں گھٹنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو　　جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تو

رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں　　تا نہ ہو جائے دشمنوں کا خوں

کبھی آجائے گر ہمارا دھیان | جاننا ہم پہ ہو گئی قرباں
دل میں کچھ آئے نہ تجھ کو نہ ملال | خواب دیکھا تھا کبھی تو یہ خیال
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو | آج دل کھول کر گلے مل لو
خوب سا آج دیکھ بھال لو تم | دل کی سب حسرتیں نکال لو تم
دل میں باقی رہے نہ کچھ ارمان | خوب مل کر گلے سے ہیں قرباں
حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں | ہم کہاں، تم کہاں یہ رات کہاں
دل کو اپنے کرو ملول نہیں | رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں

اپنی آنکھوں سے ندی نالے جاری کر رکھے ہیں، لیکن مرد کے چہرہ کی اداسی دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے

رو نہ اس طرح سے تو زار و قطار | دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار
کر نہ رو رو کے اپنا حالِ زبوں | ارے ظالم ابھی تو جیتی ہوں
اشک ہوتے ہیں ناگوار ترے | تو نہ رو ہو گئی نثار ترے
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں | یوں کہیں مرد بھی روتے ہیں
تو سلامت جہاں میں رہ مری جان | نکلیں ماں باپ کے ترے ارمان
واسطے میرے اپنا دل نہ کڑھا | چاند سی بنّو گھر میں بیاہ کے لا
ہے یہی لطف زندگانی کا | دیکھ سکھ اپنی نوجوانی کا

حسنِ بے شبانہ کی نیرنگیاں ختم ہو رہی ہیں، عشقِ فانی کی ساری لذتیں ایک ایک کرکے یاد آ رہی ہیں، اور چل چلاؤ کے وقت نفس پہ ہجوم کر رہی ہیں ہے

کل گلے سے کسے لگاؤ گے | یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے

ہم تو اٹھتے ہیں اس مکان سے کل — اب تو جاتے ہیں اس جہاں سے کل

یاد اتنی تمہیں دلانے جائیں — پان کل کے لیے لگاتے جائیں

دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے — کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے

ختم ہوتی ہے زندگانی آج — خاک میں ملتی ہے جوانی آج

سمجھ اس کو شب برات کی رات — ہم ہیں مہمان تمہارے رات کی رات

پھل اٹھایا نہ زندگانی کا — نہ ملا کچھ مزہ جوانی کا

باغ عالم سے نامراد چلے — دل میں لے کر تمہاری یاد چلے

پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبت یار — کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار

لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی — بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

پھر ہم اٹھنے لگیں بٹھا لو تم — پھر بگڑ جائیں ہم منا لو تم

پھر لبوں کو چبا کے بات کرو — پھر ذرا مسکرا کے بات کرو

یہ آخری راز و نیاز کتنی دیر؟ یہ زندگی کا آخری اختلاط کی گھڑی؟ جھلملاتی ہوئی چراغ کی آخری بھڑک کب تک؟ مادی لذتیں ختم اور جسم کے مزے ایک ایک کر کے تمام ہو رہے ہیں۔ ناسوتی صحبتوں کا تار تار بکھرنے کو ہے۔ نفس کی ماری ہوئی، لیکن غیرت دار گنہگار مگر گناہ کی معترف، عزت لٹاتے ہوئے لیکن بہرحال پاس عزت رکھنے والی پردہ نشیں کی آنکھوں سے پردے ہٹ رہے ہیں۔ "آج" ختم ہو رہا ہے، "کل" شروع ہو رہا ہے۔ حسن و جوانی، نزاکت و رعنائی، چہرہ کا رنگ و روغن، سب کی نمود مٹی ہی سے تھی اور سب مٹی ہی میں ملے جا رہے ہیں۔ رفاقت پر کوئی آمادہ نہیں۔ حاضری اس دربار میں در پیش ہے، جہاں بدکاری الگ رہی، ایک ایک بدنظری کا پورا پورا حساب درج ہے، سامنا اس مالک کا کرنا ہے، جس نے خلاف قانون آنکھ اٹھانے تک پر باز پرس رکھی ہے۔ روبکاری اس حاکم کی عدالت میں ہے

جس کی ہیبت سے بڑے بڑے متقی اور صالحین لرزتے رہتے ہیں یہ نازک جسم اور نازک تر قلب رکھنے والی، گناہوں کے بوجھ سے لدی ہوتی، حرام موت مرنے والی لڑکی، اس نازک گھڑی میں آخر کس کا سہارا پکڑے، اور کس کی نگاہ کرم کی آس لگائے؟ اے ہر مشکل کو آسان کرنے والے اس دکھیاری کی مشکل کو تو ہی آسان کر۔ تیری ہی ستاری کا دامن اس بے چادر کی پردہ پوشی کر سکتا ہے۔ تیرے ہی بحر مغفرت کا ایک قطرہ اس بدنصیب کے نامۂ عمل کی سیاہیاں دھو ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ تیری یاد سے غفلت بے شبہ تھی، پر تیری حکومت سے سرکشی نہ تھی۔ نفس کی لغزشیں یقیناً تھیں پر تیرے احکام سے جان کر بغاوت نہ تھی۔ ایمان کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ڈھارس بندھاتی ہے۔ فاتحہ، قرآن خوانی اور دعائے خیر کی قدر "آج" کنگھی چوٹی کے مشغلہ نے نہ کرنے دی، "کل" کے لئے سب سے زیادہ قیمتی چیزیں یہی نظر آرہی ہیں ؎

اب تم اتنی دعا کرو مری جان — کل کی مشکل خدا کرے آسان

اگر آجائے کچھ طبیعت پر — پڑھنا قرآن میری تربت پر

غنچۂ دل مرا کھلا جانا — پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

دیکھئے کس طرح پڑے گی کل — سخت ہوتی ہے منزل اول

میرے مرقد پر روز آنا تم! — فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم

گو میں دنیا سے روسیاہ چلی — لیکن اپنی سی میں نباہ چلی

جی کو تم پر فدا کیا میں نے — حق وفا کا ادا کیا میں نے

کانپتے ہوئے جسم، زار و قطار آنکھوں، لرزتی ہوئی زبان کے ساتھ، دل کی بیتی بیان ہو رہی تھی کہ رات تمام ہو جاتی ہے۔ اور اس کمسن نازنین کے ڈوبتے ہوئے دل کی طرح، آسمان کے تارے بھی ایک ایک کر کے ڈوبنے لگتے ہیں۔ صبح کا گھڑیال بجتا ہے، اور سانس کے ساتھ نا سو...

کرشموں کے جنجال میں پھنسے ہوئے جوڑے کی آخری ملاقات بھی اس عالم آب و گل میں ختم ہو جاتی ہے۔ کلمہ کی آواز کبھی کی سُنی سُنائی کان میں پڑی ہوئی تھی، وہی اس آڑے وقت پر کام آتی ہے ؎

ہو گیا فرطِ غم سے چہرہ زرد　　دست و پا تھرا کے ہو گئے سرد
بید کی طرح جسم تھرایا　　سر سے لے پاؤں تک عرق آیا
باتیں جو کرتی تھی سو بھول گئی　　دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی
بولی گھبرا کے رہیو اسکے گواہ　　اور کہا لا الٰہ الا اللہ
اب فقط ہے یہ خون بہا　　بخش دیجو کہا سنا میرا
سر سے لے کر بلائیں تا القدم　　بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم
آگ لگ جائے وہ گھڑی کم بخت　　بام پر آئی تھی میں کون سے وقت

یہہ کہا اور سوار ہو گئی، چند گھنٹوں کے بعد محلہ میں شور شین برپا ہوا جب کر دیکھا تو سوداگر کے گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ گنہگار شریف زادی نے جو کہا تھا، کر دکھایا۔ جوانی کی نیند مشہور ہے لیکن یہہ زہر کھا کر وہ نیند سوئی تھی جس میں قیامت تک بیداری نہیں۔ یہ تھے "آغاز" کی بدمستیوں کا "انجام"! پھولوں کی سیج پر رات بسر کرنے والی کو آخری چادر وہی کفن کی نصیب ہوئی، اِتنی جلد! اس کم سنی میں! ایسی ایسی آناً فاناً!

جوان جہان اولاد، نازوں کی پالی اکلوتی اولاد، کون انسانی سینہ تھا جو اس داغ کو آسانی سے برداشت کر سکے، لڑکی ماں کی آنکھ کا تارا، باپ کے کلیجہ کا ٹکڑا اندھیرے گھر کا چراغ، سات بیٹوں سے بڑھ کر پیاری تھی، گھر بھر میں کیا معنی محلہ بھر میں ہنگامۂ محشر برپا ہو گیا۔ بڑھے والدین کی یہ حالت کہ کھڑے پچھاڑیں کھا کھا کر گرتے تھے،

اور بین کچھ اس درد کے ساتھ کر رہے تھے، کہ اپنے تو خیر اپنے تھے، راہ چلتے بیگانوں کی ہچکیاں بندھ بندھ جاتی تھیں۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں، جنہوں نے گودوں میں کھلا کھلا کر پالا تھا، نہا بچوں پر تھپک تھپک کر سلایا تھا، ساتھ کی کھیلی ہوئی سہیلیاں اور ہمجولیاں، کوئی پردہ کے اندر، کوئی پردہ کے باہر، دوپٹہ کا ہوش نہ چادر کی خبر، منہ پیٹنے، بال نوچنے میں مصروف غسل و کفن کے بعد جب جنازہ مرتب ہو کر چلا ہے، تو اس سج دھج کے ساتھ کہ بن بیاہی نامراد کے تابوت پر دھوکا بیاہی ہوئی دلہن کے ڈولے کا! بے شک دلہن ہی تھی، آج رخصتی اس دیس کو ہو رہی تھی، جہاں سے پھر کوئی میکہ واپس نہیں آتا ؎

شامیانہ نیا زری کا ہے — نیچے تابوت اس پری کا ہے
سہرا اس پر بندھا ہے اک زرتار — جیسے گلشن کی آخری ہو بہار
عود سوز آگے آگے روشن تھے — مر گئے پر بھی لاکھ جوبن تھے
بھیڑ تابوت کے تھی ایسی سات — جیسے آئے کسی دلہن کی برات

خیر، اور تو جس پر جو بیت رہی تھی بیتی ہی، اس "ماستا کی ماری" کا کیا حال تھا جس کی ہری بھری گود ابھی خالی کرائی گئی تھی عمر بھر کی کمائی دم کے دم میں واپس لے لی گئی تھی کلیجہ ابھی ابھی تیروں سے چھد چکا تھا۔ کس انسانی قلم میں قدرت ہے کہ اس کے داغ دل کا نقشہ صفحۂ کاغذ پر کھینچ سکے! آہ کہ جس کے دل میں بیٹی کی مانگ بھرنے کا ارمان ڈالا گیا تھا، اسی کے ہاتھوں اس لاڈلی کو کفن پہنوایا جا رہا ہے! آہ کہ جو آنکھیں بیٹی کا سہاگ دیکھنے کے انتظار میں نور حاصل کر رہی تھیں، انہیں کو اسے سینکڑوں من مٹی کے نیچے دفن ہوتے دکھا کر بے نور کیا جا رہا ہے!

نواب مرزا! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت، کہ تو نے کوکھ اجڑ جانے والی ماں

کے جذبات کی تصویر بھی کاغذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔ ماں کے منہ سے یہ بول نکل رہے ہیں یا دل و جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں؟ ؎

تیری میت پہ ہو گئی ہیں نثار
کم سخن ہائے میری غیرت دار

دل پہ جو گذری کچھ بیان نہ کی
کچھ وصیت بھی میری جانؔ کی

کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو
کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو

دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں
بٹیا اماں کو کس پہ چھوڑ گئیں

تازہ پیدا جگر پہ داغ ہوا
گھر مرا آج بے چراغ ہوا

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے
جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے

زہر دیدے کوئی تو کھا جاؤں
یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں

داغ تیرا جگر جلاتا ہے
چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے

بیاہ تیرا رچانے پائی نہیں
کوئی منت بڑھانے پائی نہیں

تیری صورت کے ہو گئی قربان
چلیں دنیا سے کیسی پر ارمان

ہوئی کس بات پر خفا بولو
اماں واری ذرا جواب تو دو

بولتی تم نہیں پکارے سے
اب جیونگی میں کس سہارے سے

کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا
آج گھر میرا بے چراغ کیا

نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارمان
ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پروان

ایسی اماں سے ہو گئیں بیزار
لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار

عمر کٹنی تھی ایسے صدمہ میں
ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

مشرق کے بدنام سخن گو، اردو کے بدنام شاعر، رخصت! تو درد بھرا دِل رکھتا تھا، تیری

یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ تو نے موت کو یاد رکھا، تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی۔ تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا، شاید کسی کی رحمت بے حساب پر تکیہ کر کے لیکن انہیں غافلوں اور سرمستوں کو موت و انجام کی یاد دلا دلا کر بھی خوب رُلایا، کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کر کے۔ عجب کیا کہ خدائے آمرزگار، اس عالم کا ستّار اور اُس عالم کا غفّار، تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامنِ عفو و مغفرت کے سایہ میں لے لے، اور تیرے کلام کے درد و عبرت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا اجر بھی تجھے عطا کرے، اپنی ہی رحمت کی مناسبت سے، اپنے ہی کرم کے حساب سے!

الفاظ کا جادو[1]

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی "سرا" میں ٹھہرنا آپ کے لئے باعثِ توہین، لیکن کسی "ہوٹل" میں قیام کرنا ذرا بھی باعثِ شرم نہیں۔ حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ "سرا" مشرقی ہے، ہندوستانی ہے، دیسی ہے، اور "ہوٹل" مغربی ہے، انگریزی ہے، ولایتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہدے کہ سرا کے فلاں "بھٹیارے" سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہوجاتے ہیں، لیکن فلاں ہوٹل کے "مینجر" سے آپ سے بڑا ربط وضبط ہے، اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں! حالانکہ سرا کے "بھٹیارے" اور ہوٹل کے "مینجر" کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں ہے؟ کسی مدرسہ میں اگر آپ "مدرس" ہیں تو بس کچھ معمولی ہی سے، لیکن کسی "کالج" میں اگر آپ "لکچرر" یا "پروفیسر" ہیں تو معزز ہیں، صاحبِ وجاہت ہیں، حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے "مدرس" اور "پروفیسر" بالکل ایک چیز ہیں۔

ندوہ کے "دارالاقامہ" میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل کچھ خوش نہیں ہوتا، لیکن اسی "دارالاقامہ" کا نام جب آپ "شبلی ہوسٹل" سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے! مدرسہ میں اگر آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ

---

[1] سچ ۔ جلد ۷، نمبر ۴۲ مورخہ ۲۶ رجون ۱۹۳۱ء نظرِ ثانی مارچ ۱۹۴۴ء

بے وقعت ہیں، لیکن اگر آپ کا تعلق کسی "کالج" سے ہے، تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟
اب ہر "مدرسۂ طبیہ، طبیہ" "اسکول" ہے اور "مدرسۂ تکمیل الطب" اور "مدرسہ" منبع الطب"، اب
"تکمیل الطب" "کالج" اور منبع الطب "کالج" ہیں۔ "مدرسہ" طبیہ واجبیہ کا زمانہ گیا، اب اس کا
صحیح نام طبیہ واجبیہ "کالج" ہے اطبی درسگاہوں کو چھوڑیئے، خود دینی درسگاہوں کا کیا حال
ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر "مدرسۂ" چشمۂ رحمت کا تذکرہ تھا،

، اب وہ چشمۂ رحمت" کالج" ہے اور وہاں کے "صدر مدرس" "پرنسپل" صاحب ہیں،
فرنگی محل کے مدرسہ نظامیہ کے سب سے بڑے اُستاد کو "صدر مدرس" ذرا کہہ کے تو دیکھئے، فوراً
آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب "صدر مدرسی" کا نہیں "پرنسپلی" کا ہے!

کوئی آپ سے کہے کہ یہ کیا آپ گلی میں کھڑے ہو کے "گلی ڈنڈا" کا تماشہ دیکھ رہے
ہیں تو آپ شرما جائیں گے، لیکن جب آپ "کرکٹ" یا "فٹ بال" یا "ہاکی" کا میچ کھلے میدان میں
کھڑے دیکھ رہے ہوں گے، تو اس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے، نہ چھوٹوں سے!
مینڈھے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑ لئے گئے تو آپ
اپنے کو کسی کے سامنے اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے، لیکن جب آپ کے شہر میں Boxing
کا مقابلہ ہوگا، یا کوئی Heavy weight champion آجائیں گے
تو اُن کے کمالات کا تماشہ دیکھنا روشن خیالی میں داخل! کہیں چوری چھپے "رہس" یا "نوٹنکی" دیکھنے
کھڑے ہو جائیے تو خود آپ کی ثقاہت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے، لیکن "تھیٹر"
میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجئے کہ "ڈراما" جیسے فن شریف کی شرافت و عظمت میں کس کو
کلام ہو سکتا ہے؟ اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ، کسی ڈھاڑی سے، اگر آپ سے شناسائی
ہو گئی ہے تو اس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف ہمعمروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ ہی کر

کرتے ہیں، لیکن چارلی چیپلن اور میری پکفرڈ کے کمالاتِ فن اور "آرٹ" کی جتنی داد، جی
چاہے دیجئے بھری محفلوں میں بزرگوں اور استادوں کے مجمع میں، اور اخبارات کے صفحات
میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی چلی جائے گی! "نٹوں" کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے
اور خدانخواستہ آپ سے کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی، لیکن فرنگی قلابازیاں
کھانے والے، جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر۔ آپ کے سامنے آتے ہیں تو نہ آپ
ان سے ملنے میں شرماتے ہیں ، نہ ان سے تعلقات
بڑھاتے ہیں!

جوئے یا جواریوں سے، ظاہر ہے، ہماری شرافت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ کوئی ہمیں
جواری کہہ دیکھے، اپنی جان اور اس کی جان ایک کردیں، لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیول
کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں، یہی ذلت ہمارے لئے عین عزت بن جاتی ہے
اور بڑے سے بڑے شریف و معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے شرماتے ہیں، اور نہ اپنے کو
"ریس باز" کہلاتے! نخاس میں کسی "کباڑیئے" کی دوکان پر مول تول کرنا ہماری عزت و شرافت
کے لئے باعثِ ننگ، لیکن مال روڈ پر "پیک ایلین" کی کوٹھی پر گشت لگانے میں نہ کوئی عار ہے
نہ شرم، اسلئے کہ پیک ایلین صاحب کوئی "کباڑیئے" تھوڑے ہی ہیں، "آکشنر" اور "نیلامیئے"
ہیں! چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خرید لیجئے تو جاننے
والوں کی نظروں سے بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ویلیریلو کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر بلا تکلف
روکئے اور کیک و پیسٹری کی خریداری بہ نفسِ نفیس بے جھجک فرمائیے، اسلئے کہ "ویلیریلو" حلوائی
نہیں "کنفکشنر" ہے! نظیر آباد کے چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ کا گلاس
خریدنا آپ کی خودداری کے منافی لیکن حضرت گنج میں "صاحب" کی جگمگاتی ہوئی دوکان پر بیٹھ کر

آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق! کسی "نانبائی" کی دکان کا نام اگر "ریسٹوران" پڑ جائے تو وہی عار، فخر میں تبدیل ہو جاتی ہے! "نائی" بے چارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اس کے استرے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کیونکر گوارا فرما سکتے ہیں، لیکن وہی نائی جب اپنے کو Hair Dresser کہلانے لگے، اور اپنی چوراہے کی دوکان پر "ہیر کٹنگ سیلون" کا سائن بورڈ لگا دے، تو وہی ناگوار آپ کے لئے بطیب خاطر گوارا و پسندیدہ بن جائے۔

عدالت کا پیادہ جب تک "چپراسی" یا "مذکوری" ہے، حقیر و ذلیل ہے، لیکن وہی پیادہ اگر "بیلف" کہہ کر پکارا جاتا ہے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں بلکہ "بیلف صاحب" ہے! کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ اسے منہ لگائیں، لیکن وہی رذیل اگر کسی ٹینری (Tannery) کا مالک کہلانے لگے، تو معاً اس کی رذالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے۔ اور دنیا کے سب سے بڑے موچی باٹا (Bata) کی قوم سے تعلق رکھنا تو عین دلیل افتخار! بستی کا ساہوکار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو، آپ کی نظر میں محض "بنیا" ہے لیکن وہی بنیا۔ اگر کسی بینک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو "بینکر" کہلانے لگے، تو دیکھئے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے! کسی رئیس کا "مصاحب" آپ کی نظر میں، اخلاقی حیثیت بے عملی، خوشامد، چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے۔ لیکن صاحب کے "پرائیویٹ سیکریٹری" اور "اے ڈی سی" کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں وسعت و مستعدی رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! "پنچایت" کا نام آیا، اور آپ کے ذہن نے فوراً تیلیوں اور کنجڑوں، نائیوں اور دھوبیوں، اور دوسری "نیچ قوموں" کا تصور شروع کر دیا، لیکن ادھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور میونسپل بورڈ کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن، ان فرنگی پنچایتوں کی بلندیوں پر رشک کرنے لگا

کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے، تو غبی ہے، کودن ہے، کندۂ ناتراش ہے، محض ملاّ ہے، لیکن اگر کسی ایڈوکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور پریوی کونسل کے نظائر ازبر ہیں، تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں! فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام، آج مجال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے، لیکن لنڈن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات، ناولوں کے نام سے سراغرسانی کے افسانوں کے نام سے سنسنی خیز خبروں کے نام سے رعشہ انگیز افتتاحوں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ماہ ہر ہفتہ اور ہر روز ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کرتے ہیں ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی وانہماک کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا روشن خیالی کی دلیل اور مہذب و تعلیم یافتہ ہونے کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ "لوہاری" کا پیشہ اختیار کیجیے، تو آپ اسے گالی سمجھیں لیکن "میکینکل انجنیئری" کے عہدہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں۔ "جرّاح" کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ کس درجہ پست ہے، لیکن "سرجن" کے نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے محلہ اور پڑوس کے جلاہے" آپ کے خیال میں پست دادنیٰ، لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکاشائر کے ہیں، تو کیا ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ "بزاز" گز ہاتھ میں لئے اور مزدور کے سر پر گٹھری اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت و وقعت یقیناً نگاہ میں نہیں، لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں تو بس معززین بلند ہیں! "بزرگوں" کے سالانہ فاتحے منانا دلیل حمق و علامت وہم پرستی، لیکن فلاں ادارہ کے احاطہ میں "فاؤنڈرس ڈے" یا "یوم تاسیس" دھوم دھام سے منانا، دلیل دانش و برہانِ روشن خیالی۔

لکھنؤ کے چوک یا دھلی کی چاوڑی کی کسی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے۔ نہ کسی ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے لیکن ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں کے سامنے ریڈیو سے، بے تکلف آپ فلاں بائی جی اور فلاں بیگم صاحبہ کے نغموں سے لطف اٹھائیں گے! اور فلم ایکٹرس جو بھی آپ کے دل میں جگہ کرلے گی، پوری بیباکی سے آپ اس کے چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنا تے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمونہ کے لئے یہ بھی کافی ہی نہیں، کافی سے زائد ہیں۔ اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجئے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں، فرنگیت کا کتنا دماغی رعب ہم پر، اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے معنی و مفہوم متحد ہوتے ہیں لیکن جو لفظ اور جو نام، فرنگیت کے راستہ سے "صاحب" کے رشتہ سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں، ان میں ان کے دیسی مترادفات سے، کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کرلی ہے! اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کرلئے، قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدان جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا، نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرف مخصوص صرف اسی دور یا جوجی کے لئے اٹھ رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ بھی فتح کرلئے جاتے ہیں، اور اٹھتوں پیروں کے علاوہ عقلوں دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خطِ غلامی لکھا لیا جا رہا ہے کہ "یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس خیر و شر، حسن و قبیح، ہنر و عیب کا معیار لے دے کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ "صاحب" کی چشم التفات کدھر ہے، عزت بھی "صاحب" کی دی ہوئی، اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ، اور

دنیا بھی وہیں کی بخشش، اب نہ ہندو، ہندو ہے، نہ مسلمان، مسلمان۔ سب رعایائے سرکار"
اب مسلمان نہ زید ہے نہ عمر، نہ بکر، اور ہندو، نہ رام ہے نہ کرشن، نہ گوبند، بلکہ سب
کے سب چھٹ چھٹا کر "صاحب دین"

اسماء نکرہ اور الفاظ عمومی کو بھی چھوڑیئے۔ قیامت یہ ہے کہ اعلام اور اسماء معرفہ
تک یورپ زدگی کی وبا سے محفوظ نہیں۔ میاں "کلو" کو آپ نے اپنے ہاں جب دیکھا "اکہ بانی
ہی کرتے پایا، لیکن میجر بلیک (Black) آپ کے شہر کے سول سرجن ہیں!
"کلوا مہتر" آپ کے محلہ ہی میں رہتا ہے، لیکن پروفیسر "بلیکی" (Blackie) یونیورسٹی
کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں! "لالہ گھاسی رام" بیچارے کانجی ہاؤس کی محرری سے عمر بھر آگے
نہ بڑھ سکے، لیکن بریگیڈیر جنرل "ہے" (Hay) برطانوی فوج کے ایک مشہور
و معروف افسر ہیں! "میاں رمضانی" اور میاں شبراتی کی ساری عمر خدمت گاری میں گذری لیکن
مسٹر "مے" (May) اور ڈاکٹر فرائڈے (Friday) پارلیمنٹ کے نامور
ممبر ہیں! "منھو" کہار اور "طوطا" کلوار آپ کی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے
کر رہے ہیں، لیکن سر جان پارٹرج (Partridge) آپ کے صوبہ کے گورنر
تھے، مسٹر "کاک" (Cock) اس وقت تک آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں، اور "سوان" (Swan)
صاحب ابھی تبدیل ہو کر کمشنری پر گئے ہیں! آپ کی ماما کا لڑکا "بشیرا" بے چارہ اب تک
چپراسی کی جگہ کی امیدواری کر رہا ہے لیکن "بل" صاحب (Bull) ترقی پا کر
کمشنر ہو گئے اور مسٹر لیمب (Lamb) اور مسٹر "کِڈ" (Kid).
آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور جائنٹ مجسٹریٹ ہیں! "دریاؤ سنگھ" غریب کو لائن جمعداری
سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا۔ سر جان لیک (Lake) دیکھتے دیکھتے ای،

آئی آر، کے ایجنٹ ہو گئے! لالہ گوہاری مل" کے چیلا نے عز اتعض زلیسی کا کام بھی نہ چیلا، جسٹس اسمتھ (Smith) ہائی کورٹ کی ججی پر پہنچ گئے! شیخ جھاڑو" کی زندگی زرباری کرتے کرتے ختم ہو گئی۔ سر چارلس "ووڈ" (Wood) حکومت ہند کے ہوم ممبر ہیں! "جنگلی" گیارہ بے چارہ عمر گھاس ہی چھیلا کیا، سر جان فاریسٹر (Forrester) سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کانسل جنرل ہو گئے!

جھوٹ میں سچ[1]

"قصّہ گلِ بکاؤلی" بھی کوئی کتابوں میں کتاب ہے؟ عجب نہیں کہ ایک سنجیدہ مقالہ میں اس کا نام دیکھتے ہی بہت سے ہونٹوں پر تبسم آجائے۔ لیکن کیا حرج ہے، اگر کبھی کبھار، خلاف وضع صحبتوں کا بھی تحمل کر لیا جائے، اور پھر دنیا میں یوں بھی تو بارہا ہوا ہے، کہ پھٹی پرانی گدڑیوں کے اندر سے لعل وجواہر نکل آئے ہیں۔

کوئی بادشاہ کہیں کے زین الملوک نام ہیں، ان کے چار لڑکے پہلے سے موجود ہیں۔ پانچواں تاج الملوک پیدا ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد اس پر نظر پڑتے ہی بادشاہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اطبا نے کہا کہ شفا صرف اس پھول سے ممکن ہے جو بکاؤلی پری کے چمن میں ہے۔ چاروں نوجوان شہزادے اس کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں، اور سفر کرتے کرتے ایک مشہور بیسوا کے دروازہ پر پہنچتے ہیں۔ مکان کے اندر داخلہ کی فیس ایک لاکھ زر نقد ہے۔ دولت کے نشہ میں اندھے شہزادے اس کے مکان پر پہنچ کر، اطلاع کے نقارے پر چوب لگاتے ہیں۔ کتاب کوئی اخلاق کا پندنامہ نہیں عشق وعاشقی کا افسانہ ہے، چاہیے تھا کہ مصنف بیسوا کے ذکر میں کھل کھیلتا، اور اس "پری جمال" کے حسن وشباب کی مصوری، اس انداز سے کرتا کہ پڑھنے والے نوجوانوں کے دل میں شوق واشتیاق کی آگ بھڑک اٹھتی، لیکن برعکس اس کے دیکھیے تو یہی کہ اسی موقع پر نظر الفاظ ذیل سے دوچار

---

[1] سچ۔ جلد ۸ نمبر ۴۱ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء۔ نظر ثانی مارچ ۱۹۴۴ء

ہوتی ہے :-

"سنتے ہی اس مکار مدورانی نے دل میں کہا کہ الحمد للہ مدت مدید کے بعد
. . . ایسے موٹے تازے شکار نے میرے جال میں آنے کا ارادہ کیا
اغلب ہے کہ دام میں پھنسے، پھڑک پھڑک کر مرے۔ نقل مشہور ہے کہ یہ طائفہ
اسی تردد میں رہتا ہے کہ کوئی عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا ملے سو خدا نے ویسے
ہی شخص بھیجدئے"۔

ان الفاظ کو، خصوصاً جو عبارتیں زیر خط کر دی گئی ہیں، انہیں پڑھنے کے بعد فرمایئے، کہ شوق و اشتیاق
کی آگ کچھ بھڑکی، یا جو تھی وہ بھی ٹھنڈی ہو کر خاکستر بن گئی ہو کتاب ترقیوں کے دور سے بہت
قبل کی تصنیف ہے، مصنف تاریکی کو روشنی، عیب کو ہنر، زہر کے پیالہ کو شربت کا پیالہ کہہ
کر پیش کرنے کے "آرٹ" سے ناواقف ہے۔ وہ بدی کے چہرہ پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر
اُسے پیش نہیں کرتا، وہ بدی کی جب مصوری کرتا ہے، تو ہانک پکار کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے
للہ اس کے فریب میں نہ آجانا۔

بیسوا ایک چالاکی کے ساتھ شطرنج کا کھیل کھیل کر اپنے ہاں آنے والے امیرزادوں
کو ہرا دیتی تھی، اور پھر ان کی جائیداد لے لوا، انہیں قید میں ڈال دیتی تھی۔ یہی ماجرا ان چاروں
شہزادوں کو بھی پیش آیا۔ بالآخر پانچویں شہزادے تاج الملوک نے اپنی چالاکیوں کے وجہ سے بیسوا
کو ہرایا۔ اور اس کی قید سے اپنے بھائیوں کو چھڑایا۔ یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب کے سب
شہزادے اپنے نابینا والد کی آنکھ کے علاج کے لئے تلاش گل بکاؤلی میں گھر سے نکلے تھے۔
مشرق کی بازاری کتاب کے مصنف کا ظلم ان واقعات سے نتیجہ یہ نکالتا ہے :-

"اے عزیز، تو نے معلوم کیا کہ میں نے کیا کہا۔ اس بات کا حاصل یہ

ہے کہ وِل عرش منزل تیرا جو رونق بخشِ تختِ شاہی کا اور دیکھنے والا مادّہ اور مجرّد کا تھا، جب اس کی آنکھ اس خلقتِ ناپاک پر پڑی، اس کی بصارت کو زنگ لگا، اور دیدۂ روشن تاریک ہو گیا، اب آٹھ اور سُرمہ بینائی ڈھونڈھ، یعنی گُلِ مراد کی تلاش میں کوشش کر، لیکن راہ میں دُنیاء عیارہ کی بازی ہنگر تختۂ فریب بھرا ہوتا ہے، مشغول نہ ہونا مبادا وہ فاحشہ تجھ کو پہلے فریفتہ کر کے بتا دے، اور بعد اس کے مکر کی رملی اور فریب کے چوہے کی مدد سے اچھا پالسہ اپنے حسبِ مرضی پھینکے اور اچانک تیرے توکّل کا سرمایہ آخر ہو جائے، تب تجھ کو دائم الحبس کر رکھے۔ اگر تو صبر کے نیولے کی اعانت سے اس مکارہ کی بازیٔ طلسم کو درہم کر دے، تو وہ فاحشہ جو بادشاہوں اور گردن کشوں کی ہم نشیں نہ ہے، تیری فرمانبردار لونڈی ہو کر چاہے کہ تجھ کو اپنے حُسن و جمال پر لبھائے، پھر اگر تو اس کے منہ پر اُلفت سے نگاہ نہ کرے تو یقین ہے کہ گُلِ مراد کے دامن تک تیرا دست رس ہو گا

ضمناً ایک حکایت ایک سادہ لوح برہمن کی جاتی ہے جس نے ایک بند ھے اور جکڑے ہوئے شیر کی زنجیریں کھول دی تھیں ، اور شیر نے خود اسی پر حملہ کر دیا تھا

تاج الملوک حکایت اس بسوا کی سُناتا ہے۔ اور معاً بعد ایک ناصحِ مشفق بن جاتا ہے :۔

۔۔ اے عزیز، سچ ہے، جو کوئی بے صبری اور شرارت اپنے نفس کی، جو مثل شیر جسم کے پنجرہ میں ہے، گھٹنے اور اس کے حال پر رحم کر کے صبر و توکّل کی رسّی، اس کے ہاتھ پاؤں سے بے محابا کھول دے، تو بہر صورت آپ کو

اُس کا لقمہ بنائے، مگر خضر راہنما کی دستگیری سے بچے تو بچے۔ اے بلیوار یہ
ذکر میں نے اس واسطے کیا جو تو جانے کہ طاقتِ جسمانی، طاقتِ رُوحانی
پر زیادتی نہیں رکھتی، اب تجھے یہ لازم ہے کہ تو رُبِ جسم کے شہزادوں
کو، جو تو نے اپنے مکر و فریب سے قید کیا ہے چھوڑ دے، حق تعالےٰ تجھ
کو بھی دوزخ کی قید سے نجات دے گا۔"

یہ آپ کوئی مبتذل و عامیانہ افسانہ پڑھ رہے ہیں، یا کسی عارف کے حلقۂ موعظت و معرفت میں بیٹھے
ہوتے ہیں؟ یہ مشرق کی گری ہوئی تصنیف ہے، آپ اس کے مقابلہ میں کسی بلند پایہ قصّہ کو دیکھئے۔
تاج الملوک جب آگے بڑھنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ "گلِ بکاؤلی" قلعہ بکاؤلی
کے اندر ہے۔ اور اس کے پہرے پر اٹھارہ ہزار دیو متعین ہیں۔ شہزادہ اس سے ہراساں اور بے آس
نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ دیوؤں کو رام کرتا ہے، اور دیوؤں کی ایک بوڑھی سردارنی حمالہ کا دل
اس حد تک اپنی مٹھی میں لاتا ہے کہ وہ اپنی پروردہ شہزادی محمودہ کا نکاح اس کے ساتھ کر دیتی ہے
افسانہ نگار کا ذہن اس مجاز سے حقیقت کی جانب منتقل ہوتا ہے:۔

"اے عزیز روشنی چشمِ ظاہر بین کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالےٰ
کہ نورِ دیدہ اولیا ہے، ستّر ہزار پردے میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہو کہ
وہ پردے درمیان سے اٹھیں تو پہلے اس بڑے نگہباں دیو نفس کا حجاب
بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر، کہ وہ لعین اپنی کجروی کو چھوڑ کر محمودہ[۱] کے
مقام میں پہنچا دیتے، لیکن یہ بات یاد رکھ کہ اگر دیو سے اٹھا لیجئے تو سیدھا
پڑے۔"

بکاؤلی بیدار ہوتی ہے، اور اس عزیز و عزیز الوجود پھول کو اپنے باغ سے غائب پاکر، سخت

۱ے تلمیح ہے قرآن پاک کے "مقاماً محمودا" کی جانب

پریشان اور ملول ہوتی ہے، پریخانہ کی کنیزیں اور خواصیں صدہا کی تعداد میں ہیں، سب کی تلاش و سعی بیکار ثابت ہوتی ہے، بالآخر ایکاوتی خود اس "چور" کی جستجو میں نکلتی ہے۔ اپنے کو نوجوان مرد کی ہیئت میں تبدیل کرتی ہے، اور تلاش و جستجو میں طرح طرح کی تکلیفیں اور ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے۔ افسانہ نگار اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اور آئین افسانہ نگاری کو بھول بھال یوں درس معرفت شروع کر دیتا ہے:۔

"سبحان اللہ کیا اُلٹی بات ہے کہ معشوق طالب عاشق کا ہوا، اور عاشق اس کا مطلوب، لیکن نظر تحقیق سے جو غور کرے تو سیدھی لگے، کیونکہ جب تک معشوق کو خواہش عاشق کی نہ ہو، اس کی چاہت اکارت ہے اور کوشش بے فائدہ۔ آتش طلب کی جو عاشق کے گریبان سے مشتعل ہے، فی الحقیقت لگائی ہوئی معشوق کی ہے ؎

عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود
گر نہ سوزد شمع، کے پروانہ شیدا می شود

بات بڑھ گئی، قلم کہتا ہے۔ اے شخص بس کر، میں نے لکھنے میں بہت سی کوشش کی، اور ہاتھ اپنی سعی کا دعوٰی کرتے ہیں کہ قلم سے کیا کیا ہم نے لکھا۔ بازو اپنے تردد کا دم مارتا ہے کہ دست و قلم سے کیا ہوا، جو کچھ کیا سو میں نے کیا۔ غرض اس طرح اسباب تحریر کے بڑھے، اور ایک پر ایک کو فوقیت ہوتی گئی، دفعتہً ایک ایسا سبب پایا گیا کہ وہ محتاج کسی کا نہ تھا، پس

اے عزیز اگر توبت دے کرنی الحقیقت لکھنے میں کس کی سعی ہے، اور ظاہر میں کس کی، تو میں بھی عاشق و معشوق کی سعی کا جواب دوں گا۔

کیا اب بھی آپ کی یہ رائے قائم ہے کہ اس عامیانہ قصہ کا ذکر سنجیدہ پرچہ میں لانا، نازیبا اور بے محل تھا؟

بادشاہ، شہزادہ تاج الملوک کی صورت سے بیزار ہو چکا تھا، اُسے ملک بدر کر چکا تھا، پر اُس نے اپنی خدمت اور سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ مہینوں اور برسوں کی تکالیف شاقہ اُٹھا کر گلِ بکاولی لے کر آیا۔ راہ میں چاروں بڑے بھائیوں نے اس سے چھین کر اس کارنامہ کو اپنی جانب منسوب کیا۔ بادشاہ عارضی طور پر ان چاروں سے بہت خوش ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد تاج الملوک بھی پایۂ تخت کے قریب پہنچا، اور دیووں کی مدد سے اس کے مقابل ایک دوسرا شہر نہایت ہی پُر رونق آباد کیا، اور پورے شاہانہ کروفر کے ساتھ وہاں حکومت شروع کی۔ بادشاہ کو خبر پہنچی۔ قاصد اور وزیر سلطنت کو دریافت حال کے لئے بھیجا۔ اُنہوں نے واپس ہو کر بہتر سے بہتر رپورٹیں پہنچائیں۔ آخر بادشاہ خود ملنے آیا، اور یہ پہچان کر کہ اپنا ہی لختِ جگر ہے، بے حد مسرور ہوا، گلے سے لگا لیا، ہر طرح کے اعزاز سے سرفراز کیا اور وہ چاروں بھائی مقہور و مردود قرار پائے۔ قصہ کے اس جھوٹ میں اب سچ کا پیوند ملاحظہ ہو:۔

"اے عزیز تیری عزت بادشاہ کے دربار میں تیری خدمت کے موافق ہو گی، چاہیئے کہ شہزادے کے مانند کار شائستہ کرے تو تیری محبت شاہ کے دِل میں مؤثر ہو، اور پیغام اپنی ملاقات کا تجھے بھیجے، بلکہ بے باکانہ آپ ہی تیرے پاس چلا آئے اور بے اختیار تیرا سر اپنی چھاتی سے لگائے۔ اگرچہ پہلے دیدار کے لائق نہ ہو، لیکن آخر کار اُسی مقام میں آپ

کو پہنچاتے کہ وہاں کوئی تیسرا شریک نہ ہو سکے۔ پھر ایسا کام نہ کیجیو کہ شہزادوں کے مانند فارغ لعنت اٹھاتے اور کس و ناکس کے رو برو رسوا ہو گئے

رینالڈز اور میری کاریلی اور راڈ گرولیس اور آسکر وائلڈ کو چھوڑیئے۔ اسکاٹ اور جارج ایلیٹ، ڈکنس اور تھیکرے، برنارڈ شا اور ایچ جی ویلز کے ہاں بھی اسی انداز کے مواعظ و معارف ملیں گے:

تاج الملوک ایک بار پھر مصائب و آفات کا شکار بنا۔ طلسمی عصا اور ٹوپی کو الگ رکھ کر سو گیا۔ سو کر اٹھا اور ایک حوض شفاف میں نہانے کو اترا، تو مرد سے عورت بن گیا۔ طرح طرح کے مصائب جھیلے، مدت کے بعد پھر ایک حوض میں غوطہ لگایا۔ بلی جو سر نکالا، تو از سر نو اپنی اصلی ہیئت پر آ گیا۔ یہ طلسماتی کارخانہ داستان نویس کی زبان سے ایک گنجینہ حقائق و معارف بن جاتا ہے:۔

"اے یاران دہر، حق تعالے نے بنی آدم کے سر پر کرامت کی ٹوپی پہنا کر اور نسبت کا عصا ہاتھ میں دے کر طلسم گاہ دنیا میں کہ مزرعہ آخرت ہے، عافیت کی تکمیل کے لئے بھیجا ہے پس انسان کو چاہیئے کہ گل و خار اور آب و سراب خوب پہچانے، ہر ایک باغ کے پھول کو نہ سونگھے ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے، کہ یہاں کانٹے گل سے رنگین اکثر اور شراب بصورت آب ادھر ادھر ہے۔ اے عزیز اگر گوہر دنیا کے لینے کو چشمۂ جہاں میں غوطہ مارے گا ضرور اپنا کلاہ اور عصا کھو دے گا یہ حکم اس بات پر ہے کہ طالب دنیا مونث ہیں، اور طالب مولی مرد

ہیں تیرا پیکرِ معانی جو مانندِ مردِ کامل ہے، بصورتِ زنانِ ناقص العقل ہو جائے گا۔ پس اس وقت شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیے کہ دم بخود ہو کر بحرِ دریائے ذکرِ الٰہی میں غوطہ مارے، اس کے بعد جو سر اٹھائے گا وہی عصا ہاتھ میں، اور وہی ٹوپی سر پر رکھے گا۔"

یہ وہی کتاب ہے، جسے آپ اب تک سر بسر بازاری اور مبتذل سمجھے ہوئے تھے، اور جس کا ذکر تک سنجیدہ صحبتوں میں آپ کو گوارا نہ تھا:

تاج الملوک اور بکاؤلی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ، اور باہم عقد کے خواہاں ہیں، لیکن کہاں پری اور کہاں آدم زاد۔ بکاؤلی کی ماں بگڑتی ہوتی ہے کہ خاکی کے ساتھ اپنی نورِ نظر کا پیوند کر کے پرستان بھر کی عزت کیسے ڈبو دی جائے۔ بکاؤلی کی ایک خالہ تاج الملوک پر مہرباں ہو جاتی ہے۔ اس کی سفارشی بن کر اپنی بہن کے پاس جاتی ہے۔ گفتگو یہی چھڑتی ہے اور اس وقت یہ پری رومی و غزالی کی زبان میں حقیقت انسانی پر، یوں ایک مقالہ سنا جاتی ہے:۔

"سچ کہتی ہے، لطیف کو ہم صحبتِ کثیف کرنا البتہ دانائی سے بعید ہے لیکن تو حضرتِ انسان کے کمالوں سے اگر واقف ہوتی تو ایسے ایسے خیالِ فاسد دل میں ہرگز نہ لاتی۔ سن اے نادان، بشر خلیفہ یزداں ہے، اور اس کی صفت بے پایاں، مخلوقات میں اشرف اور افضل ہے۔ اس کے رتبوں اور درجوں کی انتہا نہیں۔ وہ ایک نہنگ ہے دریا کا بہنے والا، اور ایک قطرہ ہے حقیقت میں دریا۔ جامع کمالاتِ علم کونی و الٰہی کا، یعنی مادیات اور مجردات کا اور مجمع ہے مراتب بندگی اور

بادشاہت کا سے انسان کی ذات برزخ جامع ہے بے گماں
ظلِ خدا و صورتِ خلق اس میں ہے عیاں

جان، کہ صوفیا ہر ایک کو عالمِ ارواح کے نوعوں میں سے باری تعالے اسے ایک ایک اسم اور صفت کا مظہرِ خاص جانتے ہیں اور اس عالم صورت کو کہ جو اس ظاہری اور باطنی سے نسبت رکھتا ہے اس عالم کا سایہ۔ پس ہر ایک ذرہ مفردِ کائنات سے روشن ایک تجلی ابدی اور سیراب ایک قطرہ سرمدی سے ہے سے برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اس عالم میں انسان کے سارے افراد کون و فساد اس کے لازمی ہیں خدا کے سارے اسموں اور صفتوں کا مصدر ہے، اور اس کی تجلیات خاص کا مقام۔ کلام فضیلت انسان میں دریائے بے پایاں ہے، اس قدر پر اکتفا کیا۔"

مغربی افسانوں، اور ناولوں، ڈراموں اور ناٹکوں، تھیٹروں اور سینما گھروں پر اس طرزِ تعلیم کا کوئی سایہ بھی پڑنے پایا ہے؟

تاج الملوک ایک بار پھر آوارہ وطن ہو کر فقیرانہ لباس میں پردیس میں گھوم رہا ہے گردشِ سوار ہے، اس ملک کا وزیر ایک سازش کر کے اس بیگناہ کو گرفتار کراتا ہے۔ فسانہ نگار اس بات سے بھی ایک بات پیدا کر لیتا ہے:۔

"سچ ہے کہ جو کوئی حکمت حکیم مطلق کی گوناگوں تامل کی نظر سے دیکھے تو کسی چیز کو خالی شر سے نہ پاوے، اور ہر ایک شر کے بعد خیر ملاحظہ کرے

اے عزیز، حق تعالیٰ نے عالم ارواح کو بدن سے رخصت دی ہے، پس
جو حرکت کہ بظاہر بدن سے ہو، حقیقت میں رُوح سے ہے۔ غرض کہ
جو فساد اس عالم کون و فساد میں ہو تو اس کی طرف سے جان، لیکن شر نہ
سمجھ کہ در پردہ وہ خیر ہے، کیونکہ وہاں شر کی گنجائش نہیں"۔

تاج الملوک پر ایک اور شہزادی فریفتہ ہوتی ہے، اور وہ اور اس کی سہیلیاں خوب بن ٹھن کر اپنے کو اس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تاج الملوک کی نظر میں بکاؤلی سمائی ہوتی تھی، وہ کسی کے بھی حسن و جمال، زیب و زینت سے متاثر نہ ہوا، شہزادی غش کھا کر گر پڑی اور تڑپنے لگی۔ تاج الملوک پر یہ آتشِ باطن اثر کر گئی۔ مشرق کا افسانہ نگار اس سے نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا کر رکھ دینا چاہیئے، کہتا ہے:۔

"سن اے عزیز، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبادت کو بادشاہ
حقیقی کی نذر کے لائق نہ دیکھا، عجز سے کہا کہ عبادت تیری ہم نے جیسی
چاہیئے نہیں کی، پھر کس کا منہ ہے کہ اپنی عبادت پر نازاں ہو، بہتر یہی
ہے کہ آپ کو اس کی محبت کی کٹھریا میں یہاں تک پگھلائے کہ اکسیر کے
مانند خاک ہو جائے، تا تشاہانِ اکسیر پسندکی آنکھوں میں سونے سے
زیادہ نظر آئے"۔

تاج الملوک کی شادی اس شہزادی کے ساتھ ہو گئی، لیکن دِل اس کی جانب مطلق ملتفت نہ ہوا۔ دماغ میں ہر وقت وہی بکاؤلی بسی رہتی تھی۔ قلم حقیقت رقم بات کا رُخ معاً یوں پھیر دیتا ہے:۔

"اے عزیز، جب تک تیرے دِل کی آنکھیں، اغیار کے حسن کو دیکھنے

والی ہیں، تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی، ہر چند بے پردہ ہو، پہلے
خارِ رغبتِ اغیار کو دل کی سرزمین سے اکھاڑ کر پھینک دے، پھر
گلِ رخسارِ یار کو آئینۂ دل میں دیکھ لے۔ اگر تو اپنے گلشن وجود کو بہ نظر
تامل دیکھے تو ان میں رنگ و بو کے سوا کچھ نہ پاوے۔"

کتاب کوئی ضخیم نہیں، دیباچہ اور تصویریں ملا کر بھی حجم ۹۰، ۹۲ صفحے کا ہے، اتنی مختصر ضخامت
کے اندر حکمت و معرفت، پند و موعظت کے کتنے جواہر پارے آپ کی نظر سے گزر چکے۔ اب
کتاب ختم ہونے کو آگئی، دو ایک نمونے اور ملاحظہ فرمائیے جائیں۔ تاج الملوک کا وزیر زادہ بہرام
بکاؤلی کی ایک عزیزہ روح افزا پر عاشق و شیدا ہو جاتا ہے۔ باریابی کی کوئی صورت نظر
نہیں آتی۔ عورت کا بھیس بدل کر کسی تدبیر و حکمت سے خلوت تک جا پہنچتا ہے۔ اس عشق فانی
میں عشق باقی کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

"اے عزیز، اگر بہرام زنانہ لباس نہ پہنتا تو ہرگز اپنی معشوقہ سے اتنا
جلد نہ ملتا، اور اپنے مطلب کو نہ پہنچتا۔ فی الواقع جو عاشق کہ معشوق کا رنگ
پکڑتا ہے، معشوق خود عاشق اس کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر خدا صلعم نے
بھی اس مضمون کا کلام فرمایا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ خصائل خدا کی پیروی
کرو تاکہ قربت اس سے حاصل ہو۔"

بہرام اپنی محبوبہ کی خلوت گاہ تک دوبارہ رسائی حاصل کرتا ہے مگر اس کے ظاہری غصہ اور ناگواری
کو دیکھ کر سہم جاتا ہے، ڈر سے غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیکھ، جو دل پتھر تھا، موم ہو جاتا ہے
خود اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع ہو جاتی ہیں، نگاہِ عبرت اس میں بھی ایک منظرِ
معرفت دیکھتی ہے:۔

"اے عزیز اگر اپنے نورِ عقل کو حکمتوں سے زیادہ نہ چمکائے گا تو تجلی یار سے فائدہ نہ پائے گا۔ اگر تو یہ ہستی موہوم نہ چھوڑے تو حیاتِ ابدی کب تیرے پاس آئے۔ جو راہِ عشق میں آپ سے نہ گزرا، وہ منزلِ مقصود میں کب پہنچا۔"

روح افزا نے گھر والوں کے ڈر سے بہرام کو سحر کے اثر سے پرندہ بنا کر، ایک پنجرہ میں بند کر کے لٹکا لیا ہے کہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے۔ ماں کو کچھ سن گن ملتی ہے، چور کے ڈھونڈنے کو آتی ہے۔ اور گھر کا کونا کونا ڈھونڈ مارتی ہے، چڑیا کے پنجرے کی طرف خیال بھی نہیں جاتا، حالانکہ وہ بالکل نظر کے سامنے رہے۔ فسانہ نگار یہاں بھی پتہ کی بات سے نہیں چوکتا۔

"اے عزیز تو عرش پر کس کے ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا ہے، جو تیرے خانۂ دل میں ہے، اس کی تو تجھے خبر نہیں، واہ واہ، دُور کا دھیان اور نزدیک آپ سے انجان۔"

دوسطر میں آگے بڑھ کر اسی پرند اور قفس کی کہانی کو ایک پورا مقالۂ حکمت بنا دیتا ہے اور اسی پر کہنا چاہیے کہ افسانہ کی معرفت آموزیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے:-

"اس کی کنہ سمجھ لے اے نادان، بہ سبب علاقہ، رُوح سبزہ زارِ دنیا کی سیر کرتی ہے، جب تک یہ تعویذ طلسم عناصر اُس کے گلے میں پڑا ہے۔ اور قفس وجود میں طوق بندگی اس کا گلو گیر ہے، چشمِ ظاہر بین مشت خاک کے سوا کچھ نہیں دیکھتی۔ جس دن یہ طلسم ٹوٹ گیا، کیفیت اس کی کھل جائیگی کہ وہ کون ہے۔ اور یہ نیرنگ کیا ہے، چنانچہ رسول مقبول صلعم نے

بھی فرمایا ہے، جب لوگ آویں گے اس حال سے ہوں گے۔ وجودِ مطلق
ایک دریا ہے، اور ہر موجود مثل حباب ہے۔ جب حباب سے ہوا نکل گئی،
دریا کے سوا کچھ نہیں پس تامل سے دیکھ کہ اصل ہستی دریا کی ہے، لیکن
فرقِ مرتبہ کا البتہ ہے، حباب کو کوئی دریا نہ کہے گا اور دریا کو حباب
اور کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں، اور بت خانہ کو کنشت، جہنم کو دوزخ، اور
جنت کو بہشت سے ہر مرتبہ میں اور ہی حکم وجود ہے

زندیقی ہے جو فرقِ مراتب کرے نہ تو

واقعی مسئلہ وحدتِ وجود کا مشکل ترین مسائل ہے اور بہتیرے اس
بحرِ عمیق میں گر کے مذہبِ جبری کے بھنور میں جا پھنسے، اور اکثر مسلکِ
دہری کے گرداب میں ڈوبے، ہادی یہاں فضلِ الٰہی اور کرمِ رسالت
پناہی کے سوا کوئی نہیں"۔

جو کہانی ننگِ مشرق، تھی اس کا جائزہ آپ لے چکے۔ جو افسانے "فخرِ مغرب" ہیں، کیا وہ بھی ان
کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں گے؟ ہمارے ہاں کی جو سچی کتابیں، سچوں پر اتری ہوئی یا سچوں کی لکھی ہوئی
ہیں انہیں چھوڑیے ان کی سچی شرحوں کو بھی جانے دیجئے۔ جو کتابیں کھلم کھلا جھوٹی لکھی گئی ہیں،
جنہوں نے اپنے جھوٹ کو چھپایا نہیں چمکایا ہے، ان کے اندر بھی اتنی سچائیاں، اور گہری
سچائیاں آپ نے دیکھ لیں؟ جس قوم کے جھوٹ میں اتنی سچائیاں ہوں جس
قوم کے جھوٹے بھی اتنے سچے ہوں۔ خدا کی شان ہے کہ اسے درسِ اخلاق و صداقت دینے وہ
قوم آئی ہے جس کا ہر سچ اندر سے جھوٹ ہی ہے۔

بہار کی بہار[1]

(ایک بہار دوست اور بہار دوست غیر بہاری کے قلم سے)

مارچ ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے کہ دار العلوم ندوہ کی شہرت دجلسۂ دستار بندی کے موقع پر[2] انگریزی ہائی اسکول کے ایک نویں درجہ کے طالب علم کو اس کے والد ماجد کے ہمراہ کھینچ کر لکھنؤ لائی، کانوں کو اشتیاق تھا دو تقریروں کے سننے کا، اور آنکھوں کو تمنا تھی دو چہروں کی زیارت کی۔ اللہ نے دونوں شوق پورے کرائے۔ پہلی بار تقریر سننی نصیب ہو گئی مولانا شبلی کی، اور زیارت ہوئی ان کے چہرہ کی، دوسرے نمبر پر آرزو تھی ایک ندوی طالب علم کے دیکھنے اور سننے کی، جس کے مضامین استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوتے، انہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، الندوہ میں نکل رہے تھے جلسہ گاہ (رفاہ عام متصل سٹی اسٹیشن ۔) میں پہنچ کر یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک جوان عمر، خوش لباس طالب علم ہے، چہرہ پر خوشنما چھوٹی سی داڑھی، عینک، سر پر مدنی وضع کی مندیل۔ بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ سب کی نظروں کا مرکز و مرجع، ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا، دستار بندی

---

[1] رسالہ ندیم (گیا) بہار نمبر ۱۹۴۰ء (مضمون صاحب ندیم) مولوی ریاست علی ندوی کی خاص پرخلوص فرمائش پر لکھا گیا۔

[2] جلسہ دستار بندی کی اصطلاح ہی اب غیر مفہوم ہو چلی ہے۔ پرانی درسگاہوں میں دستور تھا کہ طلباء کو تحصیل علم سے فارغ ہونے پر ایک جلسۂ عام میں سند دی جاتی تھی اور سر پر فضیلت کی پگڑی باندھی جاتی تھی

ہوئی رصاحب کی لائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی اصطلاحوں میں یوں کہیے کہ کانووکیشن اڈریس پڑھا گیا اور ڈگریاں تقسیم ہوئیں) اور اس ندوی نوجوان کی مفصل تقریر اردو میں ہوئی اور برجستہ تقریر عربی میں بھی، آنے والے اسکولی طالب علم کی دونوں تمنا ہیں — ہائے لڑکپن کی نیم معصومانہ مسرتوں کا نشہ اب کوئی کہاں سے لائے! — جی بھر کر پوری ہوئیں ۱۹۰۷ء کا اسکولی طالب علم وہی تھا، جو آج ان سطور کا راقم ہے، اور فاضل ندوی نوجوان وہ تھا، جو بحمد اللہ اردو میں سیرت نبوی کے ضخیم دفتر تیار کر چکا ہے، اور جسے دنیا اب "مولانا" اور "علامہ" کے القاب کے اضافہ کے ساتھ سید سلیمان ندوی کہہ کر پکارتی ہے۔

اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت و عظمت کا تخم پڑا، اور وہ دن ہے اور آج، کہ تخم نے جڑ پکڑی، پودا بنا، برگ و بار پیدا کئے، اور آج ایک درخت ہی نہیں، پورا باغ کا باغ تیار، ۳۲ برس کی مدت کچھ تھوڑی ہوتی! قرن کا قرن گذر گیا، خدا جانے کتنی آندھیاں کیسے کیسے طوفان اتنی مدت میں آئے اور کیسے کیسے چمن لٹ کر رہے، لیکن بہار کی خوشگوار یاد کی بہار آج بھی قائم۔ بلکہ اس میں اضافہ و ترقی ومبدم!

ہیں بے حد شرمیلا اور بدہمت، الندوہ کے مقالہ نگار کی علمی عظمت کا رعب دل پر طاری۔ ملنے کی جرأت اسوقت نہوئی کئی سال بعد جب لکھنؤ کے کیننگ کالج میں بی اے کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔ غالباً آخر ۱۹۱۱ء تھا، اور مولانا شبلی مرحوم کی الکلام پر ملحدانہ تنقید کے سلسلہ میں "نام" حاصل کر چکا تھا۔ جب جاکر تعارف کی نوبت آئی۔ اور رفتہ رفتہ زمندی کے تعلقات رفتہ رفتہ اتنے بڑھے کہ دوستی کے ڈانڈے عزیزداری سے جا ملے، اور اب سید صاحب میں اور اپنے عزیزوں میں کوئی فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔

مقامی خصوصیات، تمدن، معاشرت، ہر صوبہ کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ پنجاب

بمبئی، سی پی، سب کہیں کا رنگ اودھ سے جداگانہ ہے۔ یہاں تک کہ خود یوپی کے شمالی، مغربی، جنوبی علاقے طرزِ معاشرت میں اودھ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت بہار ہی میں دیکھنے میں آئی کہ وہاں کا رنگ ڈھنگ بالکل اودھ کا اجنبیت کم از کم مجھے تو کسی موقع پر محسوس نہیں ہوتی۔ پٹنہ کا تمدن، لکھنؤ کے تمدن کا مثنیٰ! جس بہاری سے ملا، معلوم ہوا اپنے ہی بجار کے کسی شخص سے ملاقات ہو رہی ہے۔

سید صاحب کے سلسلہ میں ان کے متعدد عزیزوں، ہم وطنوں سے ملاقاتیں ہوتی گئیں۔ سید نجیب اشرف ندوی اب ماشاءاللہ ایم اے ہیں اور بمبئی کی طرف کسی کالج کے پروفیسر میری نظر میں ان کی وہی لڑکپن کی بھولی صورت پھر رہی ہے، جب وہ ندوہ میں پڑھ رہے تھے۔ اور اپنے ہنستے مسکراتے ہوئے تبسم معصومانہ چہرہ کے ساتھ، نومشق بچوں میں ایک ہونہار مقرر تھے۔ مولوی ابوظفر صاحب ندوی، مولوی سید ہاشم ندوی (دائرۃ المعارف والے) مولوی سید محمد ندوی (شاگرد مولانا عبدالرحمن نگرامی مرحوم) اور مولوی سید عبدالحکیم صاحب دسینوی، وغیرہم۔ ان میں سے بعض کی ضمنی ملاقاتیں خود مستقل داستانیں ہیں

بہار و اودھ کے تعلقات کی تاریخ اس سے بھی قدیم تر ہے۔ یہ ذکر تو میری اور سید صاحب کی ملاقات کا تھا۔ لیکن سید صاحب ہی کے ایک بزرگ ہم نام، ابھی کل تک زندہ و سلامت مولانا قاری سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے۔ ۲۰-۲۵ سال ادھر علی گڈھ کانفرنس کا ہر اجلاس ان کے دم سے آباد، تو ندوہ کا ہر جلسہ ان کے وجود سے شاد اور میلادی بیان تو گویا ان کا حصہ تھا۔ ان کا ذکر خیر اپنے بالکل بچپن میں اپنے بزرگوں سے بار ہا سننے میں آیا تھا، اور اپنے والد ماجد کے ان سے مخلصانہ تعلقات ۱۰ء تا ۱۲ء میں اپنی آنکھوں سے

دیکھے۔ شاہ صاحب کی طالب علمی کا ایک زمانہ لکھنؤ۔ فرنگی محل میں گزرا تھا، اور ہمارا خاندان بھی اپنے قرب تعلقات کی بنا پر گویا فرنگی محل کا ایک جزو تھا، شاہ صاحب نے بعض کتابیں ہمارے بزرگوں سے پڑھی تھیں، اور اسی تعلق سے کبھی کبھی دریاباد میں تشریف لاتے تھے، مگر میری یاد سے پہلے۔ اس کا تذکرہ خود موصوف نے اپنی زبان سے فرمایا، جب بہت مدت کے بعد غالباً ۲۱ء میں مجھے ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل ہوا۔ ان کی بزرگانہ شفقت اور کرم فرمائی بھولنے کی چیز نہیں۔ ۲۷ء میں جب پھلواری تھوڑی دیر کے لئے حاضری کا اتفاق ہوا تو خود شاہ صاحب اور ان کے ایک بھائی صاحب (غالباً مولوی علی حافظ نام تھا) اور صاحبزادے شاہ حسین میاں صاحب نے پردیس کو وطن بنا دیا۔ دوسرے صاحبزادے شاہ جعفر میاں اور نواسہ مولوی شاہ عزیز الدین سلمہ کی کرم فرمائیاں عین اپنی روایاتِ خاندان کے مطابق ہیں۔

لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ ایک بڑا مرکز نوجوان اہلِ بہار کا ہے۔ اپنی کالجی طالب علمی کے زمانے میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہار کا آدھا صوبہ پہنچ کر لکھنؤ آگیا ہے، اور ندوہ کا دارالاقامہ پٹنہ ہی کا کوئی محلہ ہے۔ خدا جانے کتنوں سے ملاقات اس سلسلہ میں ہو گئی۔ مولوی حاجی معین الدین (صاحب خلفاء راشدین) اور مولوی مسعود عالم (اڈیٹر "الضیا" عربی) کسی تعارف کے محتاج نہیں مولوی ابوالحسنات بے چارہ کی یادگار شاید چند مضامین سے زیادہ نہ ہوں، بڑے ہونہار تھے، عین شباب میں وفات پا گئے۔ جلسوں میں نظم بالکل مولانا شبلی کے لہجہ میں پڑھتے تھے۔ مولوی احمد اللہ ندوی، مولوی عبدالقدوس ہاشمی ندوی (اب یہ سب حیدرآباد میں ہیں) سے بھی تعارف اسی زمانہ میں ہوا۔ مولوی سید ریاست علی ندوی آج ماشاءاللہ دوسروں کے "ندیم و رہبر" ہیں ان کا وہ زمانہ یاد ہے، غالباً ۲۰ء میں جب وہ بالکل سبزہ آغاز تھے اور مولانا عبدالرحمن

نگرامی مرحوم کے عزیز مخصوص شاگردوں میں تھے۔ مولوی عبد الغفور صاحب شہرؔ کا نام لینا میں بھول ہی چلا تھا۔ دفتر ندوہ کے بڑے پرانے سرگرم کارکن تھے، اور اب تو شاید نائب ناظم بھی ہیں۔ ایک زمانہ میں واقعی شہر ہی تھے۔

دار العلوم کے بورڈنگ کے مقابل کیننگ کالج ہوسٹل تھا (جو اب یونیورسٹی ہوسٹل ہے) اس میں ۱۹۱۱ء میں ایک سال قیام رہا۔ یہاں پٹنہ کے ایک نوجوان سید باقر حسن پہلے سے بورڈر تھے۔ بہار کے مشہور بیرسٹر سر سلطان احمد کے چھوٹے بھائی، وجیہ و خوشرو، ہونہار، خوش خو علی گڑھ سے آئے تھے، انگریزی تحریر و تقریر دونوں میں برق، مسلمانوں کے ہر کام میں آگے آگے۔ مجھ سے ایک سال سینیر تھے، میں بی اے کے پہلے سال میں تھا، وہ آخری سال میں۔ بیچارہ کالج چھوڑتے ہی بیمار پڑے، اور کچھ ہی روز بعد دق میں انتقال کر گئے۔ سنی طلبہ سے ایسے شیر و شکر ہوئے کہ اُن کے شیعہ ہونے کا پتہ کبھی نہ چلا۔

سر علی امام کے بھائی حسن امام، اور والد ماجد نواب امداد امام صاحب اثرؔ۔ نواب نصیر حسین خاں خیالؔ اور اس وقت کے مشہور بیرسٹر مظہر الحق کو راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں اور قومی جلسوں میں قریب سے دیکھنے کا اتفاق بارہا ہوا، لیکن بجز نواب خیال کے اور کسی سے ذاتی تعارف کی نوبت نہ آئی۔ پٹنہ ہی کے رہنے والے ایک ڈاکٹر ڈاکٹر محمد وارث، ایڈنبرا یونیورسٹی کے ایم۔ ڈی، لکھنؤ میں پریکٹس کرتے تھے، حکیم مہدی کے مقبرہ کے مقابل جگت نرائن روڈ پر۔ ۹ء تھا کہ اپنی مریض آنکھوں کا معائنہ کرانے گیا، بڑی توجہ و شفقت سے دیکھا۔ میں طالب علم، بھلا فیس کیا پیش کر سکتا تھا، اور اسی بنا پر شہر کے ایک بڑے نامور غیر مسلم ڈاکٹر معائنہ سے انکار بھی کر چکے تھے۔ اُن کی توجہ بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اکثر ان کے ہاں جانا آنا رہتا۔ کام تو بیچارہ کا یوں ہی سا چلتا۔ البتہ

پڑھے لکھے بہت تھے ۔ پچھلی جنگِ یورپ کے زمانے میں کہیں سول سرجن ہوکر چلے گئے ۔ اس کے بعد صرف ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی، جہاں کہیں ہوں ۔ اللہ خوش رکھے ۔

خلافت و ترک موالات کی تحریک نے دُور دُور کے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا، بہار و اودھ کا تو پڑوس ہی تھا ۔ میں تحریک میں شریک اسوقت ہوا ، جب تحریک خود ختم ہو رہی تھی ، محمد علی رح کی ذات اسوقت بھی بجائے خود ایک مرکز و مرجع تھی ، میں تو خیر عاشقوں میں تھا ، باقی اور بھی خدا معلوم کتنے اس شمع کے پروانے تھے ۔ دہلی بار بار میری آمد و رفت تھی ، یہ ذکر ۱۹۲۴ء اور اس کے بعد کا ہے اور دفتر ہمدرد و کامریڈ میں سب کہیں کے مسلمان اکٹھے ہوتے رہتے تھے ۔ مولوی محمد شفیع داؤدی ، مولوی عبد الغنی ، پروفیسر عبد الباری (جواب شاید " باری جی " کہلاتے ہیں) مولوی سید حسن آرزو وغیرہم سے اس سلسلہ میں بارہا ملاقاتیں ہوئی رہیں ، حضرات بہار کی سادگی اور اخلاص مندی سے دِل خاص طور پر متاثر رہا ۔ مولوی شفیع داؤدی اور مولوی عبد الغنی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اسمبلی اور کونسل کے ممبر ہو کر ، نماز کے پابند ہیں ، لباس سادہ رکھتے ہیں ، بازار میں پیدل چلتے پھرتے اور اپنے ہاتھ سے سودا سلف لے آتے ہیں ، بھلا ہمارے ہاں کے ارکانِ کونسل ، مسجد کی حاضری ، اور موٹر چھوڑ کر پیدل چلنا کیا جانیں ؟ مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار کو پہلی بار مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم کے مکان پر دیکھا ، پھر خلافت وغیرہ کے جلسوں میں متعدد بار لکھنؤ میں ملاقات رہی ۔ دِل ان کے علم و تدیّن دونوں کا قائل رہا ۔ اور آگے چل کر جب اُن سے اور مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی سے جو شدید جنگ برپا ہو گئی تھی تو دِل اس سے برابر دُکھتا ہی رہا ــــ دُنیا میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ مخاصمہ کے دونوں فریق اپنی جگہ بے قصور ہی نکلے ۔

ایک مرکز اہلِ بہار کا علیگڈھ بھی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی ممبری کے سلسلہ میں دو ایک سال سے آمد و رفت قائم ہے۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم اب بہاری ہو گئے تھے۔ لیکن ان کا خاندان تھا ہمارے اودھ ہی کے قصبہ کچھوچھہ کا۔ اُن کی زبردست شخصیت بعض عجیب خصوصیات کی مالک تھی۔ اور پروفیسر ابوبکر محمد حلیم صاحب ایم اے جو عرصہ سے پرو وائس چانسلر ہیں، اسم بامسمّیٰ پیکر حلم و خوش خلقی ہیں۔ مرزا اختر حسین صاحب رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر ہیں۔ ان سے بارہا نیاز حاصل ہوتا رہا۔

سچ بھی ایک ذریعہ اہلِ بہار کی توجہات منعطف کرنے کا تھا۔ بلکہ دکن کے بعد سچ کی سب سے زیادہ قدر افزائی علاقہ بہار ہی نے کی۔ چھپرا کے وکیل، محمد اسمٰعیل صاحب زیرٹ ضلع گیا کے قاضی احمد حسین صاحب رانچی کے ہیڈ ماسٹر الطاف کریم صاحب اور پٹنہ کے مولوی منظر علی ندوی مرحوم (المبشر والے) اسی سلسلہ سے مہربان ہوئے، مولوی منظر مرحوم تو خدا کے گھر سدھارے باقی حضرات کی خیریت اِدھر ایک عرصہ سے دریافت نہیں ہوئی۔ الطاف کریم صاحب دریاباد کو بھی سرفراز کر چکے ہیں۔

سال اب خوب خیال میں تو نہیں سنہ ۲۰ء یا سنہ ۲۱ء ہو گا ایک بار حیدرآباد جانا ہوا۔ مولانا شروانی صدرالصدور امور مذہبی کے دولت کدہ پر کوئی علمی کمیٹی تھی۔ نظر ایک نئے چہرہ پر پڑی، اور جی چاہا کہ اب پڑی ہے تو بار بار پڑی ہی رہے۔ ہٹنے نہ پائے۔ نرم اور روشن چہرہ پر ریشم کی طرح نرم اور ملائم داڑھی والے چہرہ پر پڑی تو دل نے کہا کہ اس چہرہ کو دیکھتے ہی چلے جائیے۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں۔ اللہ اللہ کیسا دھوکا ہوا، نام سے عرصہ سے واقف تھا۔ ایک خیالی صورت بھی ذہن میں تھی، لیکن توبہ صورت، سیرت ہر

بہ چیز سے متعلق خیال اور اندازہ کتنا غلط نکلا، خیال تھا کہ مسن ہوں گے، یہ تو جوان نکلے، قیاس تھا کہ بڑے بحاث ہوں گے اور بڑے مناظر اور خشکی و کرختگی کے پتلے۔ مشاہدہ نے بتایا کہ ایک لطیف جسم لطیف تر روح کو ہتیائے ہوئے ہے، خندہ رُو، نرم خو، نہ کرختگی نہ ثقالت، برعکس اس کے ایک پیکر لینت و لطافت تالی کے موقع پر تالی اور حال کے محل پر حال صورت پر نورانیت برستی ہوئی، گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی۔ علم کی جگہ علم، عشق کی جگہ عشق تعارف ہوا اور ملاقات کے پینگ بڑھے۔ اس اٹھارہ انیس سال کی مدت میں کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ سیکھا ان سوالات کو بس سوال ہی بنا رہنے دیجئے۔ حیدر آباد کی ہم زانیاں، لکھنؤ کی یکجائیاں دریاباد کی سرافرازیاں، اور پھر عرشہ جہاز پر ساتھ، مدینہ کے "روضہ جنت" میں ساتھ، بیت اللہ کے طواف و زیارت میں ساتھ۔ منیٰ کی نمازوں میں ساتھ۔ یہ ساری داستان کہیں پھیلنی شروع ہو گئی تو سمیٹنی مشکل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ دماغ اگر ایک بہاری کے علم و فضل کے آگے جھک گیا تھا، تو دل دوسرے بہاری کی محبوبیت کی نذر ہو گیا۔ دماغ اگر ایک کی عظمت کا قائل، تو دل دوسرے کی محبت کا گھائل "بہار کی بہار" اب بھی روح پرور نہ ہو تو کیا ہو؟

۲۹ء میں سفر حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ جہاز پر مولوی نصیر الدین صاحب پنشنر منصف، اور ان کے صاحبزادے ضمیر الدین صاحب کا خوب ساتھ رہا، ضمیر صاحب جو اس وقت ایک پُر جوش خلافتی تھے، ان کے لطف و کرم کی تجدید ۸ - ۹ سال بعد خاص شہر پٹنہ میں ۳۷ء میں ہوئی۔ مولوی شاہ لطف اللہ صاحب مونگیری، اور ان کے برادران عزیز مولوی نور اللہ و مولوی منت اللہ (اب ایم ایل اے ہیں) سے خصوصیت پیدا ہو جانے کے لئے اتنا ہی بس تھا کہ یہ حضرات مولانا گیلانی کے عزیز قریب ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان

حضرات کا لطف و اخلاص بجائے خود بھی یاد رہ جانے والی چیز ہے - اور مدینہ منورہ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کا وجود تو ہر مسافر و زائر کے لئے ایک آیۂ رحمت ہے، ہم لوگوں پر کرم خاص رہا۔ مسجد نبوی میں باب جبرئیل کے دربان بھی ایک بہاری تھے، اور خوب شخص تھے، ہم لوگ عموماً اس دروازہ سے جاتے تھے۔ روز ملاقات رہتی تھی - نام اسوقت ذہن میں نہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے سررشتۂ تالیف و ترجمہ کے سلسلہ میں ستمبر ۱۷ء سے ستمبر ۱۸ء تک ایک سال مسلسل حیدرآباد میں قیام رہا۔ سرکار عالی کے نائب صدری محاسب مولوی عبدالغنی مرحوم تھے - ان کے کرم بے حساب رہے - ان کے صاحبزادے محی الدین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا محکمہ تعلیمات میں تھے - اب شاید اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہیں - جوانی ہی میں مذہب کے دلدادہ لطف و کرم میں باپ کے قدم بہ قدم - انہیں کے ہاں شمس العلماء مولوی محب الحق کی زیارت کئی بار ہوتی - اسوقت تو بہت بزرگ صورت معلوم ہوئے، بعد کو سُننے میں آیا کہ عقائد کچھ "اہل قرآن" کے سے ہیں - یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ ایسا شخص اور منکر حدیث ہو! - بہار ہی سے ایک صاحب مولوی ابو محمد مصلح ایڈیٹر حسن و عشق، مراسلت عرصہ سے فرما رہے تھے حیدرآباد کی آمد و رفت کے سلسلہ میں ملاقات ہوئی، تحریک قرآن کی دھن میں لگے ہوئے، دکن ہی کے سلسلہ میں ایک اور بہاری عبدالرحمٰن خانصاحب بھی یاد آ گئے - انسپکٹر پولیس تھے - مدتوں مہربان رہے -

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ایم اے، پی ایچ، ڈی کا نام رہا ہی جاتا تھا، اپنی نظر ثانی کے وقت یاد پڑا - یہیں ٹانکے دیتا ہوں - اب مدت سے کلکتہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہیں، ایک زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے - اسوقت تو میں ہی ذرا الگ الگ رہا - بعد کو معلوم ہوا بڑے

مسلمان تھے۔ مراسلت اور بعض مقالات و مضامین سے اس کی تصدیق ہو گئی۔

پٹنہ کی حاضری کا اتفاق کل دوبار ہوا۔ یوں تو اس شہر کی گلی گلی سے آئی اسٹی کو بھیوں سے کم تر، عظیم آباد کے کھنڈروں سے بیشتر۔ پہلی بار ستمبر ۱۹۲۶ء میں جانا ہوا، مولانا مناظر صاحب شدید علیل ہو کر پٹنہ کے بڑے اسپتال میں داخل ہوئے، تار پاکر عیادت کو دوڑا ہوا گیا۔ مہماندار مولوی منظر علی مرحوم ایڈیٹر المبشر نے کی۔ مولانا کے والد ماجد حیات تھے، ان کی زیارت ہوئی اور مولانا کے برادر عزیز سید مکارم احسن سے خوب ملنا ملانا رہا۔ مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی، قاضی احمد حسین صاحب ایم، ایل، سی، مولوی نور محمد صاحب ایڈیٹر اتحاد وغیرہم لطف فرماتے رہے اور مولوی سید محمد ندوی تو ہر وقت خدمت کے لئے وقف رہے۔ میزبان صاحب موٹر پر پھلواری لے گئے۔ مزارات کے علاوہ زندہ بزرگ امیر شریعت مولانا محی الدین صاحب کی زیارت نصیب ہوئی۔ مولانا قاری شاہ سلیمان مرحوم و مغفور اُن کے اہل خاندان کی عزیز انہ مسافر نوازی و محبت کا مزہ دل اب تک لے رہا ہے، جناب تمنا کو بھی وہیں دیکھا اور کلام سُنا۔ اور جناب تمنا کی لطف فرمائیاں رہیں۔ غرض "پھلواری" کی سیر سے دل باغ باغ رہا اور اس کی سدا بہار سر سبزی کی دعائیں نکلتی رہیں۔

دوسرا سفر ۱۹۲۷ء میں ایک اردو کمیٹی کے سلسلہ میں ہوا۔ ضابطہ سے میزبان قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر تھے۔ لیکن قیام مولانا سید سلیمان کی رفاقت میں، ریاض حسن خانصاحب رئیس مظفر پور کی کوٹھی پر رہا۔ موصوف مولانا شبلی مرحوم کے ملنے والے اور اس رشتہ سے میرے بھی بزرگ ہوئے۔ بزرگانہ شفقتیں عین روایات بہار کے مطابق رہیں۔ تمنا صاحب اب کی بھی کرم فرماتے رہے، اور ان کے علاوہ ضمیر الدین صاحب اور متعدد حضرات کی عنایتوں کا مینہ دن بھر

برستار ہا۔ افسوس ہے کہ ان کے اسمائے گرامی ذہن میں نہیں، شام کو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم کے اعزاز میں علی گڈھ اولڈ بوائز کی طرف کی طرف سے ایٹ ہوم تھا۔ متعدد نوجوانوں سے ملاقات رہی۔ سب خلوص و محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، ایک ڈپٹی مجسٹریٹ اور دو یونیورسٹی کے طلبہ کی صورت کا نقش ذہن میں ہے۔ لیجئے ایک ہدیۂ فقیر بزرگانِ بہار کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے، گو اُن کے مرتبہ کے قابل ہرگز نہیں، تیار ہوگیا۔ موضوع۔ احباب بہار" خود ایڈیٹر صاحب ندیم کا عنایت کیا ہوا تھا۔ محفلِ خاص میں اغیار کے بار پانے کے کوئی معنی نہیں۔ بہار نمبر میں ایک غیر بہاری کے لئے جگہ نکالنا محض اس کا دل بڑھانا ہے۔ لیکن یہ بہار نمبر ہے، ایسا ہے کہ اس پر کسی خصوصی نمبر کا اطلاق ذرا مشکل ہی سے ہوگا۔ ایک تو اودھ اور بہار کے تمدن و معاشرت کی یہ یکسانی کہ ایک کو دیکھ بے اختیار دوسرے کی زبان سے نکلے۔

جو تو ہے وہی میں ہوں۔

اور پھر اس عموم میں خصوص۔ ان سطور کے راقم کا اہل بہار کے ساتھ نیاز مندانہ خلوص
_____ قند و شکر کو جب تولتے ہیں تو خس و خاشاک کے ذرے بھی قند و شکر ہی کے حکم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ عجب کیا ہو اس غیر بہاری کو بھی ایک اعزازی (آنریری) بہاری سمجھ لیا جائے۔

ایک مختصر سا پیام

"یوم اکبر" منانے والوں کے نام

۱۹۱۲ء ہے اور مہینہ غالباً اپریل کا۔ لکھنؤ میں ابھی یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی ہے صرف ڈگری کالج ہیں۔ ایک طالب علم بی۔ اے کا امتحان دینے لکھنؤ سے الہ آباد پہنچتا ہے۔ اور اپنی پہلی فرصت میں یہی نوجوان "شرمیلا اور بڑوں کی صحبت میں جھینپنے والا، شوق کے پیروں سے چل کر، اور اشتیاق کے پروں سے اُڑ کر، "عشرت منزل" جا حاضر ہوتا ہے —— پیر ظریف کا سن کوئی ۶۶، ۶۷ سال کا۔ جسم لاغر و نحیف، چہرہ دبلا، اور اس دبلے چہرہ پر جھریاں، لباس سادہ، وضع و معاشرت سادہ۔ ایک دبیع بر آمدہ، اس میں ایک آرام کرسی پر نشست، آنکھوں پر عینک، آنکھیں عینک کے اندر سے بھی چمکتی ہوئیں، قدرتی نہیں، ڈاکٹر کے ہاتھ کی قدح کی ہوئی، اس پر بھی پر نور گفتگو لطیفوں سے پر، ظرافت سے معمور، بشرہ سے ذہانت کا ظہور۔ خود کم ہنستے ہیں، ہنساتے زیادہ ہیں، فقرے گویا ڈھلے ہوئے، پہلے سے سوچے ہوئے، جنچے ہوئے، منہ سے نکل رہے ہیں۔ جو ملنے آیا ہے، وہ سن میں ان کی بڑی اولاد سے بھی کہیں چھوٹا ہے، لیکن باتیں اس سے یوں گھل مل کر رہے ہیں، جیسے وہ ان کا کوئی پرانا دوست ہے، ہم سن و بے تکلف —— ان پیر ظریف کو آپ نے پہچانا؟ یہ تھے مشہور و نامور شاعر، اور میرے عقیدہ میں حکیم و عارف، حضرت اکبر۔ اور ۱۹۱۲ء کے اس شرمیلے

نوجوان کو آپ نے جانا؟ وہ نامہ سیاہ ہے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یوم اکبر کے لئے پیام نویس!

سنہ اب یاد نہیں، اور مقام کا اظہار کچھ ضروری نہیں، بہر حال اودھ کا ایک چھوٹا سا ضلع ہے۔ حضرت اکبر کے صاحبزادہ سید عشرت حسین صاحب (عشرت منزل" کا نام آپ ابھی سن چکے ہیں، یہ انہیں کے نام پر ہے) واں ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ اکبر صاحب بھی وہیں مقیم ہیں شہر کے کچھ لوگ، غالباً رئیس یا وکیل ڈپٹی صاحب سے ملنے آتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اتفاق سے موجود نہیں ہوتے وہ حضرات ان کے بجائے حضرت اکبر کو جلوہ افروز پاتے ہیں لیکن نام سُنکر بھی کچھ زیادہ التفات نہیں کرتے۔ اتنے میں ڈپٹی صاحب باہر سے آجاتے ہیں اور حاضرین سے کہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے پہچانا؟ یہ "میرے والد ماجد ہیں" اب کیا تھا۔ وہی حضرات تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو جاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ "معاف کیجئے گا ہمیں اس رشتہ کی خبر نہ تھی" اکبر نے فرمایا "نہیں اس میں مضائقہ ہی کیا۔ ایک بار یورپ میں کیا ہوا، کہ اللہ میاں مجسم ہو کر آئے، گرجوں میں جا کر ایک ایک سے کہا کہ میں تمہارا خدا ہوں، خالق ہوں، پروردگار ہوں، کوئی مخاطب نہ ہوا، پھر فرمایا ارے مجھے اب بھی نہ پہچانا؟ میں ہوں تمہارے عیسیٰ مسیح کا باپ! بس اس تعارف کی دیر تھی۔ سب دوڑ پڑے، سب کے سر تعظیم کے لئے جھک گئے!"۔۔۔ یہ تھا اکبر کی برجستہ لطیفہ گوئی کا ایک نمونہ!

سنہ غالباً ۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ ہے۔ اکبر لکھنؤ میں امین آباد پارک کے ایک بالاخانہ پر مقیم ہیں۔ ایک صاحب "صاحبانہ" مسلک و خیال کے ملنے تشریف لاتے ہیں۔ گفتگو کچھ عورتوں

کی تعلیم و آزادی پر چلتی ہے - اکبر نے کہا کہ "ہم تو اس زمانہ میں آزاد خیالی کا امام سیّد احمد خاں کو سمجھتے تھے، لیکن عورتوں کی آزادی انہیں بھی سخت ناپسند تھی" - وہ صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے - بات کاٹ کر بولے کہ "سر سید کی رائے اس معاملہ میں سخت قابل ترمیم تھی" اکبر نے برجستہ جواب دیا کہ جی، کیوں نہیں - ایک اسی معاملہ میں کیا، خدا معلوم کتنے معاملوں میں سخت قابلِ ترمیم تھی" وہ خود ہی قابل ترمیم تھے - دیکھئے نہ، زمانہ نے انہیں کی ترمیم کر دی، اور ان کے بجائے آپ کو پیدا کر دیا! ——— یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی اکبر کی اصلاحی اور تبلیغی طرزِ گفتگو کی - اصلاح و تبلیغ کے کام میں تو وہ ہمہ وقت لگے رہتے لیکن مجادلہ و مکابرہ کیا معنی، رسمی مناظرہ و مباحثہ کی بھی نوبت نہ آنے دیتے - اور خشونت تو ان کے لہجہ کو چھو بھی نہیں گئی تھی - شعر میں کہہ بھی تو گئے ہیں ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

انکار مذہبی "بحث" سے کیا ہے، بحث و مباحثہ کا رنگ کبھی نہ آنے دیا - باقی دھیمے دھیمے سروں میں، میٹھے میٹھے بولوں میں مذہب کی تبلیغ تو چپکے چپکے ہر وقت کرتے رہتے مجھ سے ایک روز میرے ارتیاب و الحاد کے زمانہ میں کہنے لگے کہ "کیوں صاحب، آپ نے کالج میں عربی لی تھی نہ؟" عرض کیا "جی ہاں" - فرمایا تو پھر اب قرآن آپ کبھی پڑھتے ہیں؛ مذہبی کتاب سمجھ کر نہ سہی - اس کی اعلیٰ لٹریری حیثیت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہو گا - کیا ہرج ہے اگر عربی ادب سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لئے اسے کبھی کبھی پڑھتے رہیے - آخر انگریزی بھی تو پڑھتے رہتے ہیں - آپ کے لئے کوئی قید با وضو ہونے، قبلہ رخ، بیٹھنے کی نہیں، وضو بے وضو

جب جی چاہے کچھ پڑھ لیا کیجئے، اور جو آیت پسند آجائے، اُسے ذرا دو ایک بار دہرا لیا کیجئے، جیسے اچھے شعر کو دو چار بار پڑھ لیا جاتا ہے" بس یہ حکیمانہ طریق تھا اُن کی تبلیغ کا۔

ایک روز اور میرے اُسی دورِ الحاد میں مجھ سے فرمانے لگے کہ کیوں صاحب آپ کو کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے؟ اللہ میاں کے مسئلہ کو الگ رکھیئے، صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ کو اپنے بندہ ہونے میں تو شک نہیں؟ عرض کیا کہ "نہیں، اس میں تو نہیں" بولے، "بس پھر بیڑا پار ہے۔ اپنی بندگی کا احساس کرتے رہیئے۔ آپ کے لئے ابھی قدر کافی ہے۔ اللہ کی معرفت کا دعویٰ کون کرسکتا ہے۔ سب کی پہنچ بس اپنے اپنے مقام تک رہی ہے میرا ایک شعر سن لیجیے سے

درد تو موجود ہے دل میں شفا ہو یا نہ ہو
بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

اپریل ۱۹۱۲ء کی وہ گھڑی، اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں یوم وفات، پورے دس برس میرے تعلقات نیازمندی برابر قائم رہے، روز بروز بڑھتے گئے۔ اس مدت میں میں نے بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ لیا، اکبرؔ کے کلام سے بھی اور اکبرؔ کی ذات سے بھی۔ خوش نصیب تھا میں کہ اتنی مدت تک موقع استفادہ کا ملا۔ بدنصیب تھا میں کہ موقع سے پورا فائدہ نہ اُٹھایا۔ اپنے عقائد و خیالات کی اصلاح میں میں نے حضرت اکبرؔ کا بھی اثر چھپکے چھپکے غیر شعوری طور اور غیر محسوس طور پر کام کرتے ہوئے پایا۔ وہ ابھی زندہ ہی تھے کہ میں بحمداللہ مسلمان از سرِ نو بن چکا تھا۔ جب پہلی نماز حضرت اکبرؔ کے ساتھ ادا کی۔ ظہر کا وقت تھا۔ اس وقت اُن کی خوشی کا کیا کہنا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کتنی بڑی دولت خود انہیں کو مل گئی ہے! توحید کے عاشق تھے اور غیرت، عشق کا ایک لازمہ ہے۔ توحید کی غیرت اتنی تھی، کہ کوئی دوسرا تذکرہ، یہاں

تک کہ اللہ کے پیاروں کا بھی زیادہ دیر تک سُن ہی نہ سکتے۔ جھٹ موضوع بدل، توحید پر آ جاتے۔ اور آخر آخر تو فنا اور توحید، یہی دو محبوب موضوع رہ گئے تھے۔ ۲۰ء و ۲۱ء میں عارف رُوم کی مشہور و معروف مثنوی کی دھن میرے اوپر سوار تھی۔ اکبر کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا۔ ایکبار کیا، دوبار کیا، جب تیسری بار کیا، تو تڑ سے بول اُٹھے کہ "اچھا یہ تو فرمایئے اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا رُوم؟" میں نے کھسیانے ہوکر کہا کہ "اللہ میاں"۔ بولے میں تو آپ کی گفتگو سے یہی سمجھا تھا کہ شاید مولوی رُوم بڑے ہیں۔ جب سے آپ آئے ہیں، بار بار انہیں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہ سُنا۔ میں تو سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اللہ میاں نے آپ کی رہنمائی مثنوی تک کی، یا مولوی رُوم آپ کو اللہ تک لے آئے؟ انتہا یہ ہے کہ ایک بار جب ذکر رسولؐ شروع ہو تو اُسے بھی دو ہی چار منٹ بعد حضرت اکبرؔ نے اپنے اس فقرہ پر ختم کر دیا، کہ جی ہاں، ہمارے اللہ کی قدرت کا کیا کہنا۔ کیا بے نظیر اور بے مثال انسان پیدا کر دیا!۔۔۔۔ یہ حد تھی غلبۂ توحید کی!

اکبر بڑے پُر گو تھے اور بڑے زود گو۔ جو دیوان چھپ چکے ہیں، وہی تعداد میں ایک نہیں تین ہیں۔ اور جو کلام اب تک نہیں چھپا ہے وہ سب چھاپ دیا جائے، تو اگر پوری دو جلدیں نہیں، تو ڈیڑھ جلد تو ضرور ہی اور تیار ہو جائے۔ اکبر کا پیام تقریباً وہی تھا جو اقبال کا تھا یعنی خودی اور خودداری کا سبق۔ مشرقی کو مشرقی اور مسلمان کو مسلمان رہنے کی تلقین۔ راہیں الگ تھیں، لیکن منزل دونوں کی ایک۔ ایک چہروں کو ہنساتا ہوا چلا، دوسرا دلوں کو گرماتا ہوا بڑھا۔۔۔۔ اکبر کی زندگی درحقیقت ایک سبق ہے کہ انسان، ظرافت، زندہ دلی، دل لگی، خوش طبعی کی راہ سے بھی کیسی کیسی خدمتیں دین و ملت کی انجام دے سکتا ہے!

(۲)

چند مقدمے

کلام جوہر[1]

مقدمہ

"آپ مری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ۔ امیر۔ تسلیم۔ جلال۔ عروج۔ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نورافشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوتے۔ جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خانصاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علیخاں صاحب اور ان کے بھائی حافظ احمد علی خانصاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خانصاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی۔ از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاراں کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا۔ اس لئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو)

---

[1] تحریر ۱۹۲۳ء، نظر ثانی ۱۹۳۵ء، نظر ثالث ۱۹۴۴ء۔

ع آیا دہلی سے ایک مشکی خر
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے ع آج رخصت جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا!

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے۔ جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا۔ مجھے بھی لےجاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا "کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں"۔ میری عمر بہت کم تھی۔ مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرائے تھے۔ جنہیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا۔ میں نے انہیں کے چند شعر انہیں سُنا دیئے۔ سُنکر پھڑک گئے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔ جناب عالی اگر اس کے بعد میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ سُنئے۔ میں نہ صرف شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں۔ اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر وسخن کی شان میں نہ کی ہو۔ میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو وفضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے۔ اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری (Official biography) (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری اُمت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے، یا سیرۂ پیشوائے قوم وملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سفر نے رحمٰن کا چند ماہ کے بعد انتقال یکایک ہوگیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑونگے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا

تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چڑے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو۔ اور جواب ہی ہمارے سر آپڑے، آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے والا سیرت نگار باوجود نقاد و سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالامال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑ کے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنیئے کہ گیارہ برس کی عمر میں علیگڈھ گیا ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھا تھا۔ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی، پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعۂ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر لوچ۔ اسی وقت تیار ہو گئی میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوتی تو امتحانوں نے

فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خانصاحب (رئیس دتاولی۔ بیت الحجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، اُن میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکرٹری مسلم لیگ کے برادر صغیر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گذر گیا اور وہ مشاعرہ جسے بعدہٗ حسرت نے رونق بخشی، ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہوگئی تو تین چار روز مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرحی میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرش زمردیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علیگڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزہ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارہ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ سو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال تے، مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا۔ اور محض حالات گردوپیش اس کے محرک تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد کیڑے پھاڑے گھر کو آئے تو فاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ

ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی - البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے - یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار یا پنچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا - لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں، مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے - تو لنہایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے، چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو اس لئے یہ لکھے بھیجتا ہوں (Touch Stone) کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں (A poor thing but mine own) اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں . . . (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں - ممکن ہے کہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پائے - بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے - مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق - یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے ہیں "

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی - یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں، کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک خانگی مکتوب کا ہے تاریخ اس پر ۱۶ اگست ۱۹۲۶ء کی پڑی ہے - چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے - اس وقت کوئی جانتا ہی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں - ۱۹۱۶ء کے شروع میں اسی نظر بندی کی حالت میں ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی - پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں کسی والا نامے میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیئے تھے - اس پر اس نیاز مند کا اشتیاق بڑھا - عرض کیا کہ "اور عنایت ہو" عنایتیں مسلسل ہوئیں - دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب کھلے

ذرا کچھ فرمایئے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا فن کب سیکھا، کہاں سیکھا، کس سے سیکھا، جواب منفصل مرحمت ہو۔ آپ اوپر پڑھ چکے۔ بالکل قلم برداشتہ اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا ۔ میں کہیں سوچ بچار کرکے ۔ ٹھہر ٹھہر کے، اور غور کرکے لکھے جاتے ہیں؟ ۔۔۔ بیچارے کو خیال تک نہ ہوگا ۔ کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر ادبی مضمون کے جزو بنکر رہیں گی ۔

(۳)

محمد علی کو دنیا نے اول اول جانا، تو اس حیثیت سے کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں۔ بولتے خوب ہیں، علیگڈھ کے فدائی ہیں، "قوم کے" شیدائی ہیں، مخلص ہیں، پر جوش ہیں ۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کردیں ۔ آکسفرڈ گئے، نام درج کیا ہندوستانی طلبہ کی مجلس "نورتن" کے نام سے قائم کی ۔ خود ہی صدر بنائے گئے، یا "کانگریسی اردو میں" چنے گئے ۔ لوٹ کر آئے بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے ٹائمس آف انڈیا بمبئی میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی ۔ ۱۹۱۱ء آگیا ۔ کلکتہ سے اپنا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ نکالا حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقے میں دھوم مچ گئی ۔ نثر میں شاعری، واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی ۔ اور کلب میں بھی شیکسپیر کے فلاں ڈرامے پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا کامریڈ کو دہلی لائے ۔ یہیں سے ہمدرد بھی نکالا ۔ اب محمد علی ایڈیٹر نہ تھے ۔ ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر، صحیح معنی میں لیڈر تھے ۔ اب قوم ان کی نہ تھی وہ قوم کے تھے ۔ جنگ طرابلس کے، جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی کا بیخودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے بلقان میں اتحادیوں کی ہر ضرب، ترکوں کے جسم پر نہیں محمد علی کے

قلب پر پڑ رہی تھی - کچھ اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کر دیا - چندہ کے لئے پکارا تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا - اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونین پیش آ گیا - محمد علی دیوانہ وار جھپٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! —— اب ان کا شمار ہوشیاروں میں - عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے مست تھے، مستِ الست!

ولایت گئے اور آئے - گرجے، چیخے، چلائے - دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہو گئی —— خلافت اسلامیہ کی جنگ! آہ، وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم آخری بار لہرایا —— محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظر بند ہوئے - نظر بندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں اکٹھے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے - اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زباں بندی، معطلی کی نذر! شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے - مظلوم کی زبان بنکر، نالہ و فریاد کرتے ہیں، ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھوں نظر بند، وعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اس کے ہاں چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں - مہر ہی مہر، لیکن حقیقتِ مہر کبھی کبھی صورتِ قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے - اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو معاملہ سب سے نرالا ہی رہتا ہے - امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا ؎

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر
عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے - اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے - سوچ سمجھ

کر بولے ؎

یہ نظر بندی نکلی تو رو سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزلِ مقصود پیشِ نظر ہے اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے ؛ اس کے لئے نقدِ جان کا مطالبہ ہونا تھا ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا !
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے۔ حِصّہ بقدرِ جثّہ ، یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سر دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرعہ لگایا ہے خاکسار عرض کرے گا ، کیا خوب اظہارِ حقیقت کر دیا ہے اسی نظر بندی کے زمانے میں ایک بار ریل پر ملاقات ہوئی ، پوچھا " رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں ؟ فرمایا ارادے کیسے ؟ اب دھن تو صرف ایک ہے ، یورپ پہنچوں اور گلی گلی ، گھر گھر تبلیغ اسلام کروں ؟ نظر بندی اور اس کے بعد جیل ! پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار ، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پینترے ادھر ہندوستان کے اندر ، حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان بشر شروع سنہ ۱۹۲۰ء تھا کہ محمد علی دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے ، دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں ، وقت کی ضرورت ناگزیر ، کہ موضوع تقریر صرف تحفظ خلافت ہی رہے۔ لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا ، چپکے چپکے اور

اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی! ؎
اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔۔"عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہر حال جرم ہی تھا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علیگڈھ میں ڈال چکے تھے۔ اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے اور جکڑے گئے ۱۹۲۳ء تک کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ ہر کار جالانثار کے مہمان! اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین، رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی! فدا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روئداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے۔

؎ معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ استقبال میں وہ بھی پیش پیش جن کے ماں وطن مذہب سے عزیز تر اور دنیا، دین پر مقدم کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا۔ محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرہ تکبیر! — وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب۔ جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا۔ خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لئے یہ خبر سنکر کیا کچھ پھڑ پھڑایا ہوگا۔ دل پر کیا کچھ کچھ بیت رہی ہوگی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ والدین بھی کر ڈالتے ہیں۔ یہاں وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا تھا وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور رہا!

امتحان سخت سہی، پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے، اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر عرض و معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے قرآن میں کیا
تخرج الحیّ من المیتِ مذکور نہیں؟
تری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دُور نہیں

اب اس کے بعد جو شعر ہے اس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا اُسے قبر میں بھی اُتارا! ۱۹۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! نہ پوچھیے کہ محمد علی پر کیا گذر کر رہ گئی۔ خلافت اسلامیہ کا مٹنا، قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، خیر محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہا۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر پس کر جھلس کر رہ گئے۔ وسط ۱۹۲۴ء

سے آغاز ۱۹۲۱ء تک زندہ ضرور رہے، اور بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے اور بچھڑے۔ لڑے اور روٹھے۔ ۱۹۲۸ء میں مجھلی لڑکی کی شادی کی اور سال ہی بھر بعد ۱۹۲۹ء میں اسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ دوبارہ نکالا، ہمدرد کو پھر سے زندہ کیا اور دونوں کو کچھ دن بعد بند کرنا پڑا، کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا ——— لیکن دل کی کلی جو الغاءِ خلافت سے مرجھا چکی تھی پھر نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ شاداب نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہیے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے، بس وہ پورے کر رہے تھے! ——— اب وہ انسان نہ تھے، صرف ایک چشمِ گریاں! صرف ایک قلبِ بریاں! صرف ایک آہِ سوزاں!

آخری سفر، دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لیے تھا، اور حقیقت میں سفر آخرت! بدبینوں نے کہا، کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو انگریز اور ہندو سب پکار اٹھے، کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یا ایک متحرک کوہِ آتش فشاں! فاش و برملا کہا، جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے، کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا، یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر"! مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان ۱۳۵۰ھ کی پندرھویں شب میں عین اس وقت جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی صحت کی۔ اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیتِ الٰہی نے یہ نعمتِ عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی! ——— شاید اس لئے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس نعمت کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے، آزادی،

محمد علی کے ملک کو کیا ملتی۔ محمد علی کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل، لے کر اپنے مولا کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ عمر کل ۵۲ سال کی پائی۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لئے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں قبلۂ اوّلیں ہیکل سلیمان کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل، اقبالؒ نے کہا ذرا دیکھنا اپنے رسول کا یہ عاشق وشیدا غلام جا کس راستے سے رہا ہے ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر اس مدفن پر رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور شور سے تنہا لکھنؤ یا کلکتہ یا بمبئی یا دلی میں نہیں۔ سارے ہندوستان میں ہوا، ہر ہر صوبہ کے ایک ایک شہر، ایک ایک قصبہ، گاؤں گاؤں میں ہوا۔ سارے عالم اسلام میں ہوا۔ اس کی نظیر تاریخ اسلام میں آسانی سے تو نہ ملیگی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں، مقبرہ ایک زیارت گاہ خلائق بن گیا ہے۔ زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے۔ مجاوروں کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ خود کہہ بھی تو گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لئے ضرورت نہ کسی تمہید کی۔ نہ دیباچے کی۔ نہ پیش نامہ کی۔ ورق الٹیئے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجئے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض ضخیم دیوان ہو کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی ملجائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب جب جو حصہ چاہیئے کھول لیجئے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے

رہرو کی زبان سے سُنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے۔ محمد علی ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں، شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو ؎

ارادہ تھا یا لوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو
مگر اے ہم نفس دِل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے

یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا
تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش
تھی رات یاس اور دِل ناصبور تھا

میں تیرا گھر سمجھ کے سرِ راہ گر پڑا
دیکھا جو آنکھ اُٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں، زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں ۱۹۰۷ء ہے علیگڈھ، میں لڑکوں نے انگریز اُستاد کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے، کالج بند، خدایانِ کالج حیران و پریشان! بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں مگر اتنے عرصہ میں دُنیا کی دُنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں۔ اتفاق سے وہی دِن سر سید کی برسی کا ہے اولڈ بوائز جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں۔ محمد علی اپنے نیچری پیر سے ڈرتے، لرزتے نہیں ناز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں، اپنے جیسے "بڈھے لڑکوں" کو سُنا سُنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز

بھی، شوخی اور مستی بھی ہے - اور درد و گداز بھی ہے

خبر لو قوم کی کشتی کی گرگشتی سے باہر ہو

ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

یہاں مانا کہ تاثیرِ دعا میں شرک رہا تم کو

وہاں ضائع نہ ہو گی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

تمہیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڈھ میں

اور اس پہ یہ تماشا، ہر طرف اور جا بجا تم ہو

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا

جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تمہیں ہو زندۂ جاوید، باقی جانے والے ہیں

نمونہ ہیں فنا کا ہم، تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گذرا - اب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہیں - یک بیک خبر پہنچتی ہے کہ غلام حسین چل بسے - کون غلام حسین ؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دوست دبازو - انگریزی کے زبردست انشاپرداز کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر - اچھے خاصے جوان تندرست سرِ شام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسے سے چلے آرہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی - اور یہ رونق صحافت و سیاست رخصت ! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے - فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ہے

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

کچھ تو انعام حق پرستی کے | ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
ائے مرے رند بادۂ حق کے | ابھی دو چار خُم پیے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی | کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کشت بہشت کارستہ | ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے۔ شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے، بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور وفکر۔ نہ اصلاح نہ ترمیم بس جو دل میں آگیا، جھٹ کہہ لذرے یہی حال نثر کا ہے، یہی حال نظم کا، زمانہ حکومت کی اصطلاح میں، نظر بندی کا تھا، لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت نظر کشائی کا قرار پایا، خوب خوب پیتے پیتے کی کہنے لگے۔

سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے آئے
اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سُنیئے:۔

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے
یہ کیا کہ مئے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سُنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جو سبر وہ تیری ہی تو کہیں داستان نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد

ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تری آرزو نہ ہو

باقی ہے موت ہی دلِ بے مدّعا کے بعد

"حنا" کا قافیہ اس طرح میں آسانی سے آسکتا تھا لیکن ذرا دیکھئے محمدؐ علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے و لے

میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل

ہاں مِن مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہر حال ایک مسلم اُستاد تھے۔ جوہر اُن کے مقابلہ میں مبتدی اور نو آموز جیسے شعر و شاعری سے فنی واقفیت کے لئے زندگی بھر چند لمحہ کے لئے بھی فرصت نہ ملے پھر بھی کچھ ایسا ہیٹا نہیں رہا ؎

لذّت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں آتا ہے لطف جرم تمنّا مزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا جیل کے باہر، ہندوستان بھر کی سڑکوں پر گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پر چرچا تھا کہ بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ کہنا تو محمد علی کی بی اماں کا تھا اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے کہ

تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے

پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو

خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے۔ یا اپنی آٹو بیاگرفی (خود نوشت سوانحِ عمری) "آپ بیتی" قلمبند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا

سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

اے شافع محشر جو کرے تو نہ شفاعت

پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے

کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے

اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لئے ہے

محمد علی کا کلیجہ آخر عمر میں اپنوں ہی کے طعنوں سے جنہوں نے چھلنی ہوتے دیکھا ہے، وہی کچھ اس "شاعری" کی قدر کر سکتے ہیں۔ اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں احسان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے

ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا تو صاحب "معارف" مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان بھی اسی دوسرے مصرعے کو رکھا ہے۔

ماتم یہ زمانے میں بپا تیرے لئے ہے۔

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو، عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو! ۱۹۲۲ء میں جسم قید فرنگ میں، دل ترکوں میں اٹکا ہوا جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا۔ بیجاپور کا جیل خود آبادی سے بہت دور سا ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں، دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بے خود یہ قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی!

سن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلئے ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا

تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی! [1]

---

[1] تلمیح ہے آیۂ کریمہ اِنَّ کَیدِی مَتِین کی طرف

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا!

اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی

اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اس کے باب میں

کب ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی

تینوں حرم اسی کے جو ہے لاشریک لہٗ

ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی[1]

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑایا، اور جلا وطن بنا رکھا تھا۔ رامپور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے، بڑھے تھے کھیلے تھے چپہ چپہ دل میں لبا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ یہ کسی کو یہ مستقل جلاوطنی بھگتنی پڑے جب قدر معلوم ہو، ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ہم نہ تھے اُن کے آستانے کے

ایک اک کرکے سب کے سب تنکے ہوئے برباد آشیانے کے

دیکھئے اب یہ گردش تقدیر کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید اور وہ بھی تنہائی، بیجاپور جیل کی کال کوٹھری کے اندر خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں۔ سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا، کیا کچھ دیکھ لیا۔ کیا کچھ دکھا دیا۔ راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان درود خوانی پر آئی تو کچھ اتے پتے اس عالم کے بھی دیتی

---

[1] اشارہ ہے مسیحوں کے عقیدہ توحید فی التثلیث کی طرف۔

چلی گئی ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیّت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں ایسی قید پر ہزاروں آزادیاں، انتشار ہوں اس ویرانے پر ہزارہا آبادیاں مشتِ خاک کا شمار اب عالم پاک میں تھا - لوہا جب تپ کر، دہک کر لال انگارہ بن جائے تو وہ باقی ہی کب رہ جاتا ہے، جو ہر اب عالم معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے، اُن کی شاعری الفاظ و حروف کی رہ کہاں گئی تھی؟ —— ایک دیوانہ تھا جسے ایک دوسرے دیوانے نے مرنے کے بعد بھی بلا ظاہری ملاقات و تعارف کے خوب پہچانا - اور خوب ہی کہہ ڈالا ؎

بدین مصطفےٰ دیوانہ بودی — فدائے ملّتِ جانانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی — وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشقِ پاکت — ز آئینِ خرد بیگانہ بودی

رسیدی از رہِ اغیار تا یار　　عجب مستے عجب دیوانہ بودی

(از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن۔ نظم کے باقی اشعار سیرت محمد علی میں ہیں) زبان پر آئی ہوئی واہ واہ کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک۔ دل سے نکلی ہوئی آہ کی رسائی مالک عرش تک رومی اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ کیا محض اس لئے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی زندہ روح ہوتی تھی، فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہو گئے محاورات تبدیل ہو گئے۔ ترکیبیں نئی ہو گئیں لیکن حی و قیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں، خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جو ہم نے بھی اپنے کو اُسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا، فنا کر دیا تھا عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی ان کے نصیب میں بھی آجائے!

سیرت محمد علی رح

دیباچہ

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو ممتاز ترین اکابر و مشاہیر پیدا کیے، اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت اُن میں سرِ فہرست کس کو بنایا جائے اور کون ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری تاریخ عصر حاضر کی آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جا سکتا ہے، اور وہ نام نبی اور ایک ولی کے ناموں کا مجموعہ ہوگا یعنی محمد علی۔

اس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علماء دین پیدا کیے، لیکن اُن کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی۔ بعض نامی و گرامی مشائخ طریقت پیدا کیے لیکن اُن کا نام بس مریدوں اور معتقدوں کے حلقہ کے اندر رہا۔ بعض مشہور قومی "رفارمر" پیدا کیے لیکن اُن کی اور اُن کے "رفارم" دونوں کی شہرت جدید تعلیم یافتہ گروہ کے حدود سے آگے نہ بڑھی، بعض زبردست خطیب اور مقرر پیدا کیے، لیکن اُنہیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگریسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا۔ یہ حال مشاہیر خاص کا ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر رہیں اور تنگ تر دائروں سے اُن کی گونج آگے نہ بڑھی۔ ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز شمال نے بھی سنی اور

لہ سیرت محمد علی از مولوی رئیس احمد جعفری ندوی، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۲ء نظر ثانی ۱۹۴۴ء

جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی وادیوں نے بھی، خواص نے بھی اور عوام نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، بوڑھوں نے بھی اور بچوں نے بھی، آسام نے بھی اور سندھ نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی، وائسرائگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی بڑجیوں نے بھی، اور جیل خانہ کی تنگ و تاریک کال کوٹھریوں نے بھی، راجوں مہاراجوں کے قصر و ایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی!

اس کا کلام سُنکر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کر ہنسے، اس کا پیام سُنکر مسجد کے در و دیوار بلبلا کر روئے، خانقاہیں اور درسگاہیں ہوٹل اور بازار، دفتر اور کارخانے، "آزادوں" کی کانگریسیں اور "رجعت پسندوں" کی کانفرنسیں، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل، جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، چپہ چپہ پر اس کے نقش قدم کے نشان ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہتیرے تھے، قابل بھی اور فاضل بھی۔ لیکن قبول خداداد اور جمعیت تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز، یہ سعادت "زور بازو" کا نتیجہ نہیں ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

کہتے ہیں جو حق تعالےٰ کا ہو جاتا ہے، حق تعالےٰ اس کا ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا، لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالےٰ کے بندوں کا ہو گیا تھا اللہ کے بندے اس کے ہو گئے تھے، محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر، خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا تھا۔ خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علی کے لئے وقف کر دیا۔ وعدہ ربانی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ع ۹)

یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال
کرتے رہتے ہیں خدائے الرحمٰن اُن کے لئے
(خلق کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا۔

کی تفسیر لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھی، گوشت و پوست کی مجسم تفسیر محمد علی کی زندگی میں نظر آئی

اس دل و دماغ کا، ان صفات و کمالات کا سردار کسی قوم کو خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے۔ جنہیں یہ نعمت ملی انہوں نے قدر نہ کی — وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے؟ — دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی؟ ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی - آئی اور گئی - ؎

تو نظیری ز فلک آمده بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

اور پھر ہم مسلمان! ہم نے اپنی ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے؟ شیر خدا علی مرتضیٰ رضؓ کی؟ خلیفۂ رسول عثمان غنی رضؓ کی؟ جوانانِ جنت کے سردار حسین رضؓ کی؟ جب اپنی شوریختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر ہم نے نہ پہچانی تو اب اس کا کیا غم و ماتم کہ ان کے ایک ادنیٰ خادم محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور یہ اسے خواہ مخواہ شوریختی ہی کیوں قرار دیجئے؟ حکیم مطلق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا ہے؟ خدا جانے کتنی تکوینی مصلحتیں ان میں بھی ہوں گی!

کم تھے جنہوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی، کم تر تھے جو اس کوشش میں کامیاب ہوئے — ادب و انشاپردازی، سیاست و قیادت، خطابت و صحافت، طرح طرح کے

گھرے گھرے نقاب کچھ اس طرح تہ بہ تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرہ کے اصلی خط و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار ہی ہو گیا تھا۔ مبارک تھے وہ جنہوں نے قریب آ کر دیکھ لیا۔ مبارک تر تھے وہ جنہوں نے دور ہی سے فراست ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا اور جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش و برملا کہہ دیا[1]

بدینِ مصطفےٰ دیوانہ بودی | فدائے ملتِ جانانہ بودی
بہ بزمِ مارئیس عشق بازاں | بہ رزمِ دشمناں فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بے نوائے | بہ قالب پیکرِ شاہانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی | وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتی بر عشقِ پاکت | ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم، نہ سوزم | تو شمعِ دین را پروانہ بودی
بایماہا ز تو زورے و شورے | بجاہاہا ہمت مردانہ بودی
رمیدی از رہِ اغیار تا یار | عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہے۔ محمد علی پہلے جو کچھ بھی رہے ہوں علیگڈھ کے ایک مشہور "کھلنڈرے" آکسفورڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی

---

[1] الحاج مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بہاری شیخ الحدیث (عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد) اہلِ دل اور اہلِ علم دونوں کی صفِ اول میں ہیں۔ زندگی میں کبھی محمد علی سے ملاقات نہیں ہوئی، وفات پر جو جلسہ تعزیت حیدر آباد میں ہوا، بس اس میں مولانا ابل پڑے۔ اور وہیں تعزیتی تقریر بیچ میں رو رو کر یہ اشعار کہہ سنائے۔

کے ایک اعلیٰ انشاپرداز، انگریزی صحافت کے ایک جوہر قابل شیکسپیئر کے ایک ماہر نقاد ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ایک نامور رہنما، ایک ممتاز سیاسی لیڈر وغیرہ، لیکن آخر میں یہ آخر میں یہ ساری حیثیتیں گھل گھلا کر سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت باقی رہ گئی تھی، اور وہ جو کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لئے مشہور تھا، اپنے "خبط" و دیوانگی کے لئے بدنام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک و ملت کا سیاسی رہنما چل بسا، لیکن اپنے دل سے صدا اٹھی تو بس یہی، کہ آج محمدؐ کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

ہاں، وہ ذاتِ محمدؐ کا شیدائی، دینِ مصطفےٰ کا دیوانہ اور امتِ محمدی کا بن داموں کا غلام تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کہیں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور چبھن محمد علی کے پہلو میں ہونے لگتی، مصیبت کسی مسلمان پر بھی آتے اور درد سے بیتاب محمد علی۔ اسلام پر، قانون اسلام پر، شعائر اسلام پر، کہیں کوئی حملہ ہوا تڑپ محمد علی کے دل و جگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آپڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو، کسی سے بھی ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لئے سپر بنا ہوا! ۲۶ء میں حج اور شرکت مؤتمر اسلامیہ کے لئے جب جانے لگے، اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی قائم ہوئی تھی، تو اپنے اردو روزنامہ ہمدرد میں اپنے قلم سے لکھا:-

"اب نہ بنی امیہ کا دور ہو سکتا ہے، نہ بنو عباس کا، نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہوگی"

دن رات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ، آخری سفر پر، اور وہی سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے تو اس وقت بھی ناموسِ اسلام کے

تحفظ پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے تھے۔ حق تھا کہ جب ایسے شخص کی موت آئے تو سارا عالم اسلام، مشرق سے مغرب تک اس کی عزاداری میں سیہ پوش ہو جائے اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرا بن جائے، اور یہی ہوا، پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ بھی ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لئے آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے۔ سلیمانؑ و داؤدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا قبلہ، خود نبی القبلتین کا پہلا قبلہ اقبال مرحوم نے مرثیہ میں کیا خوب کہا ہے ؎

خاک قدس اورا بہ آغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

"جسم" کو جو عروج نصیب ہوا سب نے دیکھا، "روح" کو جو مقام حاصل ہوا ہوگا اس کا اندازہ کون کرے؟ جسے آدمی کاندھوں پر اٹھا کر لائے اُسے سب نے دیکھا۔ جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اس کے درجے اور مرتبہ کو کون پہچانے! الایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ اظہار خیال کر سکتا ہو، جو عین ہیجان مخالفت کے وقت سنہ ۱۹۲۰ء میں لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل، شستہ و برجستہ تقریر و تحریر پر قادر ہو۔ جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے، سارڈا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کر کر کے انہیں قائل و معقول کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو جو اپنے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ میں سیاست حاضرہ اور مذہب پر دس دس بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشا کے ساتھ سپرد قلم کر سکتا ہو، انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ انہیں میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری

طرف مسجد کے ممبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی داڑھی بھگولے، اور سُننے والوں کی ہچکیاں بندھ بندھ جائیں، محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد و سال دیکھ کر دوسروں کو وجد آ جائے، مسئلۂ قتل مرتد پر فتویٰ جمہور کے خلاف جب قلم اُٹھائے تو اپنے تفقہ کی داد اچھے اچھوں سے حاصل کرے، آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے، متقشف ایسا کہ مصطفےٰ کمال اور امان اللہ خاں کو آخر تک معاف نہ کرے، نماز کا پابند اتنا کہ ایوانِ پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جانماز بچھا کر کھڑا ہو جائے اور اس عمارت کی ساری تاریخ میں بالکل ہی پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کر جائے، دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے، سلطانِ وقت کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سُن کر رکھ دے، ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہلِ سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتماد و عقیدت سے سرفراز، ایسی "عامۃ الورود" ہستی کی سوانح حیات مرتّب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت کے سلسلہ میں جتنے بھی اہم جلسے اس پچیس، تیس سال کے اندر، اسلامی ہند کے اندر ہوئے، بلکہ عالم اسلامی کے طول و عرض میں جو بھی اہم تحریک کسی ادارے سے اُٹھی محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کار فرما اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ اس میں موجود۔ ایسے شخص کی سیرت نگاری، ایک شخص کی سیرۃ لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتّب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رُخ نمایاں کئے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیئے جائیں، کیا کیا پھیلایا جائے، اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر موضوع ایک مفصّل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی ایک پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیتی - اور وہ بھی برجستہ اور فی البدیہہ نہیں، ایک عرصہ تک تلاش و تفحص جاری رکھنے کے بعد، اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی لیکن حالات مساعد نہ ہونے تھے نہ ہوئے، تفصیلات کو چھوڑ دیتے، ان اسباب کی شرح اگر کی جائے تو خود ایک مستقل رسالہ "شرح اسباب" تیار ہو جائے، جمود اور افسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر و ہونہار اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کے لئے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا - جس کے سنبھالنے کے لئے کئی قوی اور تنومند پہلوان، کشتیاں نکالے ہوئے، اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھے - آفرین و رحمت اس کی ہمت پر، آفرین و رحمت جامعہ کی مستعدی دکار گذاری پر، جامعہ، ہاں وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ — وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا -

---

منازل سفر کی وادیاں، اور راہ کی دشواریاں، زادِ سفر کی بے سرو سامانیاں اور یارانِ طریق کی کج ادائیاں ان سب کی شکایت کیا، اور کس سے کیجیے؟ اور کیجیے بھی تو سننے والوں سے امید کیا رکھیے؟ خود جوہر ہی کے الفاظ ہیں،

خضر کیا جانیں بھلا راہ نمائی کے مزے!

بہر کیف و بہر حال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق و عقیدت کے جذبات، جو کچھ اپنے نقوش کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں "یہ لختِ دل" ہیں ان پر "مالِ تجارت" کا دھوکا نہ ہو

آگے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرمالیا جائے۔

صاحبِ سیرت کی زندگی، سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے بلکہ اکثر تو دوستوں بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گذری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرت دیانت کے ساتھ لکھی جائے، اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہوجائے" خالد جانباز" کے وقائع اور کارناموں میں کوئی" حافظ شیراز" کا رنگ آخر کیوں کر بھر دے؟ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جا بجا صدمہ یقیناً پہنچے گا اس کے لئے شروع ہی سے تیار ہوجایئے، مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اٹھایا ہے، پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہوسکتے تھے، علی مرتضیٰؓ کے سیرۃ نگار کے لئے جنگ صفین، اور حسینؓ ابن علیؓ کے سوانح نویس کے لئے میدان کربلا کے ذکر کو نظر انداز کر دینا، آخر ممکن کیونکر ہے۔

عروسِ ادب[1]

تقریب

ہوش - ذی ہوش" میرے پرانے عنایت فرما ہیں، حیدر آباد میں اُن کے عروج و زوال دونوں کا تماشہ ان آنکھوں نے دیکھا ہے[2] ۱۷ئہ و ۱۸ئہ میں ایک وقت وہ تھا، جب ہوش کی ہوشمندی کا ہر طرف چرچا تھا - ذخیرہ کی کنجی[3] اُن کے ہاتھ میں تھی، اور ذخیرہ زبان و ادب کا ذخیرہ کیا، یہ کہیئے کہ پورا "گودام" بنا ہوا تھا - ایک وقت وہ بھی آیا کہ ہوش مع اپنی "ہوش ربا" کے اس جنتِ ارضی سے رخصت ہو گئے، اور ایک ظریف کو برجستہ یہ مصرع یاد آگیا ع "ہوش" رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ!

ایسے ہی واقعاتِ عبرت سے ہم جیسے "بیہوشوں" تک کے ہوش آ جاتے ہیں!

مزاج عاشقانہ پایا ہے، اس لئے گردشِ تقریر بھی کچھ عاشقوں ہی کی لازمی تھی ارض "فلک نما" پر خسروِ دکن کے الطافِ کریمانہ سے سرفراز تھے - یمین سلطنت مہاراجہ شاد

---

[1] عروسِ ادب، از ہوش بلگرامی، مطبوعہ ۱۹۳۵ء - نظر ثانی ۱۹۴۴ء

[2] اور اب اس مضمون کی نظر ثانی کے وقت، تیسری بار اُن کے کمال عروج کا نظارہ کر رہا ہے ہوشیار ہمیشہ سے تھے - اب چشم بد دور، نواب ہوش یار جنگ بہادر ہیں -

[3] ہوش بلگرامی اسی نام سے ماہوار رسالہ حیدر آباد سے نکال رہے تھے -

کی عنایتوں سے شادکام تھے، عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی) کے سایہ تربیت میں پروان چڑھ رہے تھے کہ دفعتہً یہی زمین اُن کے حق میں آسمان بن گئی۔ "فلک کج رفتار" کے فرضی افسانے شاعری کی دنیا میں، خدا معلوم کتنی بار سن سُنا چکے تھے، اب وہ "آپ بیتی" تھے۔ بالآخر سرزمین رامپور کی کشش نے انہیں اپنا لیا رہتا ہے کہ یہاں افواج ریاست کے بخشی ہونے کی عزت انہیں بخشی گئی ہے۔ لیکن انہیں تو بخشی اُردو کے لشکر کا ہونا تھا، اُن کی فوج میں تو انشا کی تلواریں چمکتی تھیں، زبان کے پیادے بھرتی ہوتے تھے، ادب کے رسالے نکلتے تھے، فصاحت کی پلٹنیں آراستہ ہوتی تھیں، بلاغت کے قلعے تعمیر ہوتے تھے، شاعری کے معرکے سر ہوتے تھے اور مشاعروں کی توپیں ڈھلتی تھیں! ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رامپور بالقابہ محض شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر نواز بھی ہیں، اُن کے لئے اس آرزو کو واقعہ میں تبدیل کر دینا کیا دشوار ہے۔

اُردو کے ایک ادیب نے عرصہ ہوا ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہوش تو بڑی رقم نکلے" یہ بالکل درست تھا اور کیوں نہ درست ہوتا۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم کی صحبت و تربیت تو بے ہوشوں کو ذی ہوش بنا سکتی تھی، چہ جائیکہ اُس کو جو مجسم ہوش ہو۔ مرحوم نے ہوش کو یہی نہیں کہ مدتوں مثل اپنے عزیز کے رکھا بلکہ ان کے بعض مضامین کو بھی اپنی اصلاح سے مشرف فرمایا، اور غالباً ہوش مندی کے اندازہ کے بعد ہی یہ تخلص "ہوش" بھی عنایت فرمایا تھا۔ خدائے ہوش سے دعا ہے کہ اس "ستارۂ بلندی" کی تابش میں اضافہ کرتا رہے!

فاضل دوست مولوی عبدالحی صاحب کا ارشاد ہے کہ ہوش کے مزاج میں غضب کی جلدی ہے۔" جلدی ہو یا نہ ہو، لیکن تیزی تو یقیناً ہے ـــ دل تیز، ہاتھ تیز، پیر تیز، سوجھ بوجھ تیز، قلم تیز۔ خیریت یہ گذری کہ زبان نہیں تیز، ورنہ اور ہر شے میں تیز! اور محض تیز ہی نہیں، بلکہ تیز و طرار! اُن کی تیزی و طراری، شوخی و رنگینی کے جلووں کی آئینہ داری اگر

مدِ نظر ہو تو بسم اللہ "عروس ادب" کے چہرہ سے نقاب الٹ کر خود ملاحظہ فرمایئے۔

خوش سلیقگی اور لطافت پسندی ہوش کے خاص جوہر ہیں۔ اُن کے نمونے اگلے صفحات کی سطر سطر میں ملیں گے۔ اِن جواہر پاروں کی قدر وقیمت کا پرکھنا، مرحوم مہدی حسن رضا صاحب (افاداتِ مہدی) جیسے جوہری کا کام تھا، ہم تماشائی تو محض اس بزم رنگیں کی سجاوٹ کو دور سے دیکھ کر خوش ہو جانے والے ہیں! "عروس ادب" کی کائنات میں انہوں نے اخلاق، ادب، معاشرت، سیاسیات، ہر شعبۂ موجودات کا جائزہ لے ڈالا ہے، اور ہر میدان میں گام زنی فرمادی ہے، لیکن اُن کے پائے نازک کی سبک خرامیوں کے لئے ادبیات ہی کا فرش مخملیں کچھ زیادہ موزوں ہے! خدائے پاک اُنہیں زیادہ فرصت و فراغت نصیب کرے کہ زبان و ادب کی زیادہ گراں مایہ خدمات انجام دے سکیں اور جس "عروس" کا ڈولا اپنے گھر لائے ہیں، اس کا اور ان کا دونوں کا نصیبہ بلند ہو!

مسدّس ۱۹۳۵ء میں[1]

تقریب

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر　　عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر　　ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

اکبرؔ و اقبالؔ کے دور سے قبل، اپنے شعر و تغزل کے وصف آپ نے شاعر ہی کی زبان سے سُن لئے؟ اپنی دو ستران قبل والی شاعری کا عکس، آپ نے خود شاعری کے آئینہ میں دیکھ لیا؟ ـــــ کیا اب اس کی بھی حاجت ہے کہ اس ناپاک دفتر، کے کچھ اوراق بہ طور نمونہ، آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں؟ گویا دن دوپہر کی کڑی دھوپ کے وقت اس کی بھی حاجت ہوتی ہے کہ پہلے صغریٰ و کبریٰ قائم ہولیں اور انتاج مقدمات کی باضابطہ شکل مرتب ہولے جب جاکر آفتاب کے روشن ہونے کا یقین آئے۔

بات اتنی صاف اور کھلی ہوئی، حقیقت اتنی روشن و واضح، لیکن آج سے پچاس ساٹھ سال اُدھر جب پہلی بار حالیؔ کی زبان سے نکلی، تو بس اک آگ سی لگ گئی اور آگ بھی کہاں؟ راون کی لنکا میں! اعتراضوں اور راکششوں سے بھری اور پٹی پڑی ہوئی

---

[1] مسدس حالی (صدی ایڈیشن)، ناشر:- حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
تحریر:- ۱۹۳۵ء نظر ثانی ۱۹۴۴ء

لنکا ہیں! بڑے بڑے پہلیتن، یلغار کر کے ٹوٹ پڑے، جواب کے لئے، تردید کے لئے،
تضحیک کے لئے۔ کوئی صاحب "حال" کے مقابلہ میں "قال" لے کر "قالی" بن کر آئے، کسی صاحب نے
"خیالی" کا روپ بھرا۔ اور پنچ اخبارات کی تو پوچھئے نہ، ان بے چاروں کا تو آذوقہ کھل گیا۔
"حالی کا حال" اور "میدان پانی پت کی طرح پائمال" یہ تھا اُن کی تک بندیوں کا جال،
اور اُن کی مسخرگی کا کمال ــــــــــــــ دوسروں کو بنانے سے پیشتر
خود ہی مسخرے بن کر رہے!

آج یہ سارے جوابات کہاں ہیں؟ ان اخبارات کی پرانی فائلیں بھی کہیں ملتی ہیں؟ اُس
ساری دھوم دھامی، کڑک گرج کا کہیں نام و نشان بھی باقی ہے؟ هل تحس منهم من احد
او تسمع لهم رکزا؟ بھیڑ کے چونی ٹکٹ والوں کی تالیاں، اور بازاری پھبتیاں مدت
ہوئی ختم ہو چکیں ــــــ اور ان کے مقابلے میں "مسدس"؟ کیا یہ کہنے کی، یہ بتانے کی،
حاجت ہے، کہ اب تک کتنے ایڈیشن پر ایڈیشن اس کے نکل چکے، کتنی محفلوں میں بند
اس کے پڑھے جا چکے، وعظ کی کتنی مجلسوں کو یہ گرما چکا، کتنے ادبی امتحانوں کے نصاب میں
داخل یہ ہو چکا، کتنے بوڑھوں کی، جوانوں کی، لڑکوں کی، زندگی میں انقلابی اثر
پیدا یہ کر چکا، کتنوں کو رلا کر یہ رہا، کتنوں کے دل اس نے بڑھائے؟ غرض مقبولیت کے
مرجعیت کے، جتنے بھی معیار ہو سکتے ہیں، سب کے لحاظ سے آج اسے دیکھ لیجئے، جانچ لیجئے
پرکھ لیجئے! ــــــ بھلا ایک صاحب حال عارف، کہیں آہ و زاری کے ساتھ، گرم
گرم آنسوؤں کے ساتھ، ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ مناجات میں مصروف ہو، اور
شہر کے کچھ لفنگے آ کر لگیں، تالیاں بجانے، ڈھول پیٹنے، تو اس سارے سوانگ سے
اس اللہ والے کی مقبولیت میں کچھ فرق آئے گا؟

تقریب کا عنوان، آپ کہیں گے کہ مُسدّس حالی، کیوں نہ رکھا گیا ادھورا یعنی صرف مسدّس کیوں رکھا؟ ادھر سے عرض ہوگی کہ مطلق مُسدّس بھی مراد ہو سکتا ہے؟ محض مسدّس بولنے سے کیا ذہن کسی دوسرے مسدّس کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے؟ کسی اور مسدّس کا التباس ہوتا ہے؟ — مثنوی، مطلق بولنے سے، اگر ذہن صرف مثنوی مولانائے روم ہی کی جانب جاتا ہے تو مطلق مسدّس کے لفظ سے بجز مسدس حالی کے اور کچھ کوئی کیوں سمجھنے لگا؟ کسی اور کا دھوکا کسی کو کیوں ہونے لگا؟ کوئی دوسرا مسدس فرطِ شہرت سے فرطِ مقبولیت سے ذہنوں کے سامنے ہے کیا؟

خیر یہ تو ایک لفظی سی گفتگو چھڑ گئی، اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا، اور اس شان کا، اس جمال کا، اور اس کمال کا، اردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی؟ جب اپنے 'آج' کی پستیاں دکھانے پر آتا ہے تو دیکھئے، کیسے کیسے پردے کھول کر رکھ دیتا ہے ؎

کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے   کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی   مدک اور چانڈو کا رسیا ہے کوئی
نہ گالی سے، دشنام سے جی چرائیں   نہ جوتی سے، پیزار سے ہچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو لچپن دکھائیں   جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اٹھائیں
لرزتے ہیں اوباش ان کی ہنسی سے   گریزاں ہیں رندانکی ہمسائگی سے

اور جب اپنے گذرے ہوئے "کل" کی بلندیوں کی تاریخ سنانے لگتا ہے تو اک دم ناصح ملامت گر شاعر رجز خواں بن جاتا ہے ؎

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحیٰ کے اٹھی
پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی

جو ٹیکس یہ گرجی تو گنگا پہ برسی | کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی | رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

. . . .

مہیا کئے سب کی راحت کے ساماں | کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں
انہیں کر دیا رشک صحن گلستاں | خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں
یہ سب پودے انہیں کی لگائی ہوئی ہے | بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے

خامیوں سے کون بشری تالیف آج تک بچ سکی ہے؟ کون آئندہ بچ سکے گی؟ نکتہ چینی پر کوئی آجائے، تو عیب کہاں نہیں نکل سکتا؟ تو اس معیار کو خیر جانے ہی دیجئے، حق و انصاف کے کوچے سے اگر آئیے، تو خدا لگتی یہ ہے کہ مسدس اپنا کام مدت ہوئی کر چکا، احساس کی بیداری جو اس کا مقصد تھا۔ ابھی مدتیں گذریں کامیاب ہو چکا، اکبر اور اقبال جیسے سعید جانشیں پیدا کر چکا، اگر اس کے بعد مٹ گیا ہوتا۔ دنیا اسے بھول گئی ہوتی، جب بھی یہ اس کی منقصت نہ تھی، عین فطرت کا تقاضا ہوتا۔ ضرورت دعوت پوری ہو چکنے کے بعد داعی کو باقی رکھنا سنت الٰہیہ میں داخل ہی نہیں لیکن جب کوئی اپنی بخششوں کو بغیر حساب اور بغیر شمار لٹانے والا، محض فضل اور محض انعام پر آجائے، تو کیا کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟ جس کو جتنی چاہے دولتِ حیات سے سرفراز کرے!

اور پھر وہ جو رسولؐ کی زبان سے توحید کی منادی کرنے پر آجائے تکبیر و تحمید کا غلغلہ ڈالدے سے کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق!

اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق ۔۔۔ اُسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

. . . . ۔۔۔ نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی!

جہاں دار مغلوب و مقہور ہیں واں ۔۔۔ نبی اور صدیق مجبور ہیں واں!

نہ پرسش ہے رہبان و احبار کی واں ۔۔۔ نہ پروا ہے ابرار و احرار کی واں

. . . . . . ۔۔۔ مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا

سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ ۔۔۔ اُسی طرح ہوں میں بھی اک اُس کا بندہ

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم ۔۔۔ نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم

نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم ۔۔۔ کہ بےچارگی میں برابر ہیں ہم تم

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بڑائی ۔۔۔ کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

اور نعت گوئی کی لے جب چھیڑے تو نغمہ کے بول یوں زمزمے بن بن کر نکلنے لگیں ـــ

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا! ۔۔۔ دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ۔۔۔ مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا ۔۔۔ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ ۔۔۔ یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

. . . .

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا! ۔۔۔ اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور جب دربار رسالت میں فریاد و استغاثہ کرے، تو سننے والوں کے دل ہلا کر رکھ دے ـــ

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے

امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اے چشمۂ رحمت بِاَبِی اَنتَ و اُمّی!
دُنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہے
بتاؤ ترے جب کہ یہ اعدا پہ ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ اُمید سوا ہے
کر حق سے دعا اُمت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے
اُمت میں تری نیک بھی ہیں، بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے اک اُن میں سوا ہے
جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تری اُمت کا رہا ہے
جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے
گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں الطالح لی ہم نے سنا ہے

تدبیر سنبھلنے کی نہیں کوئی ہمارے

ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں

پر فکر ترے دین کی عزت کی سوا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری

اُمت تری ہر حال میں راضی برضا ہے

زندگی اس کلام کو بھی نصیب نہ ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟ حق یہی ہے کہ اس کی عمر بڑھے اور خوب بڑھے، اور ہم جیسے حشرات الارض قسم کے فانیوں کے تخیل سے اندازے سے، کہیں بڑھ کر رہے۔

سفر سعادت[1]

(تعارف)

ایک نام کے "امیر"، اور دل کے فقیر کا، میرا ساتھ عرفات کے میدان میں رہا، منی کی قربانگاہ میں رہا، مزدلفہ کی گھاٹیوں میں رہا، صفا کی بلندیوں پر رہا، مکہ کی سڑکوں پر رہا، مدینہ کی گلیوں میں رہا، بندرگاہ جدہ کے دفتروں میں رہا، جہاز رحمانی کے تختوں پر رہا، خشکی میں رہا، تری میں رہا، غرض سفر سعادت کی اکثر منزلوں اور بیشتر حصوں میں رہا، پھر اگر اس روزنامچہ سعادت کی پیش خوانی مجھ گمنام مشت خاک کے نصیب میں آ رہی ہو، تو اس سعادت پر کسی کو رشک اور کسی کو حیرت کیوں ہو؟ —— بلبل کے فخر و مسرت کے لئے یہ کافی ہے کہ "گل" سے اس کا قافیہ ملجاتا ہے۔

روزنامچہ کے مصنف ایک پرانے مشاق اہل قلم ہیں، لیکن جب سفر حج کو نکلے تو اپنا قلم یہیں چھوڑتے گئے۔ زاد سفر میں بس پہلو میں ایک دل تھا جو درد سے چھلک رہا تھا۔ وہاں جو کچھ دیکھا، جو سنا اُسے سادہ زبان میں اپنی یادداشت کے لئے نوٹ کرتے گئے۔ ذوق شکستگی نے اجازت نہ دی کہ پبلک کے لئے کوئی تصنیف تیار کریں شاعری کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ بہترین شعر وہ نہیں جو دنیا کو سنانے کے لئے کہے جاتے ہیں، بلکہ وہ ہوتے ہیں جو خود اپنے لئے کہے جاتے ہیں۔ بعض اوقات نثر کی کتابیں بھی شاعری کے اس معیار سے جانچنے کے قابل ہوتی ہیں۔ سفرنامے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے اس مجموعۂ اوراق کا انداز سب سے نرالا پائیں گے۔ یہاں مصنف دوسروں کو نہیں بلکہ اپنے آپکو مخاطب کئے ہوئے ہے

---

[1] از مولوی حاجی امیر احمد صاحب علوی بی اے۔

زیادہ سے زیادہ اس لطف میں اپنے مخصوص احباب واعزہ کو شریک کرنا چاہتا ہے، یا ان لوگوں کو جو مصنف ہی کی طرح اس سفر سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے ہیں، اور بس۔ مصنف صاحب اپنی روئداد سفر کو زیادہ رنگین اور مرصع ادیبانہ و انشا پردازانہ بنا سکتے تھے اگر چاہتے، لیکن اس سادہ اور بے تصنع پیرایۂ تحریر کی دلکشی ہی کچھ اور ہے۔ شام کو ہوا خوری کے لئے ہزار بن سنور کر باہر نکلئے، وہ بات کہاں جو گھر کے اندر بے تکلف، مخلی، بالطبع بیٹھنے اٹھنے میں ہے۔ لیکن یہ خیال نہ گزرے کہ مصنف آنکھیں بند کرکے گئے تھے اور صرف چند گھریلو باتیں اپنی نوٹ بک میں ٹانک کر اسی طرح آنکھیں بند کئے واپس چلے آئے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا، کم لوگ دیکھتے ہیں، اور اُن سے بھی کمتر زبان پر لاتے ہیں۔ انہیں عید مکہ میں ہوتی ہے۔ اس جشن کی خوشیاں انہوں نے "سفر سعادت" کے صفحات پر خوب منائی ہیں، لیکن اس کے بعد ذرا دل تھام کر اُن کے الفاظ ذیل بھی پڑھ لیجئے:۔

"میں ہندوستان کا رہنے والا۔ عقیدہ کا بودا۔ ایمان کا کمزور۔ اسباب و علل پر نظر کرنے والا اور علت علل سے غافل، آج دارالسلام کی عید اور یہاں کی شان و شوکت دیکھ کر جتنا خوش ہوا اتنا ہی چند باتوں سے طول بھی ہوا۔ خوشی کا بیان ہو چکا، اب غم کی داستان سنیئے:۔

حجاز کا بیشتر حصہ یورپ کی حکومت سے بحمد اللہ ابھی نیم آزاد ہے لیکن عربستان کی اقتصادی فتح لندن کو حاصل ہو چکی ہے۔ یہاں کے بازار انگلستان کے مصنوعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ آج شہر میں ہزاروں روپے کے کھلونے فروخت ہوئے ہیں، اور وہ سب یورپ کے بنے ہوئے ہیں۔ ربڑ کے گیند، ربڑ کے پھکنے، ربڑ کے غبارے

ٹین کے انجن، ٹین کی ریل گاڑیاں، اور ارگن باجے وغیرہ لاکھوں کی تعداد میں یہاں بک رہے ہیں۔ کوئی لڑکا مجھ کو نظر نہ آیا جس کے ہاتھ میں دو چار کھلونے اس قسم کے نہوں۔ افسوس ہے کہ غریب حجاج کی کمائی، اہلِ مکہ کے کام نہ آئی، بلکہ یہاں سے بھی اسی طرح ولایت کو پہونچتی ہے، جیسے ہمارے بدنصیب ملک سے جاتی ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ صرف موٹر کے لوازمات جو اس سال انگلستان سے آئے، ان کی قیمت اکاسی ہزار پاؤنڈ تھی! یہ لوازمات یورپ کے دوسرے مقامات سے بھی آئے تھے، مگر ان کی قیمت مندرجہ بالا حساب میں شامل نہیں۔ ایک موٹر پر کیا موقوف ہے، یہاں کی قریب ہر ایک جنس انگلستان ہی سے آتی ہے، اور تمام دنیائے اسلام کی کمائی مکہ کے راستہ سے یورپ پہنچتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں کی عورتوں کو انگریزی فیشن کی طرف بدرجہ غایت رغبت ہوگئی ہے۔ برقعہ کسی وقت زینت چھپانے کے لئے تھا مگر افسوس اب اس کا مقصود زینت کو دوبالا کرنا ہے۔ زرق برق ریشمی کپڑوں اور اطلسی تھانوں کے برقعے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی چمک دمک خواہ مخواہ ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ نابالغ لڑکیاں جو بے نقاب پھرتی ہیں، وہ سرتاپا انگریزی لباس میں ہیں وہی ریشمی سائے، اور وہی اونچی ایڑی کے بوٹ۔ چوکفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

اور آگے بڑھیے، اور خون کے آنسو بہائیے:۔

"... انگریزی مٹھائیاں، انگریزی بسکٹ بازار میں بھرے پڑے ہیں۔ سگرٹ وچائے شرطِ زندگی ہے۔ گولہ بارود ولایت سے آتا ہے، ڈاک کے ٹکٹ ولایت سے چھپ کر آتے ہیں ریال و ترش لندن سے بن کر آتے ہیں۔ کپڑا انگلستان سے آتا ہے۔ اناج کے لئے ہمیشہ ہی سے یہ وادی غیر مزروعہ ہے، یہاں کی خالص پیداوار صرف تربوز ہیں یا زمزم کا مقدس پانی۔ اونٹ معاش کا ذریعہ تھے اور شریف حسین سابق ملک الحجاز کے قول کے مطابق جس وقت اونٹ کا بچہ پہلی بار مکہ میں آتا تھا، اس وقت سے اس ساعت تک جبکہ وہ صرف پوست و استخوان کا ڈھانچہ رہ جاتا تھا، ہر ایک اونٹ ۴۰ خاندانوں کی پرورش کرتا تھا، کیونکہ اس آلۂ باربرداری کے تمام لوازمات مکہ یا اس کے ملحقات ہی میں تیار ہوتے تھے، مگر اب موٹروں کی بدولت وہ رزق کا دروازہ بھی قریب قریب بند ہے۔ ایک شرمناک بات ہے جس کو لکھتے قلق ہوتا ہے کہ جوان عورتیں بازار میں حاجیوں سے خیرات طلب کرتی ہیں، اور ان کو روپیہ وصول کرنے کے لئے اغیار سے بغل گیر ہو جانے میں بھی غیرت نہیں آتی، زیادہ لکھنا خلاف تہذیب ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا"۔

دل کڑا کر کے ایک قدم آخری بار اور اٹھا لیجیے:۔

"... معاشرت کا یہ حال تھا۔ اب سیاسیات پر غور کیجیے، جدہ میں خطبہ و سکہ سلطان ابن سعود کا ہے، لیکن حکومت درحقیقت برٹش کانسل کرتا

نہ ہے ۔ ابن سعود کے لونڈی غلام بھاگ کر انگریزی سفارت خانے میں پناہ لیتے ہیں اور کانسل جنرل ان کو جہازات پر سوار کرا کے بے تکلف ملک سے باہر نکال دیتا ہے لیکن ملک الحجاز دم نہیں مار سکتا ۔ کانسل کی اجازت کے بغیر کوئی قافلہ جدہ سے مکہ یا مدینہ نہیں جا سکتا مگر بادشاہ کو دخل دینے کا اختیار نہیں ، سفارت خانے نے افغانیوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے واپسی کے ٹکٹ واپس کانسل کے پاس جمع نہ کیے تو وہ مکہ نہ جانے پائیں گے ۔ مگر عرب کا رب زعم خود خود مختار بادشاہ زبان ہلانے کی مجال نہیں رکھتا ۔

مکہ معظمہ اللہ کی حفاظت میں نہ ہے ، مگر انگریزی کانسل جس دن چاہے چند گھنٹوں میں یہاں قبضہ کر سکتا ہے ۔ نجدی فوج جو یہاں مقیم ہے وہ قواعد داں تو کیا ہوتی ، آلاتِ حرب سے بھی صحیح طور پر مسلح نہیں ہے ۔ جس نے جمعۃ الوداع کے دن اور آج بھی ان کا جلوس دیکھا کسی کے پاؤں میں جوتا ہے ، کوئی چپل پہنے ہے اور کوئی ننگے پاؤں کاندھے پر بندوق رکھے چل رہا ہے ۔ کارتوس کی پیٹیاں کمر میں بندھی ہیں ، معلوم نہیں خالی ہیں یا بھری ہوئی ، مگر بندوقیں ٹوٹی ہوئی اور زنگ خوردہ ہیں ۔ یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے ، ہندوستان میں حیدرآباد گوالیار اور اندور کی فوجیں اس سلطانی لشکر سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہیں ۔"

نجدیوں نے مزارات و مشاہد کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور قبور صالحین کی جس طرح توہین کی ہے

خوش عقیدہ وصوفی مشرب مصنّف کا دل اس سے قدرۃً دکھا اور یہ دل کی دکھن آپ کو ان اوراق میں جا بجا نظر آئے گی ساتھ ہی حکومت سعودیہ نے جو بے نظیر امن وامان قائم کر رکھا ہے، مصنّف کی انصاف پسندی اس سے بھی اغماض نہیں رہ سکتی اس کا اعتراف آپ کو ہر مناسب موقع پر ملے گا۔

مصنّف صاحب کو "معلّم" کے جن مظالم سے بالا پڑا تھا، ان کا تذکرہ اس بسط و تفصیل کے ساتھ ممکن ہے بعض نازک طبائع کو گراں گزرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ؎

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنین حائل

کا اندازہ "سبک ساران ساحل" کسی طرح کر ہی نہیں سکتے۔ جس غریب کو قدم قدم پر اگر "فسوق" نہیں تو "جدال" پر مجبور ہو جانا پڑتا ہو، مستحبات و سنن سب ایک ایک کرکے ہاتھ سے جا رہے ہوں، سکون قلب و انبساط کے بجائے ہر لمحہ انقباض و تشویش کا شکار بننا پڑ رہا ہو، بلکہ دھڑکا یہ لگا ہو کہ سارا حج ہی غارت ہوا جا رہا ہے، اس کا رویاں رویاں معلّم کی جان کو روئیگا یہی غنیمت ہے کہ وہ سفرنامہ کی جگہ "معلم سکندر" کے کارناموں کے بیان میں پورا سکندرنامہ نہیں لکھ ڈالتا! دوسروں کو ایسے خطرات سے آگاہ کر دینا، جائز ہی نہیں واجب ہے۔

کوئی بشری کوشش، بشری لغزشوں سے پاک نہیں رہ سکتی، مصنّف نے اپنے اس نیاز مند کا ذکر ان اوراق میں متعدد مقامات پر کیا ہے، لیکن کہیں کہیں تو افراط حسن ظن کا کمال ہی دکھا دیا ہے، اور اپنی ساری شہرت ثقاہت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے۔ محدثین کرام نے صوفیہ و مشائخ سے روایات قبول کرنے میں جو احتیاط برتی ہے، اسکی حکمت کا یقین تو پہلے سے تھا ہی، اب عین الیقین ہو گیا۔

مسک کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر آپ کا شامہ درست ہے تو آپ مشک کے سامنے

آپ نے ہی خود اسے پہچان لیں گے، اور عطار کی ہر لسانی اور چرب زبانی سے قطعاً مستغنی رہیں گے بہار بھی دیار حبیب سے آیا ہوا مشک آپ کے سامنے حاضر ہے، اگر مشام جان کہیں خوشبو محسوس کرے تو مصنف اوراق کے ساتھ اس نامہ سیاہ تعارف نگار کے حق میں بھی دعائے خیر فرما دیجئے گا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر سے محروم نہ رکھے گا۔

سیرت سید احمد شہیدؒ

(تعارف)

حضرت سید احمدؒ رائے بریلوی پچھلی صدی ہجری کے اُن اکابر و مشاہیر میں گذرے ہیں، جن کی یاد، مسجدوں اور خانقاہوں کی دُنیا الگ رہی، لندن اور آکسفرڈ اور کیمبرج کی دُنیا کے بھی حافظہ سے محو نہیں ہوئی ہے۔ "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" ان کے تذکرہ سے مُزین، "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" میں ذکر ان کا موجود، "انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" میں کارنامے اُن کے مذکور۔ یہ الگ بات ہے کہ دوست اُنہیں عقیدت کی آنکھوں کے اندر جگہ دیتے ہیں اور دشمن کی نگاہ میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ لیکن نظریں اس شہید پر بہرحال پڑتی ہی ہیں ؎

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

——جس کا نام ملائکہ ربّانی کے نُورانی رجسٹروں میں درج ہو، اس کے تذکروں اور چرچوں سے اگر خاکیوں کے سینے، اور آدم زادوں کے سفینے معمور ہوں، تو اس پر حیرت کیوں کیجئے! سید صاحبؒ کے سوانح و حالات، کرامات و کمالات میں ضمناً و مستقلاً اس وقت تک متعدد کتابیں موجود تھیں، لیکن اکثر نے سید صاحب کو ایک مخصوص و محدود ہی نقطۂ نظر سے

لہ از:- مولانا ابوالحسن علی ندوی، طبع ۱۹۳۹ء

دیکھا ہے ہر کسے از ظن خود شد یار من
از درون من نہ جست اسرار من

ضرورت اس کی تھی کہ کوئی سیرت ملک کی عام زبان میں، سلجھے ہوئے انداز سے، ایسی لکھی جائے، جو ایک طرف آپ کی ساری حیثیات کی جامع ہو، اور جس میں عام پسند خوارق و عجائب سے زیادہ لحاظ واقعات کی صحت و استناد کا، اور آپ کی تعلیمات، اور آپ کی تحریک کے اصل مقاصد کا رکھا جائے،

شکر ہے کہ یہ سعادت، سو برس سے زائد عرصہ گذر چکنے کے بعد اسی خانوادہ کے ایک ہونہار و صاحب رشد، جوان ہمت، اہل قلم کے نصیب میں آئی۔ کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک مجاہد کی سوانحمری میں ہونا چاہیے، لیکن زور بیاں صرف شوق غزا ہی پر نہیں ختم ہو گیا ہے۔ علوم شریعت، مسائل طریقت، مباحث سیاست، سب اپنی اپنی جگہ پر حسن ترتیب اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس محمل میں سجے ہوئے نظر آئیں گے، زبان صاف، سلیس، تیز رو، بیان میں نہ اتنا اختصار کہ پڑھنے والے کا شوق جھنجلا اٹھے، نہ اتنی طوالت کہ مطالعہ کرنے والے کی ہمت جواب دے نکلے۔ پھر سید صاحب اور اسمٰعیل شہید کے ساتھ ساتھ ان کے اور سارے رفقاء نامدار کے بھی انفاس بابرکات۔ گویا سپہر جہاد و خدمت دین کے آفتاب و ماہتاب کے جلو میں ستارے اور سیارے بھی ہر طرف سے جھرمٹ کیے ہوئے۔

کم از کم ایک سبق تو کتاب کے مطالعہ سے عالم و عامی، بوڑھے اور جوان، خاص و عام، سب کے لینے کا ہے، اور وہ سبق نظم و اطاعت کا ہے۔ اگر اندرونی نظم درست نہیں، اگر فاروقی شان انتظام و تدبر کی رو جسم میں دوڑی ہوئی نہیں ہے، تو زیادہ سے زیادہ ایثار و اخلاص اور بڑے سے بڑا جوش و ولولہ بھی، اس عالم اسباب میں بیکار و [illegible]

ہے ۔ اگر یہی ایک سبق پڑھنے والے حاصل کرلیں گے تو بہت کچھ حاصل کرلیں گے۔

—— مشک کی مدح و توصیف عطار کی زبان سے، مشک کی قدر و قیمت بڑھاتی نہیں اور گھٹا دیتی ہے۔ عطار ہٹا جاتا ہے، مشک حاضر ہے، بے تکلف مشام جاں معطر فرمائیں ۔

تاریخ نظم اردو[1]

پیش لفظ

بدنفسی کہیے یا بد باطنی، واقعہ یہ ہے کہ کوئی تین سال ہوئے صوبہ کی ہندوستانی اکیڈمی کے اجلاس خاص میں جب ناطق صاحب اپنی نظم سنانے کھڑے ہوتے تو ان سطور کے راقم آثم نے سننا شروع کیا، نکتہ چینی اور عیب جوئی کے کانوں سے لیکن پہلے بند کا پہلا شعر ابھی شاعر کی زبان سے ادا ہوا تھا کہ شکاری خود شکار بن چلا، اور جو اعتراض کی کمینگاہ میں بیٹھا تھا، اعتراف کے میدان میں آنے لگا۔ اور ابھی دو ہی بند پورے ہوئے تھے کہ زبان پر بے اختیار واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے آنے لگے اور جو منتقد تھا اُسے معتقد بنتے بن پڑی جگ بیتی تو خیر نہیں، آپ بیتی یہ تھی۔ اب چاہے اسے کہہ لیجیے شاعری کی ساحری، یا زبان و ادب کی افسوں گری، بہرصورت یہ بھی نطقِ ناطق ہی کی کرامت، کلام ناطق کا اعجاز!

وہی نظم اب مکمل صورت میں آپ کے سامنے ہے، تعارف، حیران ہوں کیونکر کرایا جائے۔ مشک کے تعارف کے لئے خود عطار کا زبان کھولنا، خوشبوئے مشک کی توہین کرنا ہے، چہ جائیکہ اسکی جسارت وہ کرے جو عطار بھی نہیں! ـــــ حسین و جمیل چہرہ کے حسن و جمال کے

---

[1] از حکیم سعید احمد صاحب ناطق، طبع سنہ ۱۹۴۰ء نظر ثانی مارچ ۱۹۴۴ء

ادراک کے لئے ضرورت تو صرف آنکھ کی ہے، زبان ایسے موقع کے لئے بالکل بے زبان! "دیدار" کا کام "گفتار" آخر کیونکر دے سکے ؛ دن کے پھیلے ہوئے اجالے میں یہ کہنا کہ دیکھو آفتاب کیسا روشن ہے، یہ تعارف آفتاب کا نہ ہوا، یہ در پردہ اپنی تعریف ہوئی کہ ہم بھی چشمِ روشن اور آفتاب شناس رکھتے ہیں ؎ مادحِ خورشید مداح خود ست

کیں دو چشم روشن و نامر مدست

ایک گوشہ نشین دیہاتی کے لئے پیش لفظ کا ایما، درحقیقت خود اس کی عزت افزائی ہے کہ تو بھی اس قابل ہے کہ بزم ادب میں در آئے، اور سخن سنجوں کی محفل میں بار پائے۔

اچھا شعر تو وہ ہے جو آفتاب کی روشنی کی طرح خود اپنے کو منوا لے۔ مسدس ناطق کی بسم اللہ سنیئے ؎ گفتگو ناطق یہ ہے آغاز اردو کب ہوا

جستجو یہ ہے کہ ظاہر راز اردو کب ہوا

"زبان" کا مسئلہ، اور اس کا آغاز "گفتگو" سے سبحان اللہ! اور پھر معاً "ناطق" "مومن خاں مرحوم کے مقطعوں کی یاد تازہ ہوگئی" "گفتگو" کے معنی محاورہ میں محض "بات چیت" کے نہیں "سوال" یا "مسئلہ" کے بھی ہیں، اور دوسرے مصرع میں ٹھیک اسی کے وزن و مفہوم کا لفظ "جستجو" "صنعت مناسبت لفظی کو تو لکھنؤ کے چند قافیہ بندوں نے سوء استعمال اور افراط بیجا سے غارت اور بدنام کر دیا، ورنہ اگر اپنے حدود کے اندر اور قرینہ سے رہے اور کلام میں ٹھونس کر نہ لائی جائے، بلکہ بے تکلف آجائے، تو یہ حسنِ انشاء کی جان ہے۔

؎ انجمن میں نغمہ آرا ساز اردو کب ہوا

ساز بزمِ ہند ہمم آواز اردو کب ہوا

وہی توازن جو پہلے شعر میں تھا، اس دوسرے شعر میں بھی موجود۔

؎ ایک ہی دُھن سُنتے سُنتے ہو گئے ہیں کان سُن
دعوئ ایجادِ اُردو کی لگی ہے سب کو دُھن

دُھن، پہلے مصرع میں، بہ اصطلاحِ موسیقی ہے، دوسرے میں اپنے عام معنی میں، اور بات کتنی سچی ہے، تاریخ کی تاریخ، اور شاعری کی شاعری،

اب آگے کہنا یہ ہے کہ جسے دیکھیے، ایجادِ اردو کا سہرا اپنے ہی سر باندھنا چاہتا ہے دہلی والے کہتے ہیں کہ اُردو کی زچہ گیریاں ہم نے گائی ہیں۔ دکن والے بولے کہ پودے کا تخم تو ہماری سرزمین پر پڑا ہے، پنجاب سے آواز آئی کہ یہ دریا ہمارے ہاں سے رواں ہوا ہے۔ بہار نے دعویٰ کیا کہ اِس بہار کے تو سب سے پہلے ہمارے چمن کو کھلایا ہے۔ اب دیکھیے جناب ناطق اس چرمکھ چراغ کو کِس حسنِ ادا سے روشن کرتے ہیں اور شاعری کے دھاگے میں کِس لطافت سے تاریخ کے موتی پروتے جاتے ہیں ؎

دہلوی، بازارِ اردو میں خریدارِ زباں
دکھنی، دربارِ اردو میں گہربارِ زباں

عہدِ محمودی سے ہے پنجاب سرکارِ زباں
بودھ تک پہنچے بہاری لے کے زنارِ زباں

یہ الفاظ لائے ہیں یا ایک ایک مصرع کی انگوٹھی میں نگینہ پر نگینہ جڑتے چلے گئے ہیں! آگے فیصلۂ ناطق ملاحظہ ہو ؎
اِک مؤرخ کیا کہے کب اور کہاں پیدا ہوئی
مُلک میں تاریخ سے پہلے زباں پیدا ہوئی

پوچھنا تاریخ سے پیدائشِ اردو کا حال
کمسنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال

خوب، اور بہت خوب! مدتوں کی جنگ و جدل کا فیصلہ کس طرح آناً فاناً ہو جاتا ہے۔ یک بیک آنکھیں کھل جاتی ہیں، کہ یہ کیسی نادانیاں تھیں! یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے بچے آپس میں الجھتے جھگڑتے، بزرگ خاندان کے پاس آتے ہیں (بزرگ سن و سال ہی کی لحاظ سے نہیں، فہم و دانش کے اعتبار سے بھی) اور وہ چٹکی بجاتے سارے جھگڑے چکا دیتا ہے لیکن ایسا جواب نہ محض شاعر کو سوجھ سکتا ہے، نہ اکیلے مؤرخ کے بس کی بات ہے۔ یہ وہی دے سکتا ہے جو ایک ہی وقت میں شاعر بھی ہو، اور مؤرخ بھی، اور ساتھ ہی نظر فلسفۂ تاریخ اور لسانیات پر بھی رکھتا ہو۔

فرماتے ہیں، کہ بات یہ نہیں، کہ جہاں ادھر کوئی دو قومیں، بخت و اتفاق سے اکٹھی ہو گئیں، اور ادھر دونوں کی زبانوں سے مل جل کر ایک تیسری زبان وجود میں آ گئی، بلکہ تجربۂ تاریخی کا نچوڑ اور حکمت لسانیات کا عطریہ ہے کہ دو قوموں کے جغرافی اتصال کے ساتھ ساتھ ان کا ہم تمدن ہونا اور باہم مناسبت رکھنا بھی شرط ہے۔ جب کہیں جا کر تیسری اور نئی زبان پیدا ہوتی ہے، عجب نہیں کہ اس نظریہ اور کلیہ تک پہنچنے میں حکیم ناطق صاحب نے کام اپنے مدت العمر کے طبی تجربہ سے بھی لیا ہو۔ نر اور مادہ اگر مختلف النوع ہیں، تو ایسے جوڑے کو بار ور ہوتے آج تک کس نے دیکھا ہے؟ بہرحال آگے شعر سنیئے، اور لفظی مناسبتیں جو آ رہی ہیں، ان کا مزہ دل ہی دل میں لیتے جائیے۔

ہند تیرہ سو برس سے مسلموں کا ہے مقام
واعظوں، سوداگروں اور صوفیوں کا ہے قیام

اہلِ ہند، اہلِ عرب ہیں سب کے سب ابنائے سام
ہم نسب، ہم جنس، ہندو کیا کبھی ہوتے نہ رام

شاعری کا لطف اپنے ذوق سلیم پر چھوڑیے، تاریخی اعتبار سے وہ نثر کے حواشی پڑھتے جائیے، جو ہر بند کے مقابل گنجان لکھے ہوئے پورے پورے صفحہ پر شروع سے آخر تک درج ملیں گے۔ پہلے مصرعہ کے حاشیہ میں مسلمانوں کی آمد ورفت ہندوستان میں عہد پہلی صدی ہجری کے ۳۴ھ سے دکھائی گئی ہے اور ۳۴ھ سے لے کر ۸۶ھ تک ۱۲ مسلم فوجوں کے داخلہ ہند کی فہرست دے دی گئی ہے اور تیسرے مصرع پر مصنّف کا حاشیہ ہے کہ:۔

"حام کی نسل سے اہلِ حبش اور ہندوستان کے قدیمی باشندے ہیں، یافث کی اولاد سے ترکی اور منگولین (مغل) اور سام کی نسل سے عرب، آرین، یوروپین اور ایرانی وغیرہ ہیں، لہٰذا ہندوستان کے شرفا اور عربی وایرانی ہم نسب ہیں"۔ (ص ۸)

یہ حاشیہ محض مصنّف کی تحقیق اور نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے نقل کر دیا گیا۔ یہ غرض نہیں کہ تعارف نگار مصنّف کے ایک ایک فقرہ اور لفظ کو آیت وحدیث سمجھ رہا ہے، اچھا تو مصنّف پہلے یہ کلیہ قائم کرتے ہیں کہ

ہوگا جن قوموں کی فطرت میں ازل سے اتحاد
جب کبھی وہ اک جگہ ہو جائیں گی آباد و شاد
دونوں قومیں ہم سخن ہم داستاں ہو جائیں گی
مل کے دونوں کی زبانیں یک زباں ہو جائیں گی

اور پھر ہند و عرب کے قدیم ترین تعلقات کو یوں بیان فرماتے ہیں ؎

میل میں صبح عرب سے کب تھی شام ہند کم
مختلف ہونے پہ بھی ملتے ہیں زلف و رخ بہم

دلربائی کو بتانِ ہند پہنچے تا حرم

ہو گئے تھے ایک مل کر کعبہ و بیت الصنم

تیسرے مصرعہ پر حاشیہ ہے کہ عرب کے بعض بت ہندوستان سے گئے تھے، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

صورت و معنی کی آپس میں ملاقاتیں ہوئیں

پہلے مستعمل ہوئے الفاظ پھر باتیں ہوئیں

فارسی عربی کے اسماء ہند میں داخل ہوئے

اور افعال و مصادر ہند کے شامل ہوئے

اور معاً اردو کی بنیاد پڑ گئی۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس ملاپ کی سب سے پہلی سرزمین، زمین پنجاب تھی ؎

بس کہ قصرِ ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا

اس لئے اردو کا اوّل مستقر پنجاب تھا

لیکن

جیسے خط رُخ کا بڑھے ابرو کی حدوں چھوڑ کر

بڑھ چلا یوں نقش ثانی نقش اوّل چھوڑ کر

تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں

لائے قطب الدین اس کو دہلی شاداب میں

اب دہلی مرکز بنا۔ اور اس مرکز سے، ہر ہر صوبہ میں۔

"ہر سپاہی اپنے ساتھ اردو کا لشکر لے گیا"

"سپاہی" اور "اردو" اور "لشکر" لفظی لطافت کی داد بار بار کہاں تک دی جائے خلاصہ یہ کہ ؎

. . . . نقش یوں بیٹھا ادھر میں تام اردو چل گیا

تھے بہاری نرم دل، خیر اُن پہ قابو چل گیا حد یہ ہے بنگال پر بھی اس کا جادو چل گیا

آج اگر آئی اِدھر تو کل اُدھر چلتی ہوئی
اُف یہ ننھی سی زبان اور اس قدر چلتی ہوئی

مسدس کی لفظی و معنوی خوبیوں کے اندازہ کے لیے اتنے اقتباسات بہت ہیں، ورنہ اب کیا پیشِ لفظ میں ساری کتاب ہی نقل کر دی جائے، گو جی یہی چاہتا ہو۔

شاعری کی ساحری آپ دیکھ چکے۔ اب نثر کی فسوں کاری کا ایک نمونہ دیکھتے چلیے مصنف کو لسانی نکتہ یہ بیان کرنا ہے، کہ ہندو مسلم اختلاط کے بعد جب اسماء عربی و فارسی زبانوں سے ہندوستان میں آنے لگے تو افعال و مصادر کہیں باہر سے نہیں آئے، خاص اِسی سرزمین سے پیدا ہوئے۔ اس مسئلہ کو یوں تشبیہ و تمثیل کی زبان میں بیان کرتے ہیں کہ گویا کسی علمی مسئلہ کی تحقیق نہیں ہو رہی ہے، بلکہ کوئی شفیق، مہربان ماں اپنے بچوں کو لوریاں سناتی جاتی ہے:۔

"ان الفاظ و اسماء نے صرف اپنی ہی ذات کے لئے ہندوستان کو مستقل وطن نہیں بنایا، بلکہ یہاں انھوں نے اپنے بال بچے پیدا کیے، اور اُن کے ہزاروں خاندان ہمیشہ کے لئے اس ملک میں آباد ہو گئے۔ مثلاً تپ (فارسی اور سنسکرت میں بھی گرمی و بخار) ہند میں آئی۔ اس سے "تپنا" مصدر پیدا ہوا، پھر اس کا متعدی تپانا بھی بن گیا، ان دونوں مصدروں کا خاندان یعنی پوری گردان الگ رکھیے۔ "تپ" سے ایک لڑکی پیدا ہوئی "تپک" اس سے "تپاک" عالم وجود میں آیا۔ یا مثلاً "چارہ" ہند میں آ کر متوطن ہوا، یہ پہلے تو عالی خاندان تھا "چارہ ساز" و "چارہ گر" اس کی نسل میں تھے۔ مگر چھوٹی قوموں کی صحبت میں چارہ

جانوروں کی غذاؤں میں شامل ہوا، یہاں تک کہ چروا ہے اور چھپر کھٹ
پیدا ہونے لگے۔ بہت سے ایرانی النسل اور عربی النسب الفاظ و
اسماء نے ہندی بیچاروں سے بھائی چارہ پیدا کر لیا، اور ایسا میل جول
بڑھا لیا کہ دونوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا محال ہو گیا ہے جیسے "بیلدار"
"پچیکار" "سمجھدار" "سرجوڑ" "منہ زور" وغیرہ۔ ایک قسم ایسے الفاظ
کی ہے، جن کی صورت ویسی ہی رہی، مگر سیرت بدل گئی، جیسے۔ "مشکور"
"جذبات" "شائق" "محرم" وغیرہ (صفحہ ۱۷-۱۸)

اندازہ کے لئے ایک نمونہ بالکل کافی ہے۔ مزید اقتباسات سے معاف رکھا جائے، اس لئے
کہ تمہید کے حجم کو تصنیف کے مساوی بنانا ہرگز مقصود نہیں۔

البتہ بڑی ناانصافی ہوگی، اگر اصل تصنیف کے متن و حواشی (نظم و نثر) کے ساتھ فاضل
مصنف کے مبسوط مقدمہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ اکثر اہل قلم اپنا سارا زور اصل تصنیف پر صرف
کر دیتے ہیں، اور چند سطریں چلتی ہوئی، مقدمہ کے نام سے لکھ، اس پر کسی طرح چیپک دیتے
ہیں۔ یہاں یہ صورت نہیں، مقدمہ خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت و اہمیت رکھتا ہے۔ اور
جو جو مسائل زبان، ادب اور شاعری کے اس کے اندر آ گئے ہیں، ان کے لحاظ سے اوّل سے
آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔

اردو غزل پر یہ اعتراض آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ "آخر اسمیں حزن و غم کے
مضامین لانے کی کیا ضرورت ہے اسے تو شگفتہ ہونا چاہیئے۔ جواب حضرت ناطق کی زبان سے
سنیئے، اور جواب کے بانکپن کی داد، دل اور زبان دونوں سے دیتے جایئے:۔

"یہ ایسی ہی بات ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ نوحہ و مرثیہ میں غم و ماتم کی

کیا شرط ہے۔ غزل کے معنی ہی یہی ہیں کہ " با معشوق سخن گفتن و درد دل را نظم کردن " اس کے خلاف وہی شخص ہو سکتا ہے جو لفظ کے معنی بدل دینے کی قدرت رکھتا ہو، اور اپنی عقلمندی سے یہ اُمید رکھتا ہو کہ اور لوگ اس کی تقلید کریں گے۔ اب رہا یہ امر کہ غزل کے ہر شعر میں اظہار غم و تمنائے مرگ بے شک مذموم ہے مگر غم سے کنارہ کشی اسی کا کام ہے، جو اپنی اصل حقیقت سے بے خبر ہے، عشق مجازی میں اظہارِ عشق عیب ہے، سوا اس کے کہ معشوق طوائف ہو یا یورپین ان دونوں مقامات پر نہ اظہارِ عشق عیب ہے، نہ دیر ہوتی ہے اور جب اظہار محبت فوراً ہو جائے تو جذبات کی دُنیا میں آبادی بڑھنے نہیں پاتی، نہ غم کی حرارت دِل کو پگھلا کر مرکز غم بناتی ہے۔ عشق میں ایک مدت گزرتی ہے، تو پیمانۂ صبر چھلکتا ہے اور جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں کا نظم کرنا اور ایک ہی بحر و قافیہ میں محدود رکھنا غزل ہے۔"

اُردو ادب کی ہر تاریخ میں ایک لازمی بحث اس کی آئے گی کہ اُردو شعر و ادب کی ترقی میں دکن کا کیا مقام ہے، مصنف نے اس مبحث کو جس عنوان سے چھیڑا ہے، اس کے آغاز ہی سے اس کے انجام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

"کسی علم و فن کی وسعت اور چیز ہے، ترقی دوسری شے ہے۔ دکن میں اُردو کی توسیع تو اظہر من الشمس ہے، مگر ترقی کے مدارج اس طرح معلوم ہونگے کہ ہر ربع صدی کے شعرا کا تقابل کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ تدریجاً کتنے " غیر ملکی قدیم " اور نامانوس و غیر فصیح الفاظ نکال کے اُن کی جگہ پر اُردو الفاظ لائے گئے، کتنے الفاظ صرفی تبدیلی کر کے

فصیح بنائے گئے اور جس قدر زمانہ گذرتا گیا، اسی قدر زبان صاف ہوتی گئی؟ ان اصلاحات کی رفتار بالکل سست رہی سب ایک ہی لکیر کے فقیر ہے؟ ان لسانی اور صرفی و نحوی اصلاحوں کے علاوہ معانی و بیان میں ارتقا کے منازل برابر طے ہوتے رہے یا نہیں؟ مثلاً حقیقت کا نقش ثانی مجاز ہے تشبیہ کا دوسرا زینہ استعارہ ہے، صراحت کا لطیف جوہر، کنایہ ہے، سادگی کے اسباب زینت، صنائع و بدائع ہیں انہیں مدارج کے طے کرنے کا نام تکمیل ادبی ہے، میں ہر زمانہ کے اشعار پیش کرتا ہوں اور مختصر شرح و تبصرہ بھی کئے دیتا ہوں، ناظرین خود ہی ترقی و تنزل کا اندازہ کرلیں گے"۔

اس کے آگے یہ مختصر شرح بیسیوں صفحات تک پھیلتی چلی گئی ہے، اور دکھنی شعرا کے کلام پر تبصرہ کے ساتھ ہی ساتھ زبان، ادب، عروض کے خدا معلوم کتنے مکتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی گئی ہے!

کوئی بشری تحقیق، لغزش و خطا سے محفوظ نہیں ہوسکتی لیکن بحیثیت مجموعی یہ عرض کردینا مبالغہ شاعرانہ سے پاک ہے کہ مسائل فن اور حسن بیان کی جامعیت کے لحاظ سے اردو میں کوئی دوسری کتاب اس موضوع پر اس تمہید نگار کے علم میں نہیں - اور اگر کالجوں کے اعلےٰ اردو نصاب میں اسے جگہ ملجائے تو محض طلبہ کی نہیں اکثر اساتذہ کی بھی خوش نصیبی ہوگی!

مسلمان اور آزادی کی جنگ[1]

تقریب

مضامین اور مقالات، چھوٹے بڑے رسالوں کو چھوڑئیے، ایک مستقل ضخیم کتاب ہسٹری آف دی کانگریس" کے نام سے کانگریس کی طرف سے انگریزی میں شائع ہو چکی ہے — نام اس "ہسٹری آف دی کانگریس" کا اگر "ہسٹری آف ہندو نیشنلزم" ہوتا، تو یقیناً صحت سے قریب تر ہوتا — ہند قدیم کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے، کہ اس کی تاریخ پر افسانوں کا گمان ہو ہند جدید کی خصوصیت شاید یہ ٹھہرے، کہ اس کے افسانوں کے لئے تاریخ کا عنوان ہو!

ذہن میں کسی پرانے زمانہ کی فوج کے کوچ کا نقشہ جمائیے۔ آگے آگے سپہ سالار ہیں، پھر ترتیب وار رسالہ دار ہیں، جمعدار ہیں، کمیدان ہیں، عام سپاہی ہیں، اور ساری فوج کے گذر جانے کے بعد، اس کے عقب میں شاگرد پیشہ، کچھ مزدور، حمال، کچھ بہشتی سقے کچھ باورچی لکاول، کچھ نائی دھوبی وغیرہ، یہاں بھی آزادیٔ وطن کی فوج ظفر موج کے اس مرقع میں آگے آگے فیلڈ مارشل گاندھی ہیں اور جنرل تلک، کرنل نہرو اور میجر پٹیل، کیپٹن داس اور لفٹننٹ بوس، زرق برق وردیوں کے ساتھ، پرچم لہرائے، تلواریں چمکاتے اور آخر میں، بہت آخر میں، دبلے دبائے، کچھ شرمائے لجائے سے محمد علی اور انصاری، اجمل خاں

---

[1] از عبدالوحید خاں صاحب بی اے ایل ایل بی لاٹوش روڈ لکھنؤ تحریر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء نظرثانی اپریل ۱۹۴۴ء

اور ابوالکلام، گویا میدان میں اپنے پیروں آ نہیں رہے ہیں، یہ کہیئے کہ لائے جا رہے ہیں! اور حسرت غریب کی تو سرے سے پرسش ہی نہیں! حالانکہ وہ بیچارہ جیل اُسوقت گیا تھا، جب جیل تفریح گاہ نہیں، واقعی "قیدِ فرنگ" تھی، اور اُس نے قیدِ بامشقت کی کڑیاں اسوقت جھیلی تھیں، جب جیل کے اندر قیدیوں پر برقندازوں کے ڈنڈے برستے تھے، اور جیل کے باہر، پھولوں کے ہار گلے میں نہیں ڈالے جاتے تھے، بلکہ اپنی ہی قوم طنز اور طعن سے کلیجہ چھلنی کر دیتی تھی!

ہندوستان سے ہزار ہا میل دور، انگلستان میں مستند اور ضخیم انسائکلوپیڈیا برٹانیکا تیار ہوتی ہے، جامعیت اور تحقیق کے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ۔ آخری (چودھویں) ایڈیشن کا جائزہ لے ڈالیئے، ہندو لیڈروں میں، صفِ اوّل ہی کے نہیں، صفِ دوم کے ایک ایک لیڈر کا ذکر پڑھ لیجیے۔ ضمناً نہیں، اکثر صورتوں میں مستقل آرٹیکل کے تحت۔ لیکن آپ کے محمد علیؒ کا تمغۂ افتخار، گمنامی، اور آپ کے محمود حسنؒ کا نشانِ امتیاز، بے نشانی! — یہ ہے اس دور میں پروپیگنڈا کی سحر کاری!

اللہ اللہ! یہ کمالِ اخلاص! قبولِ خلق سے یہ استغنا! "طمعِ فاتحہ" سے یہ بے نیازی!

عشقِ من در پئے من فاتحہ خوانم باقی ست

وقت کی پکار، مسلمانوں سے، مدت سے تھی، کہ

کچھ تو کہیئے کہ لوگ کہتے ہیں!
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

اور حالات کا تقاضا تھا، کہ مسلمان، انگریزی میں نہ سہی، کم از کم، اردو ہی میں،

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں!

کا ثبوت دیں۔

آواز آخر کار ایک نوجوان گریجویٹ کے کان میں پڑی۔ قلم کی مشاقی اسے نہیں حاصل نہ سہی فرض کا احساس، انتظار کی مہلت کہاں دیتا ہے۔ جیسی کچھ بھی بن پڑی جنگ آزادی وطن میں مسلمانوں کی شرکت کی روداد لکھ ڈالی ـــ "فرض کفایہ" اصطلاح فقہ میں اُسے کہتے ہیں کہ اگر ایک ادا کر دے، تو سب کی طرف سے ادا ہو جاتے، اور کوئی نہ ادا کرے تو سب کے سب مجرم ـــ سیاسیات و قومیات میں جو یہ فرض سب کی طرف سے اُتار دے اُس کا کیا کہنا۔ اس کی سعی قابلِ مبارکباد، اُس کی ہمت مستحق داد۔

مصنف کا قلم "آزادی کی جنگ" کا سرسری نقشہ اس سے قبل کھینچ چکا ہے۔ نقش ثانی یوں بھی نقش اول سے بہتر ہوتا ہے۔ پھر جب اُس کا پشت پناہ مزید علم ہو، مزید تجربہ ہو، مزید مطالعہ ہو!

کتاب کا مسودہ پریس میں پہنچ چکا تھا، جب جاکر اُس پر نظر کرنے کا موقع ملا، اور وہ بھی صرف جا بجا سے۔ ضرور نہیں کہ تائید ہر بیان کی، اور تحسین ہر عنوان کی کی جائے۔ صفحہ ۱۶۵ و ۱۶۶ جہاں بزرگوں کی طرف سے حق وکالت ادا کیا گیا ہے، اُس پر ساڑھے تیرہ سو برس والا اسلام حیران ہے کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے؟ لیکن بہر حال ایسے نشیب و فراز سے تو بڑے بڑے پختہ کار اہل قلم بھی نہیں بچ پائے، ضرورت اس کی ہے کہ ہونہار مصنف کی حوصلہ افزائی دل کھول کر کی جائے، اور اُن کی کوششوں کا یہ ثمر گھر گھر پھیلا یا جائے!

نواب جمیل الشانؒ[۱]

دیباچہ

دُنیا نے نصیحت کو نصیحت کی راہ سے شاید کبھی سُنا ہی نہیں۔ یہ کڑین جب جب حلق سے اُتاری گئی ہے تو شکر کی تہ یا مصری کے غلاف میں لپیٹ لپیٹ کر۔ اچھے اچھے اطبا۔ حاذقین اور بڑے بڑے جید معالجین سب کو یہی کرنا پڑتا ہے۔ مثنوی معنوی کی حکائتیں، منطق الطیر کی روائتیں، گلستان کی کہانیاں، اور بوستان کے قصّے سب اسی کے نمونے گذرے ہیں، سنائیؒ اور عطارؒ، رومیؒ اور سعدیؒ سب کو عمل اسی پر کرنا پڑا ہے کہ "سرِ دلبراں" کے لئے.. حدیث دیگراں" اختیار کی جائے اور سے

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

خود عارفانہ شاعری کیا ہے، اوّل سے لے کر آخر تک مجازِ بیان کا طلسم! حافظؒ اور خسروؒ اور مغربیؒ اور عراقیؒ جس کسی کے بھی آستانہ پر جائیے، بادۂ عرفان و معرفت چھلکتا ہوا ملے گا تو اسی مجاز و استعارہ کے جام و ساغر میں اور حقیقت کی جھلک نظر آئے گی، تو انہیں شیشوں اور آئینوں کی وساطت سے!

---

[۱] از عبدالرؤف عباسی صاحب ایڈیٹر روزنامہ حق (لکھنؤ)
تحریر مئی ۱۹۴۳ء۔ نظرِ ثانی اپریل ۱۹۴۴ء

یہ بیسویں صدی کا زمانہ، عشق و فسق کا زمانہ، کھیل تماشہ کا زمانہ، ناول اور ڈرامہ کا زمانہ، تھیٹر اور سینما کا زمانہ ہے، رندوں کی محفل میں شیخ غریب کا کہیں گذر ہو جائے تو دستار بھی سلامت نہ رہنے پائے، یہاں تو حکمت یہی ہے کہ خود بھی مستوں کے سے نعرے لگائیے خود بھی جام اور گلاس ہاتھ میں لیجئے، پیجئے اور پلائیے۔ ظرف وہی کا ہے، شیشہ و پیمانہ میں کوئی فرق نہ آئے پائے، البتہ حلق کے نیچے جس چیز کے گھونٹ اتریں وہ شراب طہور ہو نہ کہ افشردۂ انگور۔

جمیل الشان کے خوش نصیب مصنف نے اس نکتہ کو پالیا۔ جمیل الشان کہنے کو ایک ناول ہے، اور کہنے کو کیا معنے، واقع میں ناول ہی ہے۔ حسن و عشق کا قصہ، ایک بیسوا سے عاشقی، باہمی رقابتیں، پولیس والوں کی گھاتیں، شاطروں کی چالیں، ہجر کی بے تابیاں، مصلحوں کی کارستانیاں، بگڑے ہوئے نوابی کارخانے، شاہی خاندان کی آن بان، غرض ناول کی دلچسپی کے جتنے سامان ہوتے ہیں، سبھی اکٹھے ہیں۔ پھر زبان و حسن بیان، سبحان اللہ، جہاں لکھنؤ کی زبان دکھائی ہے، وہاں خالص لکھنوی، جہاں بدایوں کی بولی بول چلے ہیں، وہاں پورے بدایونی۔ حیرت اس پر ہونے کو تھی کہ کاکوروی کو لکھنؤ کی زبان پر اتنی قدرت حاصل کیونکر ہو گئی، کہ معاً یاد پڑ گیا کہ سجاد حسین (اودھ پنچ والے) اور مولوی حاجی نور الحسن (نور اللغات والے) اور ڈپٹی امیر احمد علوی آخر کس خطہ کے رہنے والے ہیں۔

پلاٹ اتنا دلچسپ کہ ایک واقعہ شروع کر دینے کے بعد بغیر ختم کئے رکنا دشوار۔ قصہ کے افراد مردہ اور مفروضہ نہیں، جیتے جاگتے، حقیقی، واقعی زندوں سے بڑھ کر زندہ۔ بار بار دھوکا یہ ہوتا ہے کہ لکھی ہوئی کتاب کے اوراق سامنے نہیں، بلکہ اصل قصہ ان آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا گذر رہا ہے! فن (آرٹ) کے لحاظ سے طبیعت دو ایک مقام پر ذرا رکی بھی، لیکن قصہ کی دلآویزی اتنی بڑھی ہوئی کہ پڑھنے والے کو رکنے اور غور و تامل کرنے کی مہلت ہی

کب ملتی ہے ؟

آخر تک پہنچتے پہنچتے بدکاری و ہوسناکی کی بدانجامی، اور نیکی و پارسائی کی فتح، از خود بغیر بتلائے اور سمجھائے آئینہ ہو جاتی ہے، اور مصنف کے حق میں دل سے دعائیں نکلنے لگتی ہیں۔ مصاحبوں اور خصوصاً میر صاحب عینک فروش کا چربہ خوب اتارا گیا ہے، اور نواب جمیل الشان، خان بہادر میراں بخش بدایونی، اور نواب بنیاد حسین، تینوں کی تصویریں اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ صرف ہیروئن کی تصویر کشی میں کہیں کہیں مبالغہ کا قلم چل گیا ہے۔ آخر کتاب میں جو دو خطوط اس کی طرف سے لکھے ہیں، وہ ساری کتاب کا نچوڑ ہیں، حد درجہ موثر اور بلندی خیالات کے لحاظ سے لاجواب۔ کتاب بھر میں یہی دو خط ہوتے اور کچھ نہ ہوتا، جب بھی بہت کچھ تھا۔ اب دعا صرف اتنی ہے کہ حسن قبول تصنیف اور مصنف دونوں کو نصیب ہو — کتاب کو خلق میں اور کتاب نویس کو خالق کے ہاں!

مُداوا[1]

پیش لفظ

ترقی تو ادب میں ہونی ہی تھی، اور حرکت جب ہر چیز میں ہے، تو ظاہر ہے کہ شاعری کیسے ساکن وجامد رہ سکتی تھی، لیکن بے راہ روی کا نام ترقی رکھ دینا، اور بے قیدی کو آزادی سے تعبیر کرنے لگنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے جسم پر آماس ہو آئے، اور ہم اسے دیکھ کر کہیں کہ دیکھو یہ کیسا موٹا تازہ، تیار و تنومند ہے — اُونٹ جیسا حلیم و شائستہ جانور بھی جب شتر بے مہار بن جاتا ہے تو اس کے شتر غمزوں سے خدا کی پناہ!

پُرانی شاعری اور پُرانا ادب کوئی وحیِ آسمانی نہیں، کہ اس کا کوئی نقطہ نہ بدل سکے، کوئی شوشہ نہ ٹل سکے۔ خیالات بدلیں گے۔ اسلوب بیان بدلیں گے، اور بدلتے رہتے ہیں۔ وؔلی کی شاعری غالب کی شاعری نہیں، اور فسانۂ عجائب کی زبان امراؤ جان کی زبان نہیں، چراغ سے چراغ جلتا ہی آتا ہے، اور شاخ سے شاخ پھوٹتی ہی رہتی ہے۔ بچہ جوان ہوتا ہے، اور جوان بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے، قدرت کا دستور ہی یہ ہے، لیکن کوئی زبردستی کھینچ تان کر اگر بچہ کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنانے لگے، تو یہ ارتقاءِ طبعی نہوا۔ یہ فطرت سے کشتی اور زور آزمائی ہوئی، جدت اگر محض جدت کی خاطر ہے، تو اس کا نام ندرت نہیں بدعت ہے، شگفتگی

---

[1] کتاب مُداوا مولفہ غلام احمد صاحب فرقتؔ بی۔اے کاکوروی، طبع اوّل

نہیں غرابت ہے۔

"ترقی پسند" ادیبوں کی فہرست میں نام منشی پریم چند آنجہانی اور قاضی عبد الغفار صاحب (مدیر "پیام" دکن)، اور یہاں تک کہ بابائے اردو" ڈاکٹر عبد الحق کے بھی لئے گئے ہیں۔ اگر ترقی پسندی کا یہی معیار ہے تو پھر ہم سب ترقی پسند ہی ہیں اور اس ترقی پسندی سے انکار کس کافر کو ہو سکتا ہے؛ لیکن کاش اس دعویٰ میں خلوص ہوتا! دریا کے مقابلہ میں چند قطرے خرمن کے سامنے چند دانے ہستی ہی کیا رکھتے ہیں: "ترقی پسند" ادب کے نام سے جو سیلاب عظیم نثر و نظم دونوں میں بد مذاقیوں، عریانیوں اور گندہ بیانیوں کا چل پڑا ہے، اس نے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پرانے ادب کے بڑے سے بڑے فحش نویس اور بڑے سے بڑے ہزل گو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، اور نام از سرِ نو جان صاحب کا، بلکہ بعض حیثیتوں سے میاں چرکین کا چمکا دیا ہے! انا للہ ——— بد عقیدگی اور اخلاقی بے ہودگی کو چھوڑیئے آخر مذاق سلیم اور تمیز داری بھی تو دنیائے ادب میں ایک چیز ہے۔ ان ظالم لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کے صفحات میں تو آنکھیں اس کو بھی ترستی رہ جاتی ہیں ؂

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت اگر ملے

جی خوش ہوا کہ ملک میں اس طوفان بے تمیزی (طوفان کو آپ مجاز کہہ لیجئے لیکن بے تمیزی کو حقیقت کے بجائے مجاز سمجھنا ظلم ہوگا) کے خلاف تحریک پیدا ہوئی ہے، اور جا بجا مزاحی اور سنجیدہ دونوں رنگ میں کوششیں رد و اصلاح کی شروع ہو گئی ہیں۔ انہیں کوششوں کی ایک عملی شکل یہ پیش نظر کتاب بھی ہے۔ کاکوری کے جواں عمر و جواں ہمت فرفتی بی۔ اے، کے قلم سے اس کے مسودہ کے دو چار صفحے مجھے بھی دکھلائے گئے

یقین ہے کہ ساری کتاب اسی طرز و انداز کی ہو گی! الکھنو ، زبان و ادب کی خدمت و اصلاح کے سلسلہ میں ممتاز شروع سے چلا آرہا ہے، حق تھا کہ ایسی اصلاحی کتاب کی اشاعت بھی یہیں کی کسی اشاعت گاہ سے ہو۔

---

(٣)

چند تبصرے

مرزا بلگرامی[1]

مغرب کی عقل و ذہانت کا منتہائے کمال یہ ہے، کہ ہر جھوٹ کو سچ کے لباس میں پیش کیا جائے، مشرق کی نازک خیالیوں کی بلند پروازی یہ تھی کہ سچائیوں کو جھوٹ کے پردہ میں بیان کیا جائے۔ لندن کی وقائع نگاری کا ظاہر سچ ہے، اور باطن فریب، دہلی کی داستان گوئی کا باطن سچ تھا، اور ظاہر تصنع۔ ٹائمس اور مارننگ پوسٹ ہزیمت کو ہمت کر دکھانے ہر رسی کو سانپ بنا دینے میں طاق ہیں۔ الف لیلہ اور انوار سہیلی والے حقیقتوں میں افسانہ کا رنگ بھر دینے میں یکتا تھے۔ ڈلہاؤسی اور مارگولیتھ، تاریخ اور سیرت نگاری کا نام لے لے کر وہ سارے "واقعات" لکھ ڈالتے ہیں، جن کا "وقوع" نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، اور نہ کبھی کان نے سنا تھا۔ خواجہ حافظؒ اور امیر خسروؒ شاعری کی دنیا میں، گل و بلبل کی زبان سے شراب و کباب کی اصطلاحوں میں حکمت و موعظت، سچائیوں اور حقیقتوں کا دریا بہا جاتے ہیں! اپنا اپنا مذاق ہے، اور اپنا اپنا کمال فن۔ اب اس کا فیصلہ کون کرے، اور کیوں کرنے لگے، کہ دونوں کی افسانہ گوئی میں بلند تر کمال اور پاکیزہ تر مذاق کس کا ہے!

افسانہ گوئی کی تعریف، مشرق میں یہی سمجھی گئی، کہ ظاہر جھوٹ ہو اور باطن سچ۔ اسم فرضی ہو، لیکن مسمّٰی واقعی۔ گلاس شراب کے ہوں، لیکن گلاس کے اندر بجائے شیرۂ انگور

---

[1] رسالہ الناظر (لکھنؤ) ۱۹۳۰ء

کے آبِ انار! زبانِ "دشنہ و خنجر" کے تلفظ پر کھلے، لیکن دلِ ناز و غمزہ کے معنی میں لگا رہے! گلستان کی حکایتوں کی "تاریخی" تحقیقات کرنے بیٹھیے اور اس کھوج میں پڑ جایئے، کہ فلاں حکایت میں جس بادشاہ کا ذکر ہے، وہ کس ملک کا تھا، کس سنہ میں تخت نشین ہوا، کس تاریخ کو وفات پائی، کے شادیاں کیں، کتنی اولاد چھوڑی، تو شاید ایک حکایت بھی سچی نہ نکلے، لیکن اگر پوست کو چھوڑ کر مغز کو دیکھیے، نقاب کے رنگ میں الجھنے کے بجائے چہرہ کے خط و خال پر نظر جمایئے، تو ایک ایک لفظ، سچ اور سچائی میں ڈوبا ہوا ملے گا۔ صاحب مثنوی معنوی رح نے نہ صرف اس علم پر عمل کر کے دکھادیا، بلکہ اس کا فلسفہ بھی بیان فرمادیا کہ سترِ دلبراں کچھ "حدیثِ دیگراں" ہی میں خوش تر و خوشگوار تر ہوتا ہے! اور استاد غالب اپنی زبان میں فرماتے ہیں۔ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سنتے ہیں، قدیم صوفیہ میں ایک فرقہ "ملامتیہ" تھا۔ ظاہر خراب اور باطن آراستہ، وضع رندانہ اور صورت مستانہ، لیکن اعمال زاہدانہ اور سیرت فقیرانہ۔ آج کل کے بعض مسخروں پر ان قدیم ملامتیوں کو قیاس نہ کیجیے۔ یہ نیا سوانگ، طریقِ ملامت کے ساتھ تمسخر ہے۔

...ان ملامتیوں میں

میں سے ایک ایک

تھا دلی پوشیدہ اور کافر کھلا

"علیگڈھ" بھی ایک چھوٹے پیمانہ پر "عالم صغیر" ہے، یعنی "عالم کبیر" میں جو کچھ بھی ہے، سب کا نمونہ سید کی بسائی ہوئی اس نگری کے اندر موجود۔ کم از کم عالم اسلام کا تو اسے ایک زندہ عجائب خانہ

(میوزیم) سمجھ لیجئے۔ ہر نوع، ہر قماش، ہر نمونہ انسانیت کو اس ننھی سی دُنیا کے اندر آکر دیکھ لیجئے۔ کیسے ممکن تھا، کہ طریق ملامتیہ کے نمائندوں سے سرزمین محروم رہتی!

آئیے، آج آپ سے بیسویں صدی کے ایک "اپ ٹوڈیٹ" (Up To date) علیگڈھی ملامتی کا تعارف کرایا جائے۔ ظفر عمر کا نام آپ نے سنا ہے؟ اسی نیچر گڈھ کا اولڈ بوائے، اور نیکنام "سرکار کے نیک نام ترین" محکمہ پولیس کا ایک اعلیٰ افسر، اپنی وضع قوم کی وضع سے الگ، اس کی کوٹھی مسجد کے حجروں سے دُور، اس کی کچہری، خانقاہ کے ہو حق اور ملاؤں کے قال اقوال سے کہیں پرے۔ لیکن خود قوم وملت، خانقاہ و مسجد، اس کے دل سے دُور نہیں دل کے باہر بھی نہیں، دل کے اندر! خاکی وردی اور کارتوس کی پیٹی، سفید ہلمٹ اور کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار، سب نے دیکھی۔ لیکن "رنگ جامہ" سے نگاہ ہٹاکر اندازِ قد بھی کسی نے نہ پہچانا؟ نقاب اُلٹ کر، چہرہ کے رنگ رُوپ کو بھی کسی نے دیکھا؟ اور اگر کسی نے دیکھا ہو بھی تو زبان پر لانے کی اجازت کسے؟ —— اس ناتمام داستان کو یہیں تمام ہوجانے دیجئے —— مستقبل اسلام اور چوروں کا کلب، نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری سے تو یقین ہے کہ آپ بھی بے خبر نہ ہوں گے! "نیلی چھتری" کا وجود، افسانہ ہو گا۔ لیکن جس افسانہ کا نام نیلی چھتری ہے، وہ تو افسانہ نہ رہا، ایک مستقل حقیقت بن گیا! جس مٹی اور پتھر کے کھنڈر کا نام نیلی چھتری ہے، وہاں کوئی خزانہ مدفون ہو یا نہ ہو، لیکن جو نیلی چھتری، کاغذ اور قلم اور روشنائی کی مدد سے تیار ہوئی، وہ تو یقیناً اپنے ہمراہ دولت لے کر آئی۔ اور بہرام اور مسعود اب نرے متخیلہ کے بے جان مخلوق نہ رہے، بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے، راجہ اندر اور تاج الملوک، لال دیو، اور سبز پری، امیر حمزہ اور عمر عیار کی طرح، اچھے خاصے، گوشت و پوست کے بنے ہوئے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، جانے پہچانے

ہوئے جاندار انسان بن گئے۔

ناول پڑھنے کی اب نہ فرصت نہ ضرورت، نہ شوق نہ ہمت، خود اپنے افسانۂ حیات کے مطالعہ اور حسرتِ مطالعہ سے کہاں مہلت، اور کسے دماغ کہ گڑھی ہوئی کہانیوں اور جھوٹے قصوں کے سیر و تماشہ کا وقت نکالا جائے۔ اور خود اپنی ہستی کی ٹریجڈی کیا کم ہے، کہ قیس کی نامرادیوں اور فرہاد کی حسرت نصیبیوں کا رونا بیٹھ کر رویا جائے؟ اکبر علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں

عبرت زدہ را کار بہ آز ردگاں نیست

ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ عرصہ ہوا چھوٹ چکا۔ شرر و سرشار، جارج ایلیٹ اور میری کوریلی کی گلکاریوں سے دل بہلاؤ کا مشغلہ عرصہ ہوا ختم ہو گیا ؎

ماخانہ رسیدگان ظلیم   پیغام خوش از دیار مانیست

لیکن ایک معتبر و ثقہ دوست نے ہاتفِ غیب کی طرح آ کر، سرگوشی کی، کہ نیلی چھتری کے مصنف کے مالک کی ہمت اب اور بڑھی ہے، اور اب کی اس نے علاقہ مالوہ کے لال کشور کی "چھپن کروڑ" کی دولت پر دھاوا بول دیا ہے! جی نہ مانا، توبہ ٹوٹی، اور جس روز نامی پریس، لکھنؤ سے دو سو ادو سو صفحہ کی چھوٹی سی خوبصورت و خوشنما کتاب کا پارسل آیا، اسی وقت شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ لال کشور! آپ چونکیں گے، اور منہ بنا کر فرمائیں گے، کہ نام تو عجب قسم کا نامانوس اور غیر شاعرانہ ہے۔ بجا ارشاد ہوا۔ لیکن یہ تو فرمائیے، کہ آج سے چند سال قبل نیلی چھتری کا نام کچھ کم نامانوس اور کچھ کم عجیب و غریب تھا؟ اور پھر عمرو عیار کی زنبیل اور دیوار قہقہہ، اور چشمۂ آب حیواں اور گل بکاؤلی کو آپ کیوں بھولے جاتے ہیں؟ کیا ان ناموں سے دنیا روزِ ازل ہی سے مانوس چلی آ رہی ہے؟

نیلی چھتری اگر آپ پڑھ چکے ہیں، اور بہرام و مسعود کے کارناموں سے واقف ہو چکے ہیں، تو اس جدید داستان کو آسانی سے سمجھ لیں گے۔ بہرام اب مشہور و معروف مجرم نہیں، بلکہ علیگڈھ کے مشہور "کھلنڈرے" مسعود کے ہمراہ، اب مہراب جنگ کے نام سے دہلی میں ایک باعزت شہری کی حیثیت سے سکونت پذیر ہو گیا ہے ــــ یہ راز نہیں کھلتا، کہ اس کی سکونت کے لئے مصنف نے بجائے دہلی کے مشہور و معروف محلہ کوچۂ چیلان کے ایک دوسرے مشہور محلہ، بلیماران کا انتخاب کیوں کیا ــــ اب وہ خلق خدا کا دشمن نہیں، بلکہ اس کا ایک مخلص خادم ہے، اور اب اس کی حیرت انگیز ریا بہ زبان اخبارات پنجاب "سنسنی خیز") ذہانت، جرم کرنے کے بجائے، مجرموں کو سزا دینے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے وقف ہے اس کی مختصر ٹکڑی کا نام "خدائی فوجداروں" کی جماعت پڑ گیا ہے، اور اس کی بے جگری، جانبازی و سرفروشی سے بڑے بڑے پرانے اور بیباک مجرم تھرانے اور پناہ مانگنے لگے ہیں۔ مہراب جنگ کے خاص ملنے والوں میں قابلِ ذکر نام ڈاکٹر رحمن اور انسپکٹر وخار حسین کے ہیں ــــ لال تھورا اگر نامانوس نام تھا، تو یہ نام تو یقیناً آپ کے لئے نامانوس نہ ہونے چاہیئے ــــ

اِن "خدائی فوجداروں" کے ٹھیک مقابل اسی شہر دہلی میں چھپے ہوئے بدمعاشوں اور انتہا درجہ کے چالاک اور بے درد مجرموں کا بھی ایک نہایت مضبوط جتھا قائم ہے، جس کے سرغنہ و سردار دہلی کے ایک مشہور گیسو دراز "اشتہاری صوفی" (صفحہ ۱۱۴ وصفحہ ۱۴۹ وصفحہ ۲۳۵) مرزا بگرامی ہیں، جن کی قلمی تصویر کو دیکھ دیکھ بے اختیار یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

اے کہ با سلسلۂ زلف دراز آمدہ
چشم بد دور کہ خوش شعبدہ باز آمدہ

خدائی فوجداروں کا جو "خلق اللہ" کی حفاظت کرتے رہتے ہیں، اور ایسے بدمعاشوں کو جنہیں

پولیس بھی اُنکے کیفر کردار کو نہیں پہنچا سکتی خود ہی معقول سزا بھی دے دیتے ہیں" (ص۱۷)
مقابلہ انہیں بزرگوار سے آپڑتا ہے اور ساری کتاب نور و ظلمت، جرم و تعزیر جرم کی
کشمکش کی نذر ہے۔ کتاب کے مرقع میں سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ سبق آموز
تصویر مرزا بلگرامی کی ہے۔ اُن کی تفصیلی زیارت اور اُن کے ہتھکنڈوں سے پوری واقفیت
کا اگر شوق ہو، تو ڈیڑھ روپیہ میں کتاب، نامی پریس، لکھنؤ سے حاصل کیجیے۔ لیکن "مرزا" کی
اجمالی شکل و صورت، اور اس قابلِ زیارت چہرہ کے نمایاں خط و خال اگر آپ اس ریویو
کے آئینہ ہی میں دیکھ لینا چاہتے ہیں، تو بس اتنا سمجھ لیجیے کہ مرزا بلگرامی صاحب کوئی
خدانخواستہ معمولی اور ادنےٰ قسم کے مجرم نہیں، جن سے ملتے ہوئے آپ کترائیں۔ کیا عجب
کہ اُن سے نیاز حاصل ہوجانا آپ اپنے لئے باعثِ شرف و عزت خیال فرمائیں، یہ ذات
شریف مریدوں کی ایک بڑی جماعت کے پیر و مرشد ہیں، اپنے بعض مریدوں اور معتقدوں
کی جاں نثاری پر بجا طور پر فخر رکھتے ہیں۔ ایک زنانہ اسکول کھول رکھا ہے، بہت سے رسالوں
کے مالک ہیں، پریس ہے، کتابوں کا کاروبار ہے۔ دفتر عین شہر دہلی کے وسط میں ہے۔
لیکن یہ حضرت رہتے دہلی کے قریب ہی کسی ایسے مقام پر ہیں، جہاں ایک مشہور درگاہ واقع
ہے (ص۱۶) دفتر اور دفتر کی عالی شان عمارت دہلی بھر میں مشہور ہے (ص۲۱) یہ بزرگ اپنے
کارناموں سے حسن بن صبّاح کی یاد اس بیسویں صدی میں تازہ رکھے ہوئے ہیں (ص۲۰ و ۲۱
نیز ص۶۲ و ۶۳)

باوجود قانون اور حکومت کی سخت گیری کے، پایۂ تخت دہلی میں بیٹھے ہوئے اپنی
دغا بازی اور عیاری کے زور سے خلقت کو مسحور کئے ہوئے ہیں۔ (ص۲۱)

"مرزا بلگرامی" کے سر پہ کاکلیں ہیں (ص۳۳) اور زینت و آرائش کے وقت ان

علمی کا کلوں میں خوب تیل لگا ہوا (صفحہ ۱۷۹) قوالی اور نعتیہ غزلیں سنتے رہتے ہیں۔ (صفحہ ۲۴) خاص چیز اُن کے "روزنامچے" ہیں، جو اُن کے اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں، اور جن میں اُن کے قلم سے "بلگرامی بانو" کی تعریف و توصیف برابر نکلتی رہتی ہے۔ (صفحہ ۱۶۰) قومی اور مذہبی معاملات میں خاص دلچسپی لیتے رہتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر "تبلیغ" کے سوانگ میں سرگرم ہیں، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مہتاب جنگ، جب ایک مشہور قومی لیڈر کی طرح مشتعل ہو کر، "مرزا بلگرامی" کو مخاطب کرتا ہے، تو کہتا ہے، کہ لے "اشتہاری صوفی اور تبلیغ کے جھوٹے سردار" (صفحہ ۱۱۴) اور مسعود کی زبان میں، اس "اشتہاری صوفی اور دغاباز پیر" (صفحہ ۱۷) کا جامع اور مختصر تعارف یہ ہے کہ

"مرزا بلگرامی، ایک تاریخی خانقاہ کا مجاور، تبلیغ و اشاعت مذہب کے کاموں میں پیش پیش کئی ایک اخباروں کا ایڈیٹر، اور مدرسوں کا مہتمم ہونے کے علاوہ پیری، مریدی کے سلسلہ میں بھی مشہور (صفحہ ۱۷۵)

ان بزرگوار کو اپنے اثر و اقتدار، اور اپنے رسالوں اور کتابوں کی کثرتِ اشاعت پر ناز بھی ہے ایک جگہ اپنی زبان سے فرماتے ہیں :-

"میرا کاروبار تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ میرے مرید ہر جگہ بکثرت ہیں۔ اور میری کتابیں اور رسالے تمام ملک میں شائع ہوتے ہیں۔ میری اخباری نکتہ چینی سے بڑے بڑے والیانِ ملک کانپتے ہیں۔ اور اُن کے درباروں میں کھلبلی پڑ جاتی ہے، جہاں جاتا ہوں، عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہوں" (صفحہ ۱۷۹)

اور ساتھ ہی یہ کھلا ہوا راز بھی زبان پر آجاتا ہے، کہ

"دنیا کے لئے میں زاہد خشک ہوں، لیکن آپ یقین کریں کہ باوجود ان
سب باتوں کے میرا دل اچھی صورت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اچھی آواز
کان میں جاتی ہے، تو میں مسرور ہوتا ہوں، خدا نے آپ کو حسین بنایا
ہے، اور علم موسیقی میں آپ اسقدر مہارت رکھتی ہیں" (ص ۱۷۹-۱۸۰)

فرمایئے "مرزا بلگرامی" کی دلچسپ شخصیت سے اب بھی آپ کو دلچسپی پیدا ہوئی یا نہیں؟ لیکن ذرا ٹھہریئے بعض دلچسپ تر خصوصیات ابھی ظاہر ہونا باقی ہیں۔ آپ لاکھ ذہین سہی لیکن یہاں تک تو آپ کا ذہن بھی نہ پہنچا ہوگا —— اور کیسے پہنچتا؟ نہ آپ محکمۂ پولیس کے کوئی اعلےٰ افسر، نہ کوئی پیشہ ور سراغرساں —— کہ یہ جو اطراف ملک میں بیسیوں ہارے، کشت و خون اور فسادات ہوتے رہتے ہیں، یہ

"انہی حضرت کی بدولت ہوتے ہیں، اور مختلف طریقوں سے روپیہ
اس کے ذاتی خزانہ میں جمع ہوتا رہتا ہے، دہلی کے کئی قتل جن کا آج
تک پتہ نہ چلا اُن میں مرزا کے گرگوں کی شرکت تھی، کتنے ساہوکاروں
اور کارخانہ داروں کا دوالہ نکل گیا، وہ بھی مرزا کی بدولت" (ص ۴۹)

یہ ذاتِ شریف جب آخری بار مسعود کی گرفت میں آتے ہیں، اور اپنے کیفر کردار تک پہنچنے کے قریب ہوتے ہیں، اسوقت وہ علیگڈھ کا مشہور کھلنڈرا، انہیں مخاطب کر کے اُن کی فردِ جرم یوں سناتا ہے:۔

"لال کھوٹر پر قبضہ کرنے اور دولتمند بننے کا جنون تم پر سوار تھا، تم موجودہ
زمانہ کے حسن بن صباح ہونا چاہتے تھے، ہندو مسلمانوں کو تم نے آپس
میں لڑایا، پیری مریدی کے گورکھ دھندے سے ہزارہا آدمیوں کو گمراہ

کیا، مدتوں پولیس کی آنکھ میں خاک جھونکی، قتل پر قتل کئے اور
اور خلقت کو لوٹا" (صفحہ ۲۳)

آپ کہتے ہوں گے، کہ ایسا چھٹا ہوا مجرم تو پولیس کی نظر میں خوب چڑھا ہوا ہوگا، اور ملک کے امن و نظم کے دعویدار، ذمہ دار حکام سرکار تو اسے ملک کا سب سے بڑا دشمن ہی سمجھتے ہوں گے لیکن توبہ کیجیے، آپکا دماغ بھلا مرزا بلگرامی کی ذہانت کو کہاں پا سکتا ہے؟

"اس خیال سے حکام وقت کو اس کی مجرمانہ حرکات کی جانب شبہ نہ ہو، وہ وقتاً فوقتاً اپنے اثر و ذہانت کو ان کی خدمت میں پوشیدہ طور پر صرف کرتا تھا" (صفحہ ۲۹)

پولیس والے کیا پتہ لگاتے، طلسم ٹوٹنے پر، ایک انسپکٹر صاحب خود دنگ رہ جاتے ہیں، اور ان کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا، کہ

"مرزا بلگرامی جو عوام میں اس قدر عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور حکام دہلی جس کے اثر سے اکثر کام لیتے ہیں، ایسا خطرناک مجرم ہے!" (صفحہ ۸۸)

ایک مرتبہ جب ایک انسپکٹر صاحب ایک اہم تلاشی کے لئے بے وقت مرزا صاحب کے دفتر میں داخل ہو گئے ہیں، تو مرزا صاحب فرماتے کیا ہیں۔

"آپ ہیں انسپکٹر صاحب! خیریت تو ہے جو ایسے اوقت تکلیف فرمائی؟ . . . . کیا ڈپٹی کمشنر یا کپتان صاحب نے ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں مجھ سے مشورہ کرنے کے لئے آپ کو بھیجا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ میں گورنمنٹ کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہتا ہوں" (صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳)

یہ "جاسوسی" کوئی مالی منفعت کی چیز نہیں، اس کا اصلی فلسفہ یہ ہے، کہ اس ذریعہ سے مجرمانہ سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے، ایک شریک کار اور راز دار، تخلیہ میں دریافت کرتے ہیں، کہ آخر جاسوسی تو کہیں نہیں گئی، اس کا کیا حال ہے؟ (ص۴۸) تو جواب ملتا ہے، کہ

"اس کی قدر بھی اسی وقت تک تھی، جب تک میری اخباری ہلچل کا میتا تھی - پھر اس میں ملتا ہی کیا ہے، وہ تو محض دوسری سرگرمیوں کی پردہ پوشی اور رفع شر کے خیال سے مفید تھی" (ص۴۸)

ان مرزا بلگرامی سے بھی کہیں بڑھ کر پُراسرار اُن کے "سانپ" ہیں، جو ہر مخالف کو ڈس کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں - دلی بنک کا ایک بابو تھا، اس بیچارہ کی جو شامت آئی، تو اسے یہ پتہ لگ گیا کہ بنک میں مرزا صاحب نے تبلیغ کے نام سے جو روپیہ جمع کرایا ہے، اسے اپنی ذات پر صرف فرما رہے ہیں، اور اس نے دھمکی دی، کہ جلسۂ تبلیغ میں یہ راز فاش کر دیا جائیگا بس پھر کیا تھا، اس بابو غریب کا خاتمہ تھا (ص۸۹) ایک اور اجل گرفتہ احمد جان صاحب تھے جو مرزا کے شریک کار رہ کر پنجاب اور سندھ سے مدرسۂ صوفیہ کے لئے بہت سا چندہ جمع کر لائے تھے - روپے کی تقسیم پر جھگڑا ہوا - ان کے پاس مرزا کے کچھ خطوط تھے، جن کے شائع کر دینے کی انہوں نے دھمکی دی - شام کے وقت پارک میں گئے، گھر واپس نہ آنے پائے تھے کہ راستہ ہی میں سانپ نے ڈس لیا، اور جب پولیس آئی تو خطوط جیب سے غائب ہو چکے تھے (ایضاً)

سب سے زیادہ پُر لطف مرزا صاحب کا اپنے ان کارناموں سے تجاہل ہے - پولیس کے ایک افسر صاحب مرزا صاحب کو آگاہ کرتے ہیں، کہ آپ کے سانپ کا راز، اب راز نہیں رہا ہے، تو معصومیت اور بھولے پن کی کس دلفریب ادا سے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ

"سانپ کیسا؟ کیا میں کوئی سپیرا ہوں؟ صاف بتائیے، معموں میں باتیں

نہ کیجیے" (ص۱۶۶)

"سانپ کیا، کیا میں کوئی سپیرا ہوں؟" کیا خوب ارشاد ہوا ہے۔ جتنی بار جی چاہے، دہرا دہرا کر اس فقرہ کا مزہ لیتے رہیے۔

آپ کہیں گے، کہ "مرزا بلگرامی" کو آخر تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی کی ضرورت ہی کیا پیش آئی۔ مزے سے اپنے "تبلیغ" کے کاموں میں لگے رہتے۔ اور گھر بیٹھے معقول آمدنی کماتے رہتے، لیکن اُن کی بدقسمتی کو کیا کیجیے، کہ دہلی ہی میں ایک "مولوی صورت" اور "نیچری سیرت" ایڈیٹر نے اس ہوائی قلعہ کی بنیادیں تک اپنی گولہ باری سے مسمار کر دی تھیں ایک رازدار خلوت میں پوچھتے ہیں، کہ یہ تو فرمائیے، اب تبلیغ و اشاعتِ مذہب کے گورکھ دھندے کا کیا حال ہے؟ جواب میں ٹھیک تو سننے والوں کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"فی الحال اس کی بھی کساد بازاری ہے، خدا سمجھے اخبار انیس کے مولوی نما کرسٹان صفت ایڈیٹر کو، اس نے ایسا بھانڈا پھوڑا ہے، کہ اب وہ چشمہ بھی خشک ہوتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندو مسلمان بھی ایک دوسرے کے خون کے اب ایسے پیاسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔ باوجود کوشش کے نہ کہیں بلوے ہوتے ہیں۔ نہ مقدمہ بازی" (ص۲۸)

اتنی جلوہ آرائیوں کے بعد کیا اب بھی مرزا بلگرامی کی سیرت اور صورت آپ کے لئے کوئی راز رہی؛ اور کیا اب بھی آپ کو یہ گلہ باقی رہے گا، کہ ریویو نگار نے مرزا بلگرامی کے چہرہ سے نقاب کے گوشے اُلٹنے میں بخل سے کام لیا ہے؟

مصنف نے غایتِ ستم ظریفی یا فرطِ انکسار سے کام لے کر اپنا رستم داستان مہراب جنگ ہی کو ٹھہرایا ہے، اور اس کے بعد پھر مسعود کو بھی اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔

عام تماشائی یقیناً اس نظر بندی میں گرفتار ہو جائیں گے، لیکن بزم آخر محض تماشائیوں ہی سے تو بھری ہوئی نہیں، ع

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی!

ان اہلِ نظر کی نظر تو بس مرزا بلگرامی ہی کے چہرہ پر پڑے گی، اور وہ ساری کتاب کو اسی ایک متن کا حاشیہ قرار دیں گے — ایک پرانے افسانہ نویس نے بھی آج سے سینکڑوں برس قبل اپنی کتاب کا نام داستانِ امیر حمزہ رکھ دیا تھا، لیکن پڑھنے والوں کے دل سے کوئی پوچھے، کہ وہ امیر حمزہ کی داستان ہے، یا عمرو عیار کی؟ اس کتاب میں بھی مرکزی شخصیت اور سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت مرزا بلگرامی ہی کی ہے۔ دوسرے نام اس بیں محض اس طرح آگئے ہیں، جیسے بکاؤلی کے قصہ میں لکھا بیسوا اور زین الملوک، یا داستان امیر حمزہ میں بختک اور لندھور! البتہ دل مذبذب اس میں ہے کہ اس چھوٹی سی دلچسپ و خوشنما کتاب کی حیثیت کیا قرار دی جائے، اور اسے لٹریچر کی کس صنف میں رکھا جائے، تاریخ یا سوانح عمری اسے قرار دیتے ہوئے تو دل دھڑکنے اور قلم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ پھر کیا ہے؟ افسانہ؟ اچھا افسانہ سہی، مصنف کو اگر اسے افسانہ کہنے، اور ناظرین کو اسے افسانہ سمجھنے پر اصرار ہے تو افسانہ ہی سہی، لیکن پھر وہی سوال ہوگا، کہ افسانہ جھوٹا یا سچا؟ تو اب کیا ہر سوال کا جواب ریویو نگار ہی دے؟ ماشاءاللہ آپ کے بھی آنکھیں ہیں، اور آپ کے پاس بھی عقل و دماغ ہے، سوال کا جواب خود اپنے ہی سے آپ کیوں نہیں حاصل کرتے؟

میٹھی کُٹنین[1] یا افسانۂ جمیل

گرجستان یا آرمینیا کے نہیں، وہی شہر لکھنؤ کے رہنے اور بسنے والے نواب جمیل الشان بہادر ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے ابھی کل تک زندہ سلامت موجود تھے۔ اور عجب کیا کہ ہم میں سے بہتوں کو زیارت بھی نصیب ہوئی ہو، ایک ضعیف سے آدمی، شاہی خاندان کی یادگار، چہرہ پر جھرّیاں اور خضابی بال، عمر کوئی ساٹھ سال، جسمانی قوےٰ میں ضعف و انحطاط، لیکن طبیعت میں رنگینی، اور مزاج میں شوقینی، تمنّائیں اور آرزوئیں جوان، دل کے گوشہ گوشہ میں نوجوانوں کے سے ارمان۔ آخر دورِ آخر کے نواب ہی تھے۔ معقول وثیقہ اور گراں قدر پنشن تھی کس دن کے لئے رئیسوں کی آن بان، نوابوں، شہزادوں کی شان۔ اور پھر گُل ہوتے ہوئے چراغ کی لَو تیز کرنے، بجھتے ہوئے انگاروں کو ہوا دینے کے لئے مصاحب ایک نہیں دو دو حاضر و مستعد، ایک مرزا سیتا، دوسرے میاں علی حسین۔ ایک روز باتوں باتوں میں ایک بازاری حُسن کا وہ سبز باغ دکھایا اور شوق و اشتیاق کا وہ لام باندھا کہ بھولا شہزادہ، اعادۂ شباب کے کسی غدودی آپریشن کے بغیر، اپنے کو عالم تصوّر میں، جوانِ رعنا سمجھ بیٹھا۔ اَور دِل کوہ قاف کی پری پر نہیں، شہر ہی کی ایک لکھابیوا پر آگیا۔ یہ بی صاحبہ، تھیٹر میں کام اور تماشبینوں میں نام پیدا کئے ہوئے اتفاق سے اُس وقت ایک خان بہادر کی پابند تھیں، خان بہادر سن و سال میں تو تھے شہزادہ

---

[1] صدق جلد ۵ نمبر ۲۹، مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۰ء۔ نظرثانی مارچ ۱۹۴۴ء

صاحب کے لگ بھگ، لیکن خوب مضبوط اور ٹانٹھے، ساٹھے پاٹھے بڑے حکام رس اور بااثر غضب کے زیرک اور صاحب ہنر، رہنے والے لکھنؤ کے نہیں، خاک پاک بدایوں کے، وہی بدایوں جس کا کلمہ اُستاد مصحفی بھی پڑھ گئے ہیں ؎

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں!

اُسی ڈیرہ دار کے عشق سراپا شوق میں ڈیرے ڈنڈے لکھنؤ میں ڈالے ہوئے، چوک کے قریب کہیں چھاؤنی چھائے ہوئے۔

اب شروع ہوئی بازار کی مٹھائی پر چھین جھپٹ، یا شاعروں کی زبان میں رقابت۔ اِدھر سے بلا کے جوڑ، اُدھر سے قیامت کے توڑ۔ اِدھر کے جیالے اگر اپنے وقت کے جالینوسؔ تو اُدھر کے شاطر بھی اپنی حکمت و فطرت کے لحاظ سے پورے "فیلسوف"۔ کبھی اِن کی مات، کبھی اِن کو شکست فاش۔ ایک کو اپنے خاندانی اعزاز کا غرہ، دوسرے کو "صاحب لوگوں" کی خدمت میں ڈالی پیش کرنے اور شکار کھلاتے رہنے کا آسرا۔ اِدھر خان بہادر نے کپتان پولیس کو گانٹھ لیا، اُدھر شہزادہ نے ڈپٹی کمشنر کو جا کر شیشہ میں اُتار لیا۔ آج عتاب نازل ہوا، پولیس کے داروغہ پر اور بیچارہ کا درجہ ٹوٹ کر رہا۔ کل نزلہ گرا کوتوال شہر پر، اور غریب کو لکھنؤ چھوڑ کانپور جانا پڑا۔

شہزادہ سے نپٹ لینے کے لئے خان بہادر بالکل کافی تھے، لیکن ہوا یہ کہ شہزادہ کو کمک پہنچ گئی اپنے رفیق قدیم نواب بنیاد حسین خان آنریری مجسٹریٹ اور رئیس اعظم کانپور کی، یہ سوجھ بوجھ میں خان بہادر سے بھی بڑھے چڑھے، اور حکام رسی اور خوش تدبیری میں ان سے کہیں آگے اُڑتی چڑیا کے پر گن لینے والے۔ اب نقشہ جنگ یہ کہ ایک طرف لکھنؤ کے شہزادہ اور کانپور کے رئیس اور مجسٹریٹ اور دوسری طرف بدایوں کے خان بہادر اور کانپور کے کوتوال

محاذ جنگ بھی اب کھنچتے کھنچتے لکھنؤ سے کانپور اور کلکتہ اور بدایوں تک وسیع ہو گیا۔ اور واقعات کے اسٹیج پر پہلے تو وہی جانے بوجھے دو ہی چار شخص تھے، اب نئی نئی صورتیں نمودار ہونے لگیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ، (نواب خورشید مرزا اور قمر مرزا)، اور خورشید دولہن، اور فرحت مرزا، اور مسعود و شاہد، اور سب سے بڑھ کر میر زین العباد چشمہ فروش ان بزرگوار سے ایک بار بھی تعارف ہو جائے تو عمر بھر ساتھ چھوڑنے کا جی نہ چاہے، ایک روز شہزادہ صاحب معہ اپنی اور خان بہادر کی مشترک محبوبہ کے غائب ہو جاتے ہیں، پھر یک بیک کانپور میں ان کا نزول اجلال ہوتا ہے، بجائے اس بیسوا کے، ایک خوش جمال و شوخ دیدہ کشمیری لڑکے حسن جان کے ساتھ، چند روز کے بعد حسن جان بھی لاپتہ اور مفقود الخبر!

"میری زندگی بھی عجیب زندگی ہے۔ . . . . مجھے اس زندگی سے کبھی دلچسپی نہ تھی، ہمیشہ کراہت رہی۔ کئی دفعہ اس مخمصہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ سچ ہے کہ روپیہ پیسہ دولت کی چاٹ بُری چاٹ ہے۔ اور عادت پڑ جانے کے بعد بدکاری میں لذت ملتی ہے مگر تا کے۔ دس پانچ برس کے بعد کیا سے کیا ہو جانا پڑے گا باسی ہار کو لوگ پیروں سے ملتے ہیں . . . . عشاق کہو یا چاہنے والے، سب جوانی کے ساتھی ہیں وہ ڈھلی، اور ان کی نظر بدلی پھر یا چھیڑ چھیڑ کر لڑائی لڑتے ہیں۔ وضعدار ہوئے تو کچھ دنوں تباہا رفتہ رفتہ آنا جانا کم کیا، پھر بیٹھ رہے"۔

یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے ان خیالات کی جو اس بیسوا کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں، جسے آپ ابھی اس عالم میں چھوڑ آئے تھے کہ

وائے بر صید کہ یک باشد و صیاد ے چند!

جی ہاں! یہ خیالات اور ایک بیسوا کے! بیسوائیں بھی آخر اس مٹی کی بنی ہوئی ہیں، جس سے خمیر بڑی بڑی عصمت کی پتلیوں کا ہوتا ہے، اور بندی اسی قادر مطلق کی ہوتی ہیں جو شریف بہو بیٹیوں کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس کی رحمت کی جب ہوا چلتی ہے تو محلہ کے سڑے ہوئے گھورے پر مہکتے ہوئے گلاب اور لہلہاتے ہوئے چنبیلی اور جوہی کے پھول کھلا دیتی ہے۔ اور اس کی صنعت جب بہار پر آتی ہے تو کھرے اور کھردرے پتھروں کو ہیرے اور جواہر بنا دیتی ہے۔ ناپاکی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، دنیا میں حقیر و ذلیل، آخرت میں راندہ و درماندہ۔ جوانی کی بہار کے دن کی، دولت کا خواب کے گھڑی کا، جوان جہاں عورت اپنے انجام کو سوچتی جاتی ہے اور دل ہی دل میں روتی جاتی ہے:۔

"بی صاحبہ سنوں سے اتریں اور چاہنے والوں کی کمی ہونے لگی۔ دولت کے پر لگے۔ یہ گئی اور وہ گئی۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ دن کے جلیس اور رات کے مونس ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ حیادار ہوئیں تو چپل بسیں، نہیں تو برقع پہن کر بھیک مانگنے کی ٹھہری آئے دن کے واقعات ہیں۔ پچاسوں مثالیں اس قسم کی اسی شہر میں کیا ہر شہر میں موجود ہیں۔ کسی کی ناک گئی اور کسی کی جان گئی۔ انجام یہ ہے کہ اولاد نہ ہونے پائے بوڑھاپا آجائے گا چھوٹے بچے کو دیکھ کر ماں کو جو دلی خوشی ہوتی ہے، وہ ان کے مقدر میں نہیں، جوان مریں تو کوئی دو آنسو بہانے والا نہیں، نہ فاتحہ نہ درود کرنے والا"۔

پاک زندگی کی لطافتیں، گھر گرہست شریفانہ زندگی کی مسرتیں، میاں اور اولاد کی محبتیں۔ ان بیچاریوں کو کہاں نصیب یہ بدنصیب کیا جانیں کہ گھر کی ملکہ ہونے کے معنی کیا ہیں۔ اور شوہر کی کمائی کی موٹی جھوٹی میں بھی اللہ نے کیا لطف اور کیسے مزے رکھ دیئے ہیں عصمت جو غریب سی غریب عورت کا بھی سب سے بڑھ کر بیش بہا خزانہ ہے، اور جو آ کی

بیٹیوں کے پاس اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے اس کی ناقدری کی سزا قدرت کی طرف سے اسی دنیا میں یہ مل کر رہتی ہے کہ عورت محبت سے محروم کر دی جاتی ہے۔ اب نہ اس کے دل میں کسی کی محبت رہ جاتی ہے۔ نہ کسی کے دل میں اس کی۔ اور یہ نہ ہو تو دنیا میں آخر نور و ظلمت، خوشبو و بدبو، پاکیزگی و گندگی ایک ہی ہو کر نہ رہ جائیں۔

زمانہ کچھ اور کھسکتا ہے، واقعات پلٹوں پر پلٹا کھاتے ہیں۔ کمو جان کو آخر کار بڑی لمبی جد و جہد کے بعد خان بہادر کی قید سے رہائی نصیب ہوتی ہے، شہزادہ صاحب دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ شریف بیسوا اپنی نام کی ماں کے نام خط لکھنے بیٹھتی ہے۔ خط میں کیا لکھتی ہے۔ اپنی اور اپنی ساری برادری کے نامہ اعمال کی نقل کاغذ کے اوراق پر کر دیتی ہے:

"امی جان۔ کمو کی بندگی قبول کیجیے۔ مجھ نصیبوں جلی کو آپ چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں، اور اپنے کاٹ پیچ سے باز نہیں آتیں۔ آپ سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ یہ ناپاک زندگی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ نہ معلوم وہ کونسی منحوس گھڑی تھی کہ جب معلوم نہیں کس نے مجھے آپ کے سپرد کیا اور آپ نے مجھے پالا پوسا۔ میں مانتی ہوں کہ آپ نے مجھ پر بہت کافی روپیہ صرف کیا۔ لیکن جتنا صرف کیا اس کا چوگنا آپ نے تھیٹر ہی سے وصول کر لیا آج اسی شہر میں بیگم بنی بیٹھی ہوتی، اور چین سے رہ رہی ہوتی، وہ بنا بنایا کھیل تمہیں نے بگاڑا اور لکھنؤ لے کر چلی آئیں۔ تم نے چاروں طرف سے خوب دولت گھسیٹی، لاکھوں کی آدمی ہو۔ پر اللہ نے چاہا تو مرتے وقت بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں ہو گا۔ کیا کروں، منہ سے کوسنا ہی نکلتا ہے۔ خیر تم پر اور تمہارے گھر پر میں نے لعنت بھیجی اور موقع پاتے ہی نکل بھاگی"

الفاظ سوزِ دل کی روشنائی سے لکھے ہوئے اس کے قلم سے نکل رہے ہیں، جس کی

برادری کو بڑے بڑے جبہ وعمامہ والے حقارت کے ساتھ دھتکارتے ہیں، اور معززین وشرفا کبھی شرارت سے اور کبھی شقاوت سے گندگی کے اندھیرے غاروں کی گہرائیوں میں ڈھکیلتے چلے جاتے ہیں! اللہ جزائے خیر دے، بہت بہت جزائے خیر دے "صاحب حق" (روزنامہ حق لکھنؤ کے ایڈیٹر) عبدالرؤف عباسی صاحب کو انہوں نے نفرت وحقارت کے بجائے، انسانیت وہمدردی کے ساتھ اس طبقہ کے جذبات کی ترجمانی کی۔ اور شستہ زبان اور میٹھی بول چال میں، اس داستانِ دلستان کے پردہ میں حقائق کو ۲۸۰ صفحہ کی ضخامت میں مرتب کر کے اس بیٹھی کو نین کو ۳ء میں وقف عالم کر دیا۔ یہ کام کرنے کا تھا، علماء ومصلحین کا لیکن اللہ جس سے جو خدمت چاہے لے لے۔ اور جسے جس منصب پر چاہے سرافراز کرے

خط ابھی ختم کیا معنے، آدھا بھی نہیں ہوا ہے، چند سطریں اور سن لیجئے:۔

"ہے ہے وہ پاک پروردگار میری نہ سنتا تو میں کیا کرتی۔ بدایوں شہر، خان بہادر صاحب کا سارئیس۔ حاکم ان کے اثر میں، پولیس ان کے کہنے میں، لاکھوں کروڑوں کے مالک جو چاہیں کر ڈالیں، کوئی پوچھنے گچھنے والا نہیں، میری بات سنو، چلتے چلانے میں تمہارے ساتھ دوستی کئے جاتی ہوں، خان بہادر کے گھر بیٹھ جاؤ . . . . . کہو ننھی جان، اب میں تمہیں ننھی جان ہی کہوں گی۔ پچاس کے لگ بھگ ہو گئی ہو، کبھی اس کا بھی خیال آیا ہے کہ اب موت کے دن قریب ہیں، خدا کو ظاہر میں بہت مانتی ہو، نذر نیاز بھی کرتی رہتی ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی اس کا وہم آتا ہے کہ کتنے گھر تم نے گھالے ہیں اور کتنے خاندان تم نے تباہ کئے ہیں۔ ان سب کا وبال تمہاری جان پر پڑے گا یا نہیں، یاد رہے کہ تمہارے اعمال قبر میں کالے بن کر ڈسیں گے اور یہ حرامکاری کے پیسہ کی نذر نیاز ایک کام نہ آئے گی۔ توبہ کرو توبہ، اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔"

کسی بڑے شہر کے جنکشن اسٹیشن کے باہر، خصوصاً تیسرے درجہ کے مسافر خانوں کے دروازہ پر، جب چاہیئے یہ تماشائے عبرت اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے، کہ سامنے فقیرنیوں، بھیک منگیوں کا ایک غول کا غول چیتھڑے لگائے ہوئے، میلی کچیلی، گھناونی بیمار اور لاغر۔ ان میں کتنی ایسی ہیں جو ابھی کل تک جوان تھیں، بنی ٹھنی ہوئی، اپنے حسن وجوانی پر نازاں، اور اللہ کی اس امانت کو بازار میں دوکان لگا کر بیچ ڈالنے والیاں ــــ بی بی آسیہؑ کا نام کس نے نہیں سنا ہے؟ بیوی کس کی تھیں؟ اللہ کے دشمن فرعون مصر کی، اللہ کے دشمنوں ہی کے درمیان پلیں بڑھیں، فرعون ہی کے محل میں رہیں بسیں۔ اس کے باوجود، جب اللہ کی طرف جھکیں، سجدہ میں گریں تو مرتبہ کیا پایا؟ قرآن تک میں ذکر آیا، فرشتوں کو رشک آیا! اللہ اللہ! تائب کے مرتبہ اور سرافرازیوں کا کیا پوچھنا! اور پھر یہ ہماری بہکی ہوئی بہنیں اور بھٹکی ہوئی بیٹیاں تو منکر نہیں مومن ہیں۔ باغی نہیں، صرف غافل ہیں۔ آج یہ اپنے خوش نصیب شوہروں کے گھر آباد کئے ہوتیں، تو خود بھی کیسی ہنسی خوشی، چین اور سکھ کی زندگیاں گزارتیں اور ان کی گودوں میں پل پل کر ہمارے سرور وسردارؐ کے لشکر میں کتنے وفادار اور جانباز سپاہیوں کا اضافہ ہوتا! محمد مصطفےؐ کو برحق ماننے والیاں، اس نبی کی امت کہلانے والیاں، اس کی شفاعت سے آس لگانے والیاں، کیا خدانخواستہ ان کے کلیجے پتھر کے ہیں؟ جنت کی کھڑکی اپنے سامنے دیکھیں گی اور ادھر سے آنکھ بند کر لیں گی، منہ پھیر لیں گی؟ لپکتے ہوئے شعلوں سے بچانے والا ہاتھ ان تک پہنچے گا اور اسے اپنی ٹھوکروں سے ٹھکرا دیں گی؟ گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھیں گی اور آگ بجھانے کے انجن والوں کو اپنے پاس سے دھکے دے دے کر نکال دیں گی؟

طول طویل خط کا ایک آخری ٹکڑا شکر مکتوب اور کتاب دونوں کو بند کر دیجئے:-

... گھر گرہست اور پاک زندگی کے مزے تم کیا جانو۔ تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے

امیروں کی تو بڑی بات ہے، بیسیوں ماما ئیں، اصیلیں، مغلانیاں ہر وقت منہ دیکھتی رہتی ہیں، غریبوں کو لو، میاں کے دل پر اگر بیوی بیٹھ گئی، اور کیوں نہ بیٹھے گی، بیوی جوان اور وہ بھی جوان زندگی کی خوشی ہر وقت ہاتھ باندھے حاضر رہے گی . . . . درد دکھ، خوشی و راحت، رنج و غم میں دونوں شریک، ایک دوسرے کی ہر حالت میں اور ہر جگہ ہمدرد . . . . آدمی آج خود مفلس اور قلاش ہوا تو کیا، اولاد کو خونِ جگر کھا کے حوصلہ سے پالتا اور پرورش کرتا ہے اس امید پر کہ وہ جوان ہوگی تو اُس کا ہاتھ بٹائے گی ۔ یہ اُس ریت کی عمارت نہیں ہوتی ۔ سینکڑوں مثالیں اس کی میری اور تمہاری آنکھوں کی دیکھی ہوئی موجود ہیں ۔ کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ کسی مردی ٹکاہی، یا تم سی بڑی ڈیرہ دار طوائف کے پہلو میں بھی ایسی امید ہوتی ہے ۔ قصہ طویل ہے ۔ اگر خدا نے کچھ بھی عقل دی ہے تو اس خط سے سبق لو"۔

سبق قصہ کی اس نائکہ نے لیا یا نہیں، اسے چھوڑیئے، سبق لینے کے قابل ہے پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں کے، بوڑھوں کے اور جوانوں کے تماشبینوں کے اور تماشہ گروں کے پھنسنے والوں کے، اور پھانسنے والیوں کے، نوابوں کے، رئیسوں کے، امیروں کے، کوٹھے والیوں کے، فلم ایکٹرسوں کے، ریڈیو اسٹاروں کے، غرض ہمارے آپ کے سب کے صحت کو، عزت کو، دولت کو، برباد کرنے والے اور غارت کرنے والیاں کاش آنکھیں کھولیں اور سوچیں کہ اب تک کس طرح زندگی کا نام کا فور رکھے ہوئے ہیں ۔

کوتوال شہر اپنی سراغرسی میں کہاں تک کامیاب رہے؟ حسن جان کا کچھ پتہ لگا؟ میر زین العباد پر کیا کیا گزری؟ نواب بنیاد حسین خاں کی خوش تدبیریوں اور ہوشمندیوں نے کیا گل کھلائے؟ خورشید مرزا نے طرارے کھیل میں کیا حصہ لیا؟ خورشید دولہن کی اصلیت کیا نکلی؟ شہزادہ صاحب کی خبر ان کی بیگم صاحبہ نے کس بری طرح لی؟ میر صاحب چشمہ فروش کی

افسوں نوازی کیا رنگ لائی ؟ اس طرح کے سارے سوالات کا حل کتاب میں تلاش کیجئے۔ اور اس کا اطمینان رکھئے، کہ جو لوگ مغز کلام کی طرف سے آنکھیں بند کر قصہ کو محض لطف زبان اور حسن بیان کے لئے پڑھنا چاہتے ہیں وہ بھی گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ یہاں تو صرف مصنّف سے یہ کہنا ہے کہ اگر انہوں نے اِس خداداد نعمت کی پوری قدر نہ کی، اور جس طرح اس کتاب میں لطیف و جمیل پیرایہ میں اور دلکش انداز سے نیکی کی فتح بدی پر اور پارسائی کی بے عصمتی پر دکھائی ہے، آیندہ اگر اسی رنگ میں دین کی فتح بے دینی پر اور اخلاق کی بد اخلاقی پر نہ دکھائی، تو عجب نہیں کہ "کل" خود اُن سے سوال ہو جائے۔

نغمۂ زندگی[1] :-

از سید فضل احمد کریم فضلی، بی لٹ (آکسن) آئی سی ایس، چھوٹی تقطیع ضخامت تقریباً ۳۰۰ صفحے، مجلد، قیمت بہ اختلاف جلد ۴ع، ۶ع۔ پتہ دفتر انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی یا فضلی برادرس (لمیٹڈ) کنٹ ہاؤس مشن رو ایکسٹنشن کلکتہ۔

کتاب کہیے، یا ننھے منّے سے قد، ہلکی پھلکی قامت کی مناسبت سے کتابچہ، اردو دیوان ہے ایک آئی سی ایس شاعر کا، اور مجموعہ ہے ایک آکسن کے اردو کلام کا ——— اپنی نوعیت میں شاید پہلی اور انوکھی چیز۔

جدّت اور ندرت صرف اسی حیثیت سے کب ہے؟ قدرۃً نظر سب سے پہلے فہرست پر پڑی، اور پہلا عنوان "تصویر شاعر" نظر آیا۔ ورق الٹا، لیکن آئیں تصویر کہاں ہے؟ کسی نے تصویر والا صفحہ پھاڑ تو نہیں ڈالا! جی نہیں صفحہ سالم، لیکن درج بجائے تصویر کے صرف ایک شعری تصویر! لاحول ولاقوۃ، کیا دھوکا ہوا۔ آگے چلیے، دوسرا عنوان "دیباچہ"۔ اچھا صاحب، دیباچہ تو پڑھنے میں آئے گا، لیکن توبہ اب کی پھر وہی دھوکا! دیباچہ الفقط، اور اس کے عذر میں دو شعر درج! ——— غرض مصنف اور تبصرہ نگار کے درمیان آنکھ مچولی شروع شروع ہوئی۔ شیوہ طراز شاعر ہے کہ قدم قدم پر مات دیتا اور بھولا بھالا ناقد ہے کہ مات پر مات کھاتا چلا جاتا ہے! یہاں تک کہ اصل دیوان غزلیات کا شروع ہو گیا، وہی ردیف الف

---

[1] صدق ۱۲ر اپریل ۴۳ء

اب کہیں اُستاد غالب سے مشورے ہو رہے ہیں، کہیں خواجہ حافظ سے سرگوشیاں، کہ لیجیے صد ۹۸ آگیا، اور اب دو بدو ہونے لگی فارسی کے اُستاد منوچہری سے۔

صد ۹۲ پر غزلوں کا جلسہ ختم۔ صد ۹۵ سے نظم خوانی کی محفل آراستہ۔ کہیں رُباعیاں ہیں، کہیں قومی نظمیں اور سب سے آخر میں نظم "آکسفرڈ" میر حسن کی بدرِ منیر کے وزن پر۔ آکسفرڈ کی سرگذشت اور اُس کی خود گذشت ——— خدا معلوم اس مثنوی کو مثنوی کہنے میں شاعر نے کیوں تکلف سے کام لیا! ——— وہی روانی، وہی شوخ بیانی، وہی رمز و کنائے، وہی حرف و حکایت، جو مثنوی کی جان ہوتی ہیں، غرض بجز عریانی و فحش نگاری کے اور سب کچھ۔ سب سے بڑی اور شاعر کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم نظم (یہ بھی مثنوی ہی ہے) کا عنوان "بتِ قلم کا جادو"۔ یہاں پہنچکر شاعر نرے شاعر نہیں رہتے، واعظ و خطیب بھی بن جاتے ہیں۔ وعظ و خطابت سینما کی ہجو میں نہیں، اچھی پاکیزہ، اصلاحی و انقلابی فلم سازی کی حمایت میں ——— رِند میں محتسب کی شان، زبان شاعرانہ، تیور مصلحانہ!

شاعر نے شہد کی مکھی بن، رس خدا معلوم کن کن پھولوں کا چوسا ہے، کن کن کلیوں کا چوسا ہے۔ اقبالؒ کا اثر سب سے بڑھ کر نمایاں، شروع میں بھی، آخر میں بھی، وسط میں بھی، لیکن اپنی خودی کو لئے دیئے ہوئے۔ اپنی شخصیت سب سے الگ تھلگ کیے ہوئے۔ رنگ میں کسی کے بھی پیرو اور مقلد نہیں، سب سے آزاد، بس اپنے ہی اوپر اعتماد۔ یہ ہنر نہیں قدیم الخیال ریویو نگار کی نظر میں کچھ عیب ہی سا ہے۔

صلاحیتیں اب بھی موجود ہیں۔ خدا کرے عمر میں اضافہ اور مشق میں پختگی کے ساتھ نظر بھی حکیمانہ و عارفانہ ہوتی جائے۔ شاعری تمام تر ایمانی و عرفانی بن جائے، اور حضرت اقبالؒ کی عمر تک پہنچتے حضرت فضلی پورے "اقبال ہند" ہو جائیں ——— اور زبان و وطن کے

لحاظ سے پنجابی[1]، اور سکن کے لحاظ سے بنگالی، بھلا کیسے ممکن ہے کہ اتنی شاعری صحیح اردو میں کر جائے۔ نکتہ چینی کی نگاہ اس تلاش میں دوڑی، بھری، گھومی۔ لیکن بجز ص ۹۵ کے آخری شعر کے شاید کہیں بھی جگہ کھٹکنے اور ترکنے کی نہ پائی۔

---

[1] بعد کو معلوم ہوا کہ فضلی صاحب کا وطن پنجاب نہیں۔ ضلع میرٹھ (صوبہ متحدہ) ہے۔

نقد و نظر[1]:-

از پروفیسر حامد حسن صاحب قادری صفحات ۳۰۲، مجلد، قیمت سے

پتہ:- شاہ اینڈ کمپنی، پبلشرز۔ حکیم وحی روڈ۔ آگرہ

نقد و نظر پر تبصرہ کرنے کے لئے خود بڑے صاحب بصیرت ہونے کی ضرورت ہے۔ لیکن سرے سے آنکھ چرا جانا بھی بڑی بے بصری ہے۔

کتاب پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ زیادہ تر ایسے جو پہلے کسی رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اب اس مجموعہ میں قرینہ سے سج سجا کر نکلے ہیں تو سب نئے معلوم ہوتے ہیں، پندرہ میں سے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:-

غالبؔ کی شرحیں۔ میاں نظیر اکبر آبادی، آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ، خمخانۂ ریاض، زبان کے چند نکتے۔ تنقید کے نئے زاویئے، عروضی غلطیاں۔

تنوع کے سرسری اندازہ کے لئے یہ عنوانات کافی ہوں گے۔ اندازہ "سرسری" اسلئے کہ ادب، انشا، تنقید، عروض، سخن فہمی کے جتنے عمیق نکتے اور جتنے وسیع مباحث کتاب کے اندر پھیلے ہوئے ملیں گے، اس کا پورا اندازہ تو بس کتاب ہی کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ فہرست مضامین کا نقل کر دینا، یا کوئی چھوٹا موٹا سا تبصرہ بھی اس کے لئے بالکل ناکافی ہے۔

کتاب شروع سے آخر تک ایک مشرقی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مشرقی طلباؤں کے لئے اور مشرقی عام ناظرین کے لئے قادری صاحب یہ نہیں کہ ہومر اور ورجل کے ناموں سے ناآشنا

---

[1] صدق ۴ جنوری ۱۹۴۳ء

ہوں ، وہ واقف بائرن ، شیلے سب سے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں ۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں ، اپنے دل و دماغ سے لکھتے ہیں ، اور اپنوں کے لئے لکھتے ہیں ۔ حد یہ ہے کہ مجموعہ کا مضمون مطالعۂ شاعری اُن کا طبعزاد نہیں ، بلکہ میتھو ارنلڈ کا ترجمہ ہے ، لیکن اس کو بھی اپنا لیا ہے ، انگریزی نما اردو نہیں ٹھیٹھ اردو لکھ کر ۔ اور اشعار کا اپنی طرف سے جا بجا اضافہ کرکے ——— البتہ وہ ناواقف ایک فن سے ہیں ۔ انہیں یہ نہیں آتا ، کہ اپنے افلاس دماغی پر پردہ پُرشوکت اور مرعوب کُن ناموں کا ڈال لیں ، کتاب متوسط اور منتہی طلبہ کے تو خاص کام کی ہی ہے ، باقی عام شائقینِ ادب بھی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور پورا لطف و دلچسپی بھی حاصل کر سکتے ہیں ، بلکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بہت سے درس دینے والے اساتذہ بھی اگر کسرِ شان نہ سمجھیں تو اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتے ہیں ۔ تین سو سے اوپر کی کتاب کے لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس کے ہر ہر تبصرہ ہر ہر خیال سے دوسروں کو اتفاق ہو ، شرح دردؔ والے مضمون میں تو خصوصیت کے ساتھ فاضل مُبصر کے تبصرے نظرِ ثانی کے محتاج نظر آئے ، لیکن بہ حیثیت مجموعی اتنی سلجھی ہوئی ، سنبھلی ہوئی ، سموئی ہوئی کتاب فنِ تنقید پر اردو میں عرصہ کے بعد دیکھنے میں آئی ، جب طبیعت دوسرے رنگ کی ، صاحبانہ اور سرکاری رنگ کی ، تنقیدی کتابوں سے اچھی خاصی اُکتا چکی تھی !

ایک بڑا سبق اِن صفحات سے یہ مِل جاتا ہے ، کہ تنقید و تبصرہ کا لب و لہجہ کیا ہونا چاہیئے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعروں ، ادیبوں ، نقادوں سے اختلاف ، اور شدید اختلاف شریفانہ انداز میں بھی کیا جا سکتا ہے ، اور ہاں ، ایک بات تو رہی جاتی ہے تضمین کلام غالب وغیرہ کے ضمن میں قادری صاحب نے جہاں جہاں خود اپنا کلام درج کیا ہے ، وہاں تو بے اختیار دِل سے یہ نکلتا ہے کہ واہ حضرت آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے ۔ سخن فہمی کے ساتھ سخن گوئی !

! ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست !

جزیرۂ سخنوراں[1]

از غلام عباس صاحب، ۱۴۴ صفحات، مجلد خوشنما، قیمت ایک روپیہ

پتہ:- کتاب خانہ ہزار داستان ۴۳ بازار لین نئی دہلی۔

یہ ایک افسانہ ہے، نئے اور البیلے رنگ کا۔ پلاٹ یورپ سے لیا ہوا، لیکن قصہ بالکل اُردو میں اپنایا ہوا۔ ایک جزیرہ ہے، جزیرۂ سخنوراں، تمام تر شاعروں اور ان کے مداحوں سے آباد، اخلاق کی قیود سے آزاد، وہاں یہ سیاح صاحب معہ اپنی ہم سفر ایک حسین خاتون کے اتفاق سے جا پہنچتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں مجلس شوریٰ تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ مجلس کے تین ارکان ہیں، ایک ادھیڑ سن کے بزرگ "فصیح الفصحا، شاعر بے ہمتا علامہ مفتی انوار الحسن یکتا"۔ دوسرے ایک طرحدار نوجوان "بلبل داستان سرائے گلشن معانی رشک انوری و خاقانی، حضرت اُمّی"۔ تیسرے خود صدر مجلس "حقیر پُر تقصیر، خاکسار ذرہ بے مقدار مائل"۔

شاعروں کی دنیا، شاعری کی دنیا سے بھی بڑھ کر دلچسپ اور قابل دید۔ سرکاری مہمانخانہ کا نام دار الخیال۔ باغوں، بازاروں، گلی کوچوں کے نام خیابان میر۔ غالب بازار۔ آتش باغ گلزار سرور، کوچۂ مومن خاں وغیرہ۔ یہاں کے معشوق کا حلیہ:-

"نصف عورت، نصف لڑکا، ایک طرف محرم، چوٹی، موباف، دوسری طرف کلاہ، جبیدہ، اور سبزۂ خط، طبیعت میں سفاکی اور جلادی کوٹ

---

[1] صدق، ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء

کوٹ کر بھری ہوئی، ہونٹوں پر عاشقانِ باوفا کا لہو لگا ہوا، کسی پہ سر
کمند پھینکی، کسی کے پاؤں میں زنجیر ڈالی، کسی کو شہیدِ تیغِ ناز کیا، کسی کو
بحرِ ظلمات میں دھکا دیا کہ عمر بھر ٹامک ٹوئیے مارتا رہے، کسی کو چاہِ ذقن
میں غرق کیا کہ جیتے جی سر نہ اُٹھا سکے، نہ انسان مامون، نہ وحوش و طیور
مصون" (ص ۵۶-۵۷)

رہا عاشقِ بے چارہ :- "سو وہ مصیبت کا مارا، صدق و وفا کا پتلا، غریب الوطن،
فلکِ ناہنجار کا ستایا ہوا، لہو کا پیاسا، تنگ دھڑنگ، آج یہاں تو کل وہاں
کبھی دریا میں ناخدا پر چھینٹیں اُڑائے، تو کبھی صحرا میں آہوؤں کے ساتھ
آنکھ مچولی کھیلے، بھیس بدلنے کے فن میں استاد - کبھی مجنوں کا روپ دھار
صحرا میں محمل کے گرد چک پھیریاں لیئے تو کبھی فرہاد بن کر کوہِ بے ستون
پر تیشہ تیز کرے، کبھی انسان، تو کبھی جانور، کبھی گھر کی کال کوٹھری میں
تو کبھی درخت پر کسی گھونسلے میں" (ص ۵۷-۵۸)

یہاں کی زبان، صنائع کی جان، بدائع کی کان - ایک صاحبہ اپنی ملازمہ کو جھڑک رہی ہیں :-
"اری موئی سوئی نہیں ملتی تو گولی مار، کیوں پیچ کھاتی ہے" (پیچ + ک = پیچک)
ایک عاشق صاحب یوں دادِ فصاحت دے رہے ہیں :-
"اے سنگ دل تیری سنگدلی پر پتھر پڑیں، ہم تو تیرے چہرۂ بلوریں
لبِ لعل و دُرِ دنداں کو یاد کر کے، کوہ و بیابان میں پتھروں سے سر پھوڑیں
اور تو غیروں کے سنگ گل چھرے اُڑائے۔ رات آہوں کے شرار، مرے یہ ڈھنگ اُڑے
کوہ سے سنگ، پیچ کر کئی فرسنگ اُڑے"

معشوق صاحب کے جواب میں یوں بلاغت کے شرارے چھوڑتے ہیں:۔

"۔۔ ارے نادان، میزانِ عشق میں پاسنگ ہونا محال، کیوں مَن مَن بھر کی باتیں چھانٹتا ہے سنگسار ہونے کی نیت ہے کیا؟"

یہ فاسقانہ عاشقی معشوقی میں "سنگ ساری" کا ضلع، بہت خوب بہت خوب! صدؔ وصدؔا پر غالب کے دو شعروں کی جو شرح کی گئی ہے، وہ پُر لطف ہونے میں اپنی نظیر آپ ہے، مشاعرہ کا منظر بہترین ہے ـــ شعر و ادب کے دیوانوں کے لئے ایسے دلکش و رنگین مرقع کا سودا ایک روپیہ میں مفت ہے۔

(۱) خنداں[1] :-

از رشید احمد صاحب صدیقی - صفحات ۲۸۱ مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے

پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی (لکھنؤ، لاہور - بمبئی)

یہ اردو کے مشہور ظریف و شوخ نگار رشید احمد صاحب صدیقی کے چالیس ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے - یہ مضامین عرصہ تک دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتے رہے، اور اب مکتبہ جامعہ کے حسنِ اہتمام سے کتابی شکل میں آ گئے ہیں - رشید صاحب کی پُر لطف طرزِ نگارش اب پڑھے لکھے حلقوں میں قطعاً نہ کسی سفارش کی محتاج ہے، نہ تعارف کی - ان کا ایک خاص اپنا رنگ ہے، دوسروں سے ممتاز، اور وہ پختہ کار ہو چکا ہے - بغیر کسی کی دل آزاری بلکہ دل شکنی کے، بلا فحش و ابتذال کے شائبہ کے - ہجو اور سبابی سے پاک، وہ چھوٹے بڑے، اپنے پرائے، سب کے خاکے اس دلچسپ انداز میں کھینچتے چلے جاتے ہیں، کہ پڑھنے والا ہر سطر پر پُر لطف لیتا جائے، مسکراتا جائے جھومتا جائے اور کہیں کہیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے -

نشریہ تیار کرنے میں مصنف کا قلم آزاد نہیں ہوتا، ریڈیو بہرحال ایک سرکاری محکمہ ہے اور محکمہ کی طرف سے طرح طرح کی قیدیں اور پابندیاں عائد رہتی ہیں - ظرافت کی بے تکلفی بھلا ان قیود کا تحمل کہاں کر سکتی ہے، لیکن رشید صاحب کی معجز نگاری نے ان پابندیوں میں بھی اپنے کمال کو برقرار رکھا اور اس ضخیم مجموعہ کے ہر ہر صفحہ کو زعفران زار بنائے رکھا ہے - بھرتی کا صفحہ تو شاید کوئی بھی نہ ملے، اور بعض خاکے تو خاص طور پر دلچسپ و پُر لطف ہیں، ایسے

---

[1] صدق ۲۲ دسمبر ۱۹۴۵ء

کہ پڑھنے والے اُنہیں بار بار پڑھیں گے۔ کتاب عوام اور کم استعداد سواد خوانوں کے کام کی نہیں۔ یہ عیب ہو یا ہنر، بہرحال واقعہ یہ ہے کہ "رشیدیات" سے لطف اُٹھانے کے لئے پڑھنے والے کو اچھا خاصہ پڑھا لکھا ہونا چاہیئے۔ ادبی اور شخصی تلمیحات بکثرت ہوتی ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ ادب اُردو کے ہر صاحب ذوق شائق یا طالب علم کے مطالعہ کی میز پر نظر آئے۔ مکتبہ جامعہ نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اُردو کی ایک خدمت انجام دی ہے۔

(۲) گنجہائے گرانمایہ[۱]:۔

از جناب رشید احمد صاحب صدیقی۔ ضخامت ۲۱۹ صفحے۔ قیمت ۶؍

پتہ:۔ اُردو بک ایجنسی علیگڈھ۔

خنداں کے بعد گریاں! رشید صدیقی کا نام سب جانتے ہیں، یہ علم کم لوگوں کو ہوگا کہ وہ اگر ہنس سکتے اور ہنسا سکتے ہیں، تو رو بھی سکتے ہیں اور رُلا بھی سکتے ہیں۔ انکے مزاحیہ مضامین کے مجموعے پہلے نکل چکے ہیں۔ یہ تازہ مجموعہ اُن کے تعزیتی مضامین کا ہے ـــــ ظریف کے آنسو، آنسو نہیں، موتی کے دانے ہوتے ہیں ـــــ اُردو کا یہ شوخ نگار آج سوگوار ہے، اپنے محبوبوں کے مزار پر عقیدت و محبت کے پھول ہاتھ میں لئے فاتحہ پڑھنے نکلا ہے! اس کا اُداس چہرہ، اس کا اُداس بشرہ، اس کا حسرت انگیز لہجہ سب قابلِ دید ہیں۔

محبوبوں کے نام آپ سُنیں گے؟ ان میں سے بعض تو یقیناً آپ کے بھی محبوب ہوں گے۔ محمد علی[۱]۔ ڈاکٹر انصاری[۲]۔ مولانا سلیمان اشرف[۳]۔ مولانا ابوبکر محمد شیث[۴]۔ اصغر گونڈوی[۵]۔ ایوب عباسی[۶]

---

[۱] صدق، ستمبر ۱۹۴۲ء

اقبال۔ احسن مارہروی ۔ اقبال، محمد علی، انصاری کو تو ایک دنیا جانتی ہے، اصغر بھی کچھ ایسے گمنام نہیں۔ دونوں مولانا بھی علیگڈھ کے حلقہ میں خوب مشہور، صرف ایک ایوب عباسی سے دنیا ناواقف تھی، اب واقف ہوجائے گی۔

مضمون بڑا کوئی بھی نہیں۔ سب لکھے ہوئے ہیں، لکھوائے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن محمد علی رح والا مضمون، مختصر ہونے کے باوجود سب میں ممتاز ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ لکھنے والے کے لئے باعث فخر بھی، موجب اجر بھی، ایک بار سچ مرحوم میں نکل بھی چکا ہے۔ مستحق اس کا ہے کہ دوبارہ چھپے، بار بار چھپے،

کتاب سب کے پڑھنے کے قابل ہے، نوجوان طلبہ کے لئے خصوصاً وہ دیکھیں اور سمجھیں، کہ جو قلم لطیف مزاج پر قادر ہے، وہ تعزیت سے معذور نہیں، اور جو قلم لطف و مسرت کی گدگداہٹ کا خزانہ ہے، وہ درد و غم کی بھی کسک سے خالی نہیں! ـــــــ ادیب بننے سے پہلے شریف ہونا ضروری ہے، اور یہ کتاب ایک خادم ادب کی شرافت کی دستاویز ہے۔

---

(۱) ہم اور وہ:۔[1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی ۔ضخامت ۱۲۸ صفحات ۔قیمت ۱۲ر

پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی (خود مصنف سے بھی مٹیا محل ۔دہلی کے پتہ پر ملجائے گی)

"قدیم" و "جدید" کی بحث اب خود قدیم ہو چکی ہے ، اور کوئی جدت اس میں باقی نہیں رہی ۔ اس پر بھی جب کوئی زندہ شخصیت اس میں حصہ لیتی ہے ، تو بحث کی مُردہ ہڈیوں میں نئے سرے سے جان پڑ جاتی ہے ، مدت سے کہا یہ جا رہا تھا کہ دلّی اب دِلّی والوں سے خالی ہو گئی اور زباندانی اس خطہ سے رخصت ہو گئی "ہم اور وہ" نے ثابت کر دیا کہ دِلّی میں دِلّی والے اب بھی پڑے ہوئے ہیں اور دِلّی کی زبان اب بھی ماشاءاللہ اسی آب و تاب سے ، اسی آن و بان سے زندہ ہے ، قائم و پائندہ ہے ، درخشاں و تابندہ ہے ، مصنف نے ایک اچھوتے طرز پر قدیم و جدید کی بحث کو اٹھایا ہے ، اور محاکمہ کا حق ادا کر دیا ہے ۔ نتائج تک پہنچتے پہنچتے ممکن ہے کہ قلم کا رُخ کہیں کہیں غلو و مبالغہ کی جانب جھک گیا ہو ، لیکن بحیثیت مجموعی بات جو بھی کہی ہے ، سچی ، کھری ، سیدھی ، خدا لگتی ۔ اور حسنِ بیان و لطفِ زبان کے لحاظ سے تو اپنی نظیر آپ ، فصاحت سطر سطر پر بلائیں لیتی جاتی ، اور بلاغت قدم قدم پر نثار ہوتی جاتی ہے حسن انشاء کا ایسا نمونہ دیکھنے کو اب آنکھیں ترسا کرتی ہیں ۔ اللہ ان کی عمر میں بہت بہت برکت ، اُن کے قلم کو بہت بہت قوت عطا کرے ، کہ گلشن اُردو کو ایسی ہی نہروں سے سیرابی کی ضرورت ابھی مدتوں باقی رہے گی ۔

---

[1] صدق ، ۲۸ ؍ اکتوبر ۱۹۴۰ء

(۲) دِلّی کا سنبھالا:-[1]

از خواجہ محمد شفیع دہلوی - ۱۵۰ صفحے، مجلد قیمت عمر پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی

کتاب کا تعارف ذرا مشکل ہے۔ بس یہ سمجھ لیا جائے کہ گویا ایک آئینہ ہے جس میں اگلے دِلّی والوں (کچھ دِلّی والیوں کی بھی) کی زندہ تصویریں چلتی پھرتی، بولتی چالتی نظر آرہی ہیں - اور پھر اس مجمع میں سب ہی طرح کے لوگ ہیں، عالم و فاضل بھی، اور رند و اوباش بھی، زاہد و مرتاض بھی، اور شوخ و طرار بھی - ایک طرف شاہ عبدالقادرؒ شاہ عبدالعزیزؒ شاہ رفیع الدینؒ، اسمٰعیل شہیدؒ اور سر سید، حالی، نذیر احمد، حکیم محمود خاں، تو دوسری طرف فلاں گویے، اور فلاں ستار نواز اور اور فلاں بی صاحبہ، مصنف کا مقصد تاریخ نگاری نہیں، اس لئے ایسی فروگذاشتوں کو نظرانداز کیجئے کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے "علم جہاد" حکومت برطانیہ کے خلاف بلند کیا تھا (ص ۱۱۱) مصنف کا مقصد اپنی زباندانی کا جوہر دکھانا اور پرانی دِلّی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچ دینا ہے، اور ان دونوں مقصدوں میں وہ اس طرح کامیاب رہے ہیں کہ گویا امتحان کے پرچہ میں سَو نمبروں میں پورے سَو پالئے ہیں۔ زبان کی صحت اور زبان کا حُسن، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو اہلِ قلم دلچسپ فقرے لکھ لیتے ہیں، وہ ترکیبوں، محاوروں، بندشوں کی صحت ادا پر بھی قادر ہوں۔ دونوں کا اجتماع اس وقت کے اردو لکھنے والوں میں خال ہی خال نظر آتا ہے۔

—— خواجہ شفیع صاحب اِن مستثنیٰ مثالوں میں سے ایک ہیں۔

اور پھر اسلوب بیان کی دلکشی نہیں دلبری، اس پر قیامت۔ یہ ممکن نہیں کہیں سے کوئی

---

[1] صدق، ۱۴؍اپریل ۱۹۴۱ء

صفحہ کھل جائے اور پھر ختم کئے بغیر آپ کا چھوڑنے کو جی چاہے، ایک دو منظروں پر نگاہ چلتی سی ڈالتے چلئیے :-

"اہلِ دربار مودب کھڑے ہو گئے، دِلی ماتا نے تعظیم دی - یہ کون تین بھائی آرہے ہیں کہ ملاء اعلےٰ طبقات نور لیے ساتھ ساتھ ہیں، نقیب نے آواز دی مولانا شاہ عبد القادر صاحب مترجم کلام پاک، مولانا شاہ عبد العزیز صاحب، تفسیر فتح العزیز کے مؤلف، مولانا شاہ رفیع الدین صاحب -

بھاٹ نے عرض کی ۔

خاموشی در ثنائے تو حد ثنائے تست

رفعتِ علم تا لبِ فرش لینے آئی، صفِ علماء میں مرتبہ بلند پر لے جا بٹھایا مولوی میاں نذیر حسین اپنے معتقدین کے ہمراہ دفاترِ احادیث مقدسہ لئے تشریف لائے - درجۂ اعلےٰ پر بصد ادب بٹھائے گئے - شاہ اسمٰعیل صاحب صراط المستقیم کی تلقین فرماتے تشریف لائے - اہلِ دربار نے تعظیم دی - دِلی ماتا نے بنظرِ عنایت دیکھا اور کہا سر بر خود شہادت پر تو فگن ہے - ان کا مستقبل شاد - منجم قدرت نے دلی ماتا کی پیشگوئی کی شہادت دی "

علم و تقدس کی اس شہ نشیں سے اتر کر اب ضلع جگت کے میدان میں آئیے :

"روز محفل آراستہ ہوتی ہے - شہر بھر کے تیز طرار شوخ گفتار جمع ہوتے اکثر زبان دراز دور دور سے مقابلہ کے لئے آتے ہیں، استادی کی سب سے چھوٹ ہوتی ہے، جو منہ آتا ہے منہ کی کھاتا ہے - ظالم ایسا نہ ایک فقرہ ایسا چست کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منہ زور منہ دیکھتا رہ جاتا ہے

جواب نہیں بن پڑتا، اپنا سا مُنہ لے کر چلا جاتا ہے۔ اُستاد چلتے چلتے فقرہ
کستا ہے۔ دیکھنے جیسے بیٹھ دکھائی، ایسے منہ بھی دکھانا، پھر بھی آنا۔ جو
ایک دفعہ مقابلہ پر آجاتا ہے، اُس کا پھر منہ نہیں پڑتا کہ منہ دکھائے
اُستاد ایسا منہ توڑ دندان شکن فقرہ کہتا ہے کہ منہ پھیر دیتا ہے"۔
زبان وادب کے معیار سے ایسی کتاب مدّت کے بعد دیکھنے میں آئی اور عام متفرق معلومات کے لحاظ
سے بھی کتاب گھٹیا نہیں۔

(۳) شرح درد[1]

از:۔ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، ۲۴۰ صفحے قیمت عہ۔ خود مصنّف سے
مٹیا محل کے پتہ سے ملے گی۔

خواجہ محمد شفیع دلی کے رہنے والے ہیں۔ اور نئی دلی کے دور میں پُرانی دلی کی یاد تازہ رکھنے والے
خواجہ میر درد کے کلام کی یہ شرح، شرح درد، اپنے رنگ میں فرد۔ خود اُنہیں کے قلم کی ہے۔
کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہی ہے، شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہے کہ فصاحت
لوٹی جاتی ہے، بلاغت قدم چومتی جاتی ہے۔ دیباچہ کی ابتدا کھجور کے درخت سے ہوتی ہے! جی ہاں
کھجور کے درخت سے! ان رسیلی ناشپتی، شیرہ ٹپکتی ہوئی لال لال کھجوروں کا مزہ تو بعد کو چکھیے گا۔
ابھی ذرا ہری بھری ٹہنیوں، خوشوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی سیر کرتے چلیے:
"صحرائے عرب کا نخل، کھجور کا درخت، ہر رگ و ریشہ کام کا، پھول پتی کارآمد، پھل غذا

---

[1] صدق ۷ نومبر ۱۹۴۱ء

گٹھلی دوا۔ جڑیں مضبوط۔ بلند و بالا۔[2] استوار۔[3] باد سموم[4] کے تھپیڑوں سے جھک جائے۔ دم کے دم سے یں پھر سیدھا۔ مرکز[5] سے جنبش نہیں۔[6] اپنی بقا کے لئے کم از کم کا طالب، دوسروں کی بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ حیات بخش، فروعات[8] سے معرّیٰ۔ چوٹی[9] پر ایک گتھا ہوا گلدستہ، پھول پھل سب ایک جگہ، یک جہتی اور سلوک کا نمونہ، سایہ دُور[10] تک پھیلے۔ جگہ کم سے کم گھیرے۔ برگ و بار[11] کی ہر فصل یا ہر نسل اس کو ایک تپوری بلند کر جائے۔ خود سپرد[12] خاک ہو، کھاد بن جائے، آنے والوں کے لئے بلند تر مقام کی بنا بنے"۔ (صفا)

بارہ[12] کی اس گنتی میں ماہ ربیع کی بارھویں کی بہار۔ بارہ[12] برجوں کے خالق کی قدرت کا رمز اس سے آشکار۔ نئی تشبیب اور نئی گریز مجاز سے حقیقت کی طرف آئیے، اور لفظی بندشوں میں معنویت کی مٹھاس پائیے:۔

"جس خطّہ نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا، اسی دیس سے ایک دین چلا۔ کار آمد[1] فطری اصول کا حامل۔ قوی الاساس[2]۔ رفیع[3] النظر راستی و راست[4] بازی کا حامل۔ دب[5] دب کر ابھرنے والا۔ مرکز[6] سے نہ ہلنے والا۔ آسانیاں[7] اور فراخیاں بہم پہنچانے والا، لیکن تسلیم و رضا کا طلبگار۔ فرقہ بندی[8] سے غیر متاثر۔ وحدت[9] کا پرستار، مرکزیت کا دلدادہ، اتفاق کا حامی، رسم[10] و رواج کی پہنائیوں سے معرّیٰ، ہلکا پھلکا دُور رس ترقی[11] کا راستہ دکھانے والا۔ فنا[12] میں بقا کا سبق دینے والا۔ یہ وہ مذاہب تھا جو رسول عربیؐ لے کر آئے"۔ (صفا)

زبان کی ان لطافتوں ادب کی ان نزاکتوں کی جو قدر نہ کرے وہ یقیناً اُردو کے بارہ بچھر سے باہر

(۴) ناکام[1] :-

از خواجہ محمد شفیع دہلوی، ضخامت سو صفحے، قیمت ۱۲ آنے
مصنف ہی کے پاس سے ملیا محل دہلی کے پتہ سے ملجائیگی۔

دہلی کے جدید انشا پرداز خواجہ محمد شفیع کا نام اب نہ ادب کے طلبہ کے لئے نامانوس رہا ہے، نہ ناظرین صدق کے لئے۔ ناکام اُن کا تازہ ترین افادۂ قلم ہے، سرسری نظر میں ایک دلکش افسانہ، گہری نظر میں حکمت و اخلاق کا خزانہ۔ اور ہر صورت میں ادب و انشا کا ایک گنج شائگان۔ زہرہ ایک مشہور بیسوا ہے، اور حسین و حاضر جواب مغنیہ، اس کا سابقہ ایک نوجوان کاظم سے پڑ گیا ہے کاظم ذہانت میں فرد۔ حاضر جوابی میں استاد، ہر رنگ میں رنگا ہوا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہوئے، لیکن اپنے کو لئے دیتے ہوئے، نفس کو قابو میں کئے ہوئے۔ اس کا دل اُس کے کہے میں، وہ خود دل کے کہے میں نہیں۔ بیسوا نے خوب خوب کمندیں پھینکیں، ہر ہر طرح جال ڈالے، وہ ظالم ایک بار بھی نہ پھنسا، ہر بار خود شکاری ہی کو شکار کرتا گیا، اور چوٹ کھائے ہوئے غرور و تمکنت کو چر کے پر چرکے دیتا گیا، لفظ و عبارت میں مے و شاہد کی وہ سخن آرائیاں کہ دھوکا دیوان حافظ کا ہونے لگے، معنی و مفہوم میں اخلاق و موعظت کی وہ گل فشانیاں کہ گمان گلستان سعدی کا گذرنے لگے۔

زبان کے جوہر دیکھنے ہوں، تو کاظم کا معرکہ ایک رئیس کی محفل میں میراثی صاحب سے ملاحظہ ہو، رئیس صاحب اپنی بے فنی اور بدآوازی پر نازاں، سرِ محفل جنگھاڑ رہے ہیں، ساری محفل اُن کے بنانے یا داد دینے پر متوجہ، چوٹیں کاظم اور میراثی کے درمیان چلنے لگیں، ہلکی سی جھلک

---

[1] صدق ۲۳ر فروری ۱۹۴۱ء

دیکھتے چلیے:۔

"میراثی پھیکا پڑا جا رہا تھا، ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا، دماغ سے اُتار اُتار کر باتیں لا رہا تھا۔ بولا "سرکار شانوں سے سُر نکل رہے ہیں" کاظم نے کہا۔ "عالی جاہ مجسم موسیقی ہیں، ہر بُن مو سے سُر برس رہے ہیں"۔ میراثی نے بہت زور مارا، باپ دادا کی ساری طاقت سے کام لے کر کہا "سرکار شاہِ موسیقی ہیں"۔ وہ حاضر دماغ بولا "عالیجاہ شہنشاہ موسیقی ہیں، طن دا دِی پائی ہے، اس فن کے پیغمبر ہیں"۔ میراثی نے زمین پر ہاتھ ٹکا دیئے اور بولا "تان سین قبر میں پڑا تڑپ رہا ہے"۔ کاظم نے عرض کیا "بیجو باورے کی روح قدم بوس ہونے آئی ہے، اگر ہاروت کو یہ فن آتا تو زہرہ کے راگ میں نہ آتا۔ سُر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، موسیقی دامن سے وابستہ سرکار راجہ اندر ہیں، موسیقی آپ کے دم قدم سے ہے، اعجاز ہے اعجاز شجر و حجر جھوم رہے ہیں، مردہ دل زندہ ہوئے جاتے ہیں، سُر نہیں نفس عیسوی ہیں"۔ میراثی کچھ بھی ہو، میراثی تھا۔ ناٹر توڑ فقرے سُن کر تیورا سا گیا۔ جب زبان نہ چلی تو سر پیٹنا شروع کیا، اور لگا حال کھیلنے یہ روگ کاظم کے بس کا نہ تھا، میدان جاتا نظر آیا، بازی ہرتی نظر آئی۔ پروا رے دماغ، فوراً بولا "سُروں کا زور ہے، آگ لگ جائے گی، پانی ڈالو، جلدی کرو"۔ اور ساتھ ہی ساتھ برف کے پانی کا بھرا ہوا جگ اٹھا بدنصیب میراثی پر ڈال دیا۔ میراثی حال سے بے حال ہوگیا گھگھی بندھ گئی"۔

(ص ۴۸ و ص ۴۹)

گنہ گار عورت کے دِل کی چُبھن دیکھنا ہو تو ورق اُلٹیے ، بیسوا کے کوٹھے پر کسی نے

ایک پُر اثر قِصّہ میں مناسب تمہید کے بعد ، اکبر کا یہ شعر سنا دیا ہے ؎

؎ کون خوش بخت زمانہ میں ہے گوہر کے سوا

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اس پر بیسوا کے تاثرات :-

- کان یہ سُن رہے تھے ، آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی ، اپنے مناظر پیش کر رہی تھی ، اور میں اس تماشہ میں غرق تھی ، ایک عجیب لُطف تھا عجب کھٹک تھی ، نرالی کاوش تھی ، اچھوتی خراش - میں ان کیفیات میں ایسی محو تھی جیسے بھوکا روٹی کے تصور میں ، بانجھ اولاد کے خیال میں - سینہ میں ایک چیز تھی جو کچھ مانگ رہی تھی ، پہلو میں ایک خلا تھا ، جو آج میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا - میرا ہر قطرۂ خون کسی کی تلاش میں رواں ، میری نسائی فطرت میں ایک طوفان بپا تھا ، آج مجھ میں وہ عورت جاگ اٹھی تھی جو بیوی بننے پیدا ہوئی ہے ، جو ماں بننے پیدا ہوئی ہے ، آج وہ خلقت انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے افیون دے کر سلا دیا گیا تھا - آج وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی تھی جس کو کذب و ریا اور غلط قصا کے انبار میں دبا دیا گیا تھا - زندگی کا جامہ چاک کر کے عورت برآمد ہونے کو تھی ، عورت جو کھونے کو پانا سمجھتی ہے ، عورت جو اپنا خون چوسا کر نسلِ انسانی کو پالتی ہے - عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے - عورت جو ماں سے تعبیر کی گئی ہے - میں آدم و حوا کے نمائندوں کو دیکھ رہی تھی

آج میں فطرت ہی فطرت تھی، ماحول سے مبرا فضا سے بالاتر" (ص ۱۸)

غرض کتاب کیا ہے ایک اعجوبہ، صورت رندوں کی، سیرت زاہدوں کی، چہرہ پر شوخی وظرافت کی نقاب، نقاب کے اندر پیشانی پر زہد کے سجدوں کے نشان، بیسویں صدی کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں جانے کے قابل۔ افسانہ نام کا "ناکام" لیکن ہر اعتبار سے کامیاب۔

(۵) نزولِ رحمت معروف بہ میلاد شریف:۔

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی قیمت ۴ر، ملنے کا پتہ (۱) خو۔ مصنف ٹیا محل دہلی (۲) مکتبہ جامعہ دہلی، لکھنؤ، بمبئی وغیرہ۔

دہلی کا ہونہار اور مشہور انشاپرداز خواجہ محمد شفیع، مولوی بن، چوکی بچھا، لوبان لگا، اگر کی بتی جلا، خوش عقیدگی کا چغہ پہن پہنا، حسنِ عقیدت کا کیوڑہ گلاب چھڑک چھڑکا، محفل میلاد پڑھنے بیٹھا ہے، اور ختم محفل کے بعد جب تبرک کی تقسیم کا وقت آیا، تو حلقۂ مصدق کو بھی اس کی سوابیت نظر انداز کر کراکر، محروم رکھنا گوارا نہ کیا ــــــ

خواجہ کے منہ سے نکلے ہوئے بول، یوں بھی آپ واقف ہیں، کیسے ہوگئے ہیں؛ میٹھے رسیلے، سُریلے، پھر جب ذکر بھی ٹھہرا، عزیز لذیذ، دلپذیر، محفل میں آ بیٹھنے والے خود تجربہ کر کے دیکھیں۔ بہتوں کے عجب نہیں کچھ عقائد ہی درست ہو جائیں، بہتوں کے کان میں کام کی باتیں پڑ جائیں اور جی تو یقین ہے کہ سب ہی کا لگ جائے ــــ مشک کے اوصاف عطار کی زبان سے سننے میں لطف ہی کیا ہے ــ ایک ذری سا نمونہ ہتھیلی پر رکھ کر خود ہی سونگھ لیجئے نہ؟ :۔

مصدق ۴ جنوری ۱۹۴۲ء

"اہلِ عرب کی عقلوں پر بت پرستی کے پتھر پڑے تھے، ہٹ دھرمی، ضد اور بے جا بہادری کے فولادی خود دماغوں پر چڑھے تھے۔ حرص و ہوا کی سیاہی اُن کے دلوں پر طاری تھی۔ جوئے نے اُن کی قسمت کا پانسہ پلٹ رکھا تھا، عیش پرستی نے اُن کو اندھا کر دیا تھا . . . . یہ دور روزہ آنی جانی بزرگی و برتری کے دلدادہ مخالفتِ اسلام پر آمادہ ہو گئے، ایک طرف مٹھی بھر کلمہ گو، دوسری طرف جاہلوں کے جتھے، ظالموں کے گروہ۔ گو بظاہر شیر بکری کی لڑائی تھی، لیکن اس بکری کا رکھوالا، زمانہ بھر کا پالنہار، وہ آقائے روزگار تھا جسے وہ رکھے اُسے کون چکھے، نہ دشمنوں نے اپنی کسنی میں کوئی کسر رکھی، نہ دوست نے دوستداری میں ؎

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

خدا کے ہاتھوں صحابہؓ کی کوشش سے اسلام کی کھیتی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی، کفار مکہ نے سخت ظلم ڈھائے، بڑے بڑے فساد مچائے سیلِ فنا کی طرح چڑھ چڑھ کر آئے، لیکن یہ اسلام کی دیوار نمک کی نہ تھی جو بہ جاتی۔ ہر ریلے کے بعد پختہ سے پختہ ہوتی گئی۔ مشرکین نے اہلِ دین پر جو ظلم توڑے، اور جیسی جیسی آفتیں ڈھائیں، اُن کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے اور بیان سے دل دہلتا ہے"[1] (ص۳۵، ص۳۷)

چلیئے میلاد خواں کی آواز کان میں پڑ گئی اور آپ بھی داخل حسنات ہو لیتے جی لگا ہو تو محفل میں شروع سے آخر تک شریک رہیں سودا کل چار یا پانچ آنے کے ٹکٹ میں مہنگا تو ہرگز نہیں

(۶) چند افسانے :-

از :- خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، ۱۰۸ صفحے مجلد قیمت ایک روپیہ

[1] صدق ۸ر مارچ ۱۹۴۳ء

پتہ :- اردو مجلس، مٹیا محل دہلی۔

دہلی کے سحر طراز انشاپرداز، اہلِ زبان خواجہ شفیع سلمہ، اب اس منزل سے گزر چکے ہیں کہ ان کی نئی کتاب کے تفصیلی تعارف کی ضرورت ہو، اب اُن کا نام خود ہی ایک مکمل تعارف ہے، مضمون کے پاکیزہ، شستہ و لطیف ہونے کی ضمانت، زبان کی صحت، سلاست و شیرینی کی دستاویز!

مجموعہ —— جس میں آپ اُسے گلدستہ کے نام سے پکاریے —— بیس دو نظمیں ہیں اور کوئی دس بارہ ہلکے پھلکے افسانے، پُر بہار جیسے موسم گل - دلآویز جیسے نغمۂ بلبل، افسانوں کے پلاٹ کہیں مسجد و خانقاہ کے نہیں۔ وہی بازاروں کے اور ہوٹلوں کے، کالج کے لڑکوں کے، اور بیسواؤں کے کوٹھوں کے۔ لیکن مجال کیا جو دامنِ خیال بھی معصیت سے آلودہ ہونے پائے، اور طبیعت کی پاکیزگی پر کوئی داغ دھبہ فحش و ابتذال کا پڑنے پائے، خواجہ اپنے ہاتھوں سے خوب بھر بھر کر آپ کو پلائیں گے۔ گلاس پر گلاس چھلکائیں گے، بوتل پر بوتل لنڈھائیں گے - آخر میں آپ کی زبان سے نکلے گا تو یہ کہ سبحان اللہ یہ تو عجب اسرار تھا۔ کلوار کی بھٹی کی جگہ جنت الفردوس میں پہنچ گئے، اور لیبل دیکھ کر جن شیشوں پر جانی واکر (ولائتی شراب کے ایک مشہور و قدیم کارخانہ کا نام ہے) کے قدحوں کا گمان تھا، وہ شراب طہور کے جام نکلے! زبان خاص الخاص دہلی کی مستند اور ٹکسالی، اور ادب سے مذاق رکھنے والوں کے حق میں ایک نعمت —— البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کتاب "عوام پسند" طبقہ میں شامل ہونے کے قابل نہیں، اچھی خاصی تعداد، اور اردو کے نسبتہً بلند مذاق کے بغیر کتاب پڑھنے والے کوئی خاص لطف شاید نہ محسوس کر سکیں:

شیش محل[1]

از شوکت تھانوی ضخامت ۲۴۰ صفحے قیمت عـ۸/ مجلد گرد پوش،

پتہ :- اردو بک اسٹال، لوہاری دروازہ، لاہور

شوخ نگاری و ظرافت دوسروں کے لئے، پطرس بلکہ رشید صدیقی تک کے لئے ایک مشغلہ تفریح رہی ہے۔ شوکت نے اسے اپنا مستقل فن بنا لیا ہے، اور قدرتاً ان کی نگاہ ایک فن کار کی نگاہ ہو گئی ہے، ان کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے۔

"شیش محل" ان کے مطالعہ بشری کا ثمرہ ہے، اپنے ملنے والوں میں سے ۱۱۲ کے چہرے حروف تہجی کی ترتیب سے انہوں نے اس قلمی آئینہ میں دکھا دیتے ہیں، سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں، یہ اور بات ہے کہ افراط نازک خیالی سے کہیں صرف کتب فروشی کو بھی اسی تعلق کے لئے کافی سمجھ لیا گیا ہے! یہ قلمی نگار خانہ یوں کہئے کہ ایک عجائب خانہ ہے۔ بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین۔ بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول! ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی۔ بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں، بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں، ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی، ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں، غرض ریاض خیرآبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی سے لے کر افقر موہانی، امید امیٹھوی اور صدیق بکڈپو تک ہر ردیف ہر قافیہ، ہر وزن ہر بحر کے نمونے اس دیوان میں موجود، با شاعر کہیں تو خالی مصرعہ طرح پڑھ کر چپ ہو گیا ہے اور کہیں دو غزلہ بلکہ سہ غزلہ چھیڑ دیا ہے!

نگار خانہ ظریف کا ہے۔ مزاح و شوخی ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت و صداقت بھی

---

[1] صدق جلد ۹ نمبر ۲۶ یکم نومبر ۱۹۴۳ء

عموماً دوش بدوش "عموماً" کا لفظ خیال میں رہے۔ ظرافت کی گلکاریاں، شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں

مورخ کے کیمرے اور فوٹوگرافی کی قائم مقام نہیں ہوسکتیں ــــــ چہرے یقیناً دلچسپ، دلکش

یقیناً سب کے ہیں۔ اور یہی فن کار کا کمال ہے، البتہ کسی کا چہرہ اترا ہوا، کوئی ذرا لٹکا ہوا، کسی

پر رعنائی و زیبائی کا نقاب پڑا ہوا، کسی پر روغن حسن افزا کا غازہ پھرا، کسی کی پیشانی پر

شکن، کسی کے چشم و ابرو پر غضب کا بانکپن۔

ظریف نے ہنسنے ہنسانے کا سامان قدم قدم پر کیا ہے، لیکن کہیں کہیں اندازہ کرنے

میں خود بھی غچہ کھا گیا ہے، نازک خیال اور پھر لکھنؤ و جوار لکھنؤ کے نازک خیال، نازک مزاج

بھی کچھ کم ہوتے ہیں؛

حسن اور اُس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم

لیکن معاملہ دوسرا ہے، خوب کیا شوکت صاحب نے دیباچہ ہی میں سب سے معافی مانگ لی،

ورنہ عجب نہیں جو "بزم" "رزم" میں تبدیل ہو کر رہتی اور

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

کی شاعری حقیقت بن کر رہتی (یہ اسد خدانخواستہ اسد اللہ خاں غالب نہیں، وہ دوسرے

بزرگ ہیں جن کا یہ مصرعہ شہرت دوام حاصل کئے ہوئے ہے ع ــــــ

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی)

صلا سے حلا تک ایک بزرگوار کا ذکر جس رنگ میں ہے، یقین تو ہے کہ شوکت صاحب نے بازو

پر امام ضامن باندھ کر لکھا ہوا ــــــ "شیش محل" پر بے تحاشا پتھراؤ اس کے بعد کچھ بھی بعید

نہیں رہ جاتا ہے؛

یہ چیز محض تفریح اور دل لگی کی نہیں۔ کل اسی سے بڑے بڑے سنجیدہ مورخ

خوشہ چینی کریں گے ۔ آخر آج بھی کتاب الاغانی کے حوالے کس شد و مد کے ساتھ مغرب و مشرق کے بڑے بڑے سنجیدہ مورخ دے رہے ہیں ۔ پھر کیا یہ ادیب اور شاعران گویوں، سازندوں، اور ڈھاڑیوں سے بھی گئے گذرے ہوئے ۔

کمی اور بڑی کمی اس کتاب میں یہ ہے کہ نگارخانہ خود مصور کے مرقع سے خالی ہے ۔ مجنوں کا ڈراما بغیر مجنوں کے پارٹ کے ! بارات بغیر نوشہ کے ! غرض دعویٰ بغیر تعلم خود کے ظریف کی ستم ظریفی !

اعمال نامہ[1] :-

از سر سید رضا علی ایم ، ایل رائے ، ضخامت ۵۲۷ صفحے تقطیع ۲۶×۲۰
مجلد مع تصاویر ، قیمت آٹھ روپے ، پتہ : ہندوستانی پبلشرز دہلی ،

اعمال نامہ ! نام سنکر ذہن پولیس اور تھانہ کی طرف منتقل نہو اور نہ پھر کراماً کاتبین کے نامۂ اعمال کی طرف ! کتاب کا تعلق ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں ۔ ایک زندہ دل علیگڈھی کی کہانی اس کی زبانی ہے ، اور بہتر ہوتا کہ یہی عبارت اندرونی سرورق پر بطور کتاب کے عنوان تحتانی کے لکھ دی جاتی ۔

مرادآباد کے سید رضا علی سے علی گڈھ کے حلقہ میں کون ناواقف ہے ؛ بڑے مچلے بڑے ہونہار شروع ہی سے تھے ۔ بی ۔ اے کیا ، ایل ، ایل بی ہوئے محسن الملک مرحوم کے پرائیویٹ سکریٹری رہے ، وکالت میں نام پیدا کیا ۔ لیگ کے سلسلہ میں شہرت حاصل کی ۔ قومی لیڈری اور

---

[1] صدق جلد ۹ ، نمبر ۴۸ ، ۲۰ مارچ ۱۹۴۴ء

سرکاری جاہ و منصب کے اونچے اونچے مرتبے طے کرتے ہوئے اب "سر" ہیں، سی، بی، ای ہیں سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں، مسلم لیگ کے سابق صدر ہیں، وقس علی ہذا —— اور اب جاکر یہ کھلا کہ قانون اور سیاست کی خشکیوں کے باوجود یہ "بوڑھا لڑکا" (کسی نے "اولڈ بوائے" کا یہ ترجمہ خوب کیا ہے!) ایک خوش ذوق، سخن فہم اور اچھا خاصہ اہل قلم بھی ہے! ——

وہ نام خدا شعر بھی کرنے لگے موزوں

افسانۂ حیات موثر و دلچسپ کس کا نہیں ہوتا، بشرطیکہ اپنی بدمذاقیوں سے خود ہی تاثیر اور دلچسپی کا خون نہ کر دیا جائے، اور پھر یہ تو محض آپ بیتی نہیں جگ بیتی بھی ہے، محسن الملک، اور وقار الملک، جسٹس محمود اور بک اور مارسین سر علی امام، مظہر الحق، راجہ صاحب محمود آباد، نواب صاحب ڈھاکہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی، محمد علی شوکت علی سے لے کر کلکتہ کی مشہور مغنیہ تک خدا معلوم کتنوں کی قلمی تصویریں آپ کو اس مرقع میں ملیں گی، اور کتاب کہنا چاہیے کہ انگریزی تعلیم یافتہ اسلامی ہند کی چالیس پچاس برس کی ایک سرسری تاریخ بن گئی ہے، مگر ایسی تاریخ جس میں قدم قدم پر شعر و ادب مداخلت کرتے نظر آ رہے ہیں، شاید "مداخلت بے جا" کی حد تک!

سید صاحب مذہباً شیعہ ہیں مگر ایسے شیعہ جو سنیوں میں گھلے ملے ہوئے ہیں، اور یہ اثر ایک تو علیگڈھ کی تربیت کا ہے، اور پھر اس کا بھی کہ ان کے بزرگوں میں اہل سنت بھی رہے ہیں، سید صاحب کسی تجدد سے بھی متاثر ہیں، پردہ کی بحث میں کھل کھیلے ہیں، لیکن ان کا تجدد کچھ بجھا ہوا سا ہے، اکبر مراد آبادی کی طرح جو ہندوستان میں اس مسلک کے نقیب ہیں، ان کا تجدد نہ خود مشتعل ہے نہ دوسروں کے لیے اشتعال انگیز اور صبر آزما، سیاسیات میں بھی سید صاحب کی روش کچھ مرنجاں مرنج سی ہے، کہیں کہیں گرما گرم بھی، لیکن بحیثیت مجموعی سب کو

سموئے ہوئے، مروّت کی نظریں ہر طرف کئے ہوئے، کتاب حسنِ ترتیب کے اعتبار سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں، خلط مبحث جا بجا ہو گیا ہے، لیکن حسنِ ترتیب ہے بھی مشکل چیز، اور کہنہ مشقی کے بعد ہی میسر آتا ہے، جو پیشہ ور مصنف نہیں، اُن کے ہاں آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، کتاب متفرق معلومات کے کشکول کی حیثیت سے بڑی دلچسپ اور پُر لطف ہے، اور شعر و ادب کے بکثرت مباحث میں کہیں کہیں تو سید صاحب بڑے پتہ کی کہہ گئے ہیں، کاش ادب ہی کو انہوں نے اپنا مستقل موضوع رکھا ہوتا! ——— ایک بڑی بات، ہندوستان کی موجودہ ذہنی فضا کے لحاظ سے بہت بڑی بات، یہ ہے کہ کتاب سوانح عمری محض دماغ کی نہیں، بلکہ دل کی بھی ہے "گفتنی" کی نغز نکات کے ساتھ ساتھ اشارات "گفتنی" کے بھی جا بجا پھیلے ہوئے ہیں اور "بروں در" کی نقاشی کے پہلو میں مصوری "درون خانہ" کی بھی اچھی خاصی ہوتی گئی ہے۔

یہ صرف پہلا حصہ ہے دوسرا حصہ عجب نہیں کہ اس سے دلچسپ تر ہو،

رسالہ کلیم دہلی[1] (ماہوار)

ایڈیٹر جوش صاحب ملیح آبادی، قیمت سالانہ چھ روپے ضخامت ۹۰ صفحے

جوش صاحب اب تک "شاعر انقلاب" تھے، اب کلیم کے صفحات میں داعی انقلاب کی حیثیت سے نظر آ رہے ہیں، وہ پہلے ہی نمبر میں "اردو ادبیات میں انقلاب" کی ضرورت پر ایک "بیچ جوش" مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس کو شروع یوں فرماتے ہیں:۔

"نوع انسان کے مصلح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے۔ انسان انسان کی اصلاح کر سکتا ہے؟ کیا یہ واہمہ نہیں؟

لیکن یہ نہ ارشاد ہوا کہ دعوت اصلاح اگر تمام تر مضحکہ خیز ہے۔ تو دعوت

---

[1] صدق جلد اول نمبر ۳۱، ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء

دعوتِ انقلاب کو سنجیدگی اور حقیقت سے کس قدر تعلق ہے۔

دعوتِ انقلاب بار بار پڑھنے کے بعد بھی "انقلابِ ادبی" کا کوئی نمونہ اس صحیفۂ انقلاب کے اندر نہیں ملتا - اگر یہ کہا جائے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ "بنام قوّت و حیات" کو رائج کر دینا کیا کوئی تھوڑا انقلاب ہے؟ تو عرض ہے کہ قوت یا "شکتی" اور "حیات" کو مستقل دیویاں تو مختلف قومیں مدّتوں سے مانتی چلی آئی ہیں اور ہندوستان میں ان کی پرستش ہزارہا ہزار سال سے چلی آرہی ہے، اس میں "انقلاب" کی کیا بات ہوئی؟ زیادہ سے زیادہ ارتجاع یا ارتدادِ ذہنی کہہ لیجئے - رہیں نیم برہنہ زنانی تصویریں سو یہ شرف بھی لاہور، دہلی وغیرہ کے بعض رسالوں کو مدّت سے حاصل ہے۔ "انقلابیت" اس میں بھی کچھ نہ ٹھہری -

مدیر کلیم کی نثر میں "تازہ کلام" کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا، ہندو، مسلمان دونوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :-

"میں تمہاری صفوں میں سے آندھی کی طرح گزروں گا، تمہارے بے مغز سروں پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا، اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا . . . . . تم پر میرا غیظ و غضب بھرے ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے . . . ! اے مورکھ ہندؤ اور اے نادان مسلمانو! . .

. . . دین دین، دھرم دھرم، کلیجہ پک گیا جاتا ہے، ان چھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے . . . اے دھوتی اور پاجامہ کے گرد ہوا، اے لوٹے اور بدھنے کی انجمنو، اے داڑھی اور چُٹیا کے ادارو تمہاری کس کس حماقت پر رحم کروں گا۔"

یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے، اور یہ گرج اور چمک

اور یہ ہوش ربا تجلیات آتشیں، اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے یہ لن ترانیاں اگر اسم کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے تو انتشار رسا دماغ کوئی کہاں سے لائے۔

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کے، اور بعض دوسرے صاحبوں کے ادبی مضامین اچھے ہیں۔ خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں اگر چاہیں۔

انشا[۱]:-

از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی ۔۷۷ صفحے قیمت ۱۲ آنے

پتہ:- مکتبہ جامعہ قرول باغ دھلی

مشہور صاحب طرز شاعر و نثار، انشاء اللہ خاں انشا کی شاعری پر یہ ایک دلچسپ تبصرہ ہے، اس وقت کے صاحب طرز انشا پرداز مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کے قلم سے ۔۔۔۔۔

دو لفظی تعارف یوں کیجیے کہ "انشا۔ انشا پرداز کی نظر میں"۔

اس سے زیادہ کچھ کھل کر کہنا کتاب کے لطف و لطافت دونوں کو غارت کرنا ہے۔

فرحت کو افسوس ہے کہ اردو دنیا میں وہ وسیع شہرت حاصل نہیں ہوئی، جس کے وہ مستحق ہیں۔

چند ہم عصر[۲]:-

مولوی عبدالحق صاحب کے چند مقالات، مرتبہ شیخ چاند ایم۔ اے مرحوم

---

[۱] صدق جلد ۱۰، نمبر ۱، ۳ جولائی ۱۹۴۴ء [۲] صدق جلد ۱۰، نمبر ۱، ۳ جولائی ۱۹۴۴ء

طبع ثانی ۱۸۸ صفحات - تقطیع ۱۸ × ۲۲ قیمت مجلد ؁ غیر مجلد ؏

پتہ :- انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی۔

یہ ۲۷ معاصرین کے تذکرے اور ان کی زندگیوں پر تبصرے، مولوی عبدالحق صاحب کے قلم سے ہیں۔ معاصرین میں سے اکثر تو مشاہیر بھی ہوئے ہیں، مثلاً امیر مینائی، جسٹس سید محمود، مولانا محمد علی، حالی اور بعض ایسے گمنام جیسے ایک باغ کا مالی نام دیو مالی۔ اور بعض کا شمار نہ مشاہیر میں ہو سکتا ہے۔ نہ گمناموں میں، مثلاً وحید الدین۔

یہ تذکرے زمانہ کا بہت وسیع رقبہ گھیرے ہوئے ہیں یعنی ابتدا ۱۹۰۰ء سے ہوئی ہے اور انتہا ۱۹۴۳ء یہ ظاہر ہے کہ ۴۰، ۴۲ سال کی مدت میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے اور اس کا قلم بھی کیا سے کیا ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ بعض صاحب ایسے تھے جن کے سامنے خود مولوی عبدالحق بچہ تھے مثلاً امیر مینائی - اور بعض ایسے جو خود اُن سے جونیر (چھوٹے) تھے۔ مثلاً محمد علی یا راس سعود پر یہ کتاب کوئی مستقل تصنیف نہیں۔ محض تینوں مضامین کا مجموعہ ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کے مختلف حصوں میں بڑا تفاوت پایا جاتا۔ اور نشیب و فراز دونوں کی مثالیں کثرت سے ملتیں، لیکن حیرت ہے کہ ایسا نہیں - اور طرز۔ اسلوب کی یکسانی یک رنگی بڑی حد تک قائم رہی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب عموماً سادہ نویس و سنجیدہ نویس ہیں، گویا حالی کے مثنیٰ لیکن جب تحلّی بالطبع بول چال پر آتے ہیں - تو مولویوں کے لئے بے تکلف "جغادری" کا لفظ بھی بول جاتے ہیں، ہائے نذیر احمد!

نشیمن۔ ناول تین روپے آٹھ آنے

حسن و شباب ماہر القادری کے چیدہ
خاص افسانے دو روپے

حدیث دیگراں۔ ملک کے مایہ ناز نوجوان
شاعر حضرت خمار بارہ بنکوی
کے کلام حیات افروز کا مجموعہ
دو روپے

عشق و محبت تمام مشہور شعراء کا
صرف عشق و محبت کے
متعلقہ کلام کا انتخاب
دو روپے آٹھ آنے

عشقیہ کلام۔ منتخب عشقیہ کلام
بارہ آنے

تلاش و نگار۔ فلمی دنیا کے امام جناب
ضیا سرحدی کے دو لاجواب
ڈرامے ... دو روپے

تا حد نگاہ۔ ناول حضرت ضیا سرحدی کا
ایک دلکش اور لاجواب ناول تین روپے آٹھ آنے

وادیاں۔ ماہنامہ ایشیا کے بہترین
ڈرامے مرتبہ ساغر نظامی
چار روپے بارہ آنے

چیپو۔ ماہنامہ ایشیا کے بہترین افسانے
مرتبہ ساغر نظامی پانچ روپے

موج و ساحل۔ ساغر نظامی کے تازہ
کلام کا مجموعہ
چار روپے بارہ آنے

بادۂ مشرق مکمل، ساغر نظامی
پانچ روپے آٹھ آنے

آگ۔ ناول، عزیز احمد مصنف ہوس
گریز وغیرہ، عزیز احمد کا یہ ناول
ان کا حیرت انگیز شاہکار ہے
تین روپے

مقالات ماجد۔ مولانا عبدالماجد دریا
بادی کے مقالات و
مقدمات کا بہترین ادبی
مجموعہ .. تین روپے آٹھ آنے

مثنوی بحر المحبت، مولفہ شیخ مصحفی

بہ تصحیح و تحشیہ و اضافہ مقدمہ
و تبصرہ و فرہنگ از مولانا عبدالماجد
دریابادی مجلد ایک روپیہ

مشعل راہ۔ تخشب جارجوی کا پہلا دیوان
تین روپے آٹھ آنے

شبلی نامہ، از شیخ محمد اکرام، آئی۔ سی
ایس مصنف غالب نامہ
موج کوثر وغیرہ یہ کتاب
شبلی کے ہر پہلو پر بلا کسی رورعایت
اور جانبداری کے روشنی ڈالتی
ہے ... تین روپے

موج کوثر، ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی
علمی تاریخ از شیخ محمد اکرام
آئی سی ایس (دوسرا ایڈیشن)
چار روپے

بلیوا ناول مظفر حسین شمیم جس میں بتلایا
ہے کہ شریف عورت طوائف کیوں
بنتی ہے ... ایک روپیہ آٹھ آنے

اقبال امام ادب۔ رئیس احمد جعفری، ایک روپیہ

شکوہ جواب شکوہ، ڈاکٹر محمد اقبال۔ چار آنے

عروج وزوال۔ ناول از مضطر ہاشمی الٰہی
گھریلو زندگی لئے ہوئے اپنی نوعیت
کا لاجواب ناول تین روپے

پھریری، مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مزاحیہ افسانوں
کا دلکش مجموعہ کئی بار شائع ہو چکا ہے
دو روپیہ آٹھ آنے

کالی گھٹائیں۔ ناول از احمد شجاع پاشا اپنی
نوعیت کا حیرت انگیز ناول پانچ روپے

فلورا، ناول، از احمد شجاع پاشا تین روپے آٹھ آنے

سیرت مولانا محمد علی (مرحوم) علیہ الرحمتہ

از رئیس احمد جعفری، یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہو کر ملک کے ہر حصے میں مقبول ہوئی ہے، عرصے سے
یہ نایاب تھی، اب اس کا دوسرا ایڈیشن مصنف سے ترمیم اور کئی اہم اضافے کرا لینے کے بعد شائع کی گئی ہے
اس کتاب سے کوئی اسلامی گھر خالی نہیں رہنا چاہیے، قیمت چھ روپے

شیخ نذیر احمد مالک کتبخانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳